سلسلۂ نصاب عمرانیات علمیہ جامعۂ عثمانیہ

دستورِ سلطنتِ انگلشیہ

تصنیف

والٹر بیجہٹ

مُترجم

قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے
رکن شعبۂ تالیف و ترجمہ
جامعہ عثمانیہ

سنہ ۱۳۴۵ھ م ۱۳۳۶ف م ۱۹۲۶ع

دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

یہ کتاب مسرز کیگن پال ٹرینچ ٹربنر اینڈ کمپنی کی اجازت سے
جن کو حق اشاعت حاصل ہے اردو میں
ترجمہ کرکے طبع و شایع کی گئی ہے۔

فہرست مضامین

دستور سلطنت انگلیشیہ

کوئی صاحب قلم جو کسی چلتے ہوئے دستور سلطنت کا خاکہ تیار کرنا چاہتا ہو، اُسے سخت مشکل کا سامنا ہوتا ہے، ایسا دستور سلطنت واقعتہً کام کرنے والا اور با اختیار ہوتا ہے اس سے لئے مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ شے زیر نظر میں برابر تغیر ہوتا رہتا ہے۔ کسی تاریخی مصنف کو یہ مشکل پیش نہیں آتی، وہ صرف واقعات گذشتہ سے بحث کرتا ہے، اور قطعی طور پر یہ کہہ سکتا ہے کہ جس سال سے اُس نے اپنی تصنیف کا آغاز کیا ہے اس سال دستور سلطنت کا عملدرآمد کس طریق پر تھا، اور جس سال پر اس نے اپنی تصنیف کو ختم کیا ہے اس سال اس دستور میں کن اعتبارات سے تغیر ہو گیا تھا۔ وہ اپنا کام ایک معین وقت سے شروع کرتا اور ایک معین وقت پر اسے ختم بھی کر دیتا ہے، مگر اب ہمعصر صاحب قلم جو اپنی پیش نظر شے کا نقشہ اتارنا چاہتا ہے وہ آئینہ وار حیران رہجاتا ہے اس کی پیش نظر شے میں روز روز تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اس کے لئے لازمی ہے کہ ایک وقت معین پر اس شے کی جو حالت تھی اسی طرح اس کا نقشہ اتارے، اگر وہ ایسا نہ کریگا، تو وہ اپنی تصویر میں ایسی چیزیں پہلو بہ پہلو رکھدے گا جو واقعتہً کبھی بھی ایک وقت میں وقوع پذیر نہیں ہوئی تھیں۔ یہ دشواری اس وجہ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ جو صاحب قلم کسی رائج حکومت پر بحث کرتا ہے وہ بالطبع دوسری اہم ترین رائج حکومتوں سے اس کا مقابلہ کرتا ہے اور ان حکومتوں میں بھی بجائے خود تغیر ہوتا رہتا ہے۔ مشکل در مشکل یہ ہوتی ہے

کہ وہ جس حکومت کا نقشہ کھینچتا ہے اُس میں ایک جہت سے تغیر ہوتا ہے اور اس کی اس تصویر کے ماخذ میں غالباً دوسرے جہات سے تغیر ہو جاتا ہے۔ دوسری اشاعت کے لئے اس کتاب کے تیار کرتے وقت یہ دشواری میرے لیئے برابر سنگ راہ بنی رہی۔ انگریزی دستور سلطنت کی جو حالت ۱۸۶۵ء اور ۱۸۶۶ء میں تھی اسی طرح اس کتاب میں اسکا بیان ہوا ہے گویا سرسری طور پر یہ کہنا چاہیئے کہ لارڈ پامرسٹن کے وقت میں دستور سلطنت کا جو عملدرآمد تھا وہی اس کتاب میں درج کر دیا گیا ہے مگر اس کے بعد سے اس میں متعدد تغیرات ہو گئے ہیں جن میں سے بعض کلی ہیں اور بعض جزوی اور اتنی قلیل مدت میں اس سے زیادہ تغیرات اور کیا ہوتے۔ اگر میں پامرسٹن کے وقت کے خاکہ کو جو اسوقت کا خاکہ قرار دیکر پیش کرتا، تو اکثر مواقع پر یہ صحیح نہ ہوتا، اور اگر میں یہ کوشش کرتا کہ سات برس قبل کے خاکہ کو اسوقت کے خاکہ میں بدل دوں تو شاید میں تمام تصویر ہی کو غارت کر دیتا اور ایک ایسی شے پیش کرتا جو ان دونوں میں سے کسی سے بھی مشابہت نہ رکھتی ہو

میرے خیال میں ایسی حالت میں بہترین صورت یہ ہے کہ اصلی خاکہ کو اس کے تمام اہم جزئیات کے ساتھ اسی طرح قائم رکھا جائے جس طرح وہ پہلی مرتبہ مرتب ہوا تھا اور زیر بحث دستور سلطنت اور متقابل دستور ہائے سلطنت میں جو تغیرات اہم معلوم ہوں انھیں مختصراً بیان کر دیا جائے۔ اس کتاب میں مختلف بیانات ایسے ہیں جن کا اشارہ ان اشخاص کی طرف ہے جو اس کتاب کی پہلی اشاعت کے وقت زندہ تھے یا ان واقعات کی طرف ہے جو اسوقت پیش آ رہے تھے میں نے ان بیانات کو بلا کم و کاست محفوظ رکھا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ پڑھنے والے کو معلوم ہو جائیگا کہ وہ کس زمانہ کے متعلق پڑھ رہا ہے اور جس وقت کے لئے یہ مشابہت قائم کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اس کے سمجھنے میں اسے غلطی نہ ہوگی۔ میں اب ان تغیرات کو بیان کرنیکی طرف توجہ کرتا ہوں جو خود زیر بحث دستور سلطنت یا اس کے تشریح کرنے والی متقابل تنظیمات میں واقع ہوئے ہیں ؎

۱۸۶۷ء کے قانونِ اصلاح کے اثرات کے اندازہ کرنے کی کوشش ابھی بہت قبل از وقت ہے۔ اس قانون کے بموجب جن لوگوں کو حق رائے عطا کیا گیا ہے

وہ ابھی خود اپنے اختیار سے آگاہ نہیں ہوئے ہیں۔ اس قانون کے بموجب ابھی صرف انتخاب ہوا ہے، اس سے ہمیں یہ سبق تو کیا ملتا کہ یہ لوگ اپنے اختیار کو کس طرح استعمال کرینگے، اتنا بھی نہیں ہوا کہ خود ان لوگوں کی سمجھ میں یہ آجاتا کہ انھیں کیا اختیار حاصل ہوا ہے۔ ۱۸۳۲ء کے قانون اصلاح کے اصلی نتائج کا اظہار کئی برس تک نہیں ہوا تھا۔ ۱۸۳۶ء کا کوئی مصنف ان نتائج کو پسند کرتا ہو یا ناپسند، انھیں حقیر سمجھتا ہو یا وقعت (اگر وہ ان پر قلم اٹھاتا تو) ہر حال میں اسکا غلطی میں مبتلا ہو جانا یقینی تھا۔ کسی دستور سلطنت کا پورا پورا اثر اسوقت تک ہویدا نہیں ہوتا، جب تک کہ اس کے تمام تابعین پرانے دستور سلطنت کے پروردہ، اور اس کے تمام مدبر پرانے دستور سلطنت کے تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔

ایک معاملہ میں بالتخصیص یہ اغلب ہے کہ اس پچھلے مسودہ اصلاح کے اثر کے متعلق انگریز مغالطہ میں پڑجائیں گے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تھوڑے ہی زمانہ کے اندر اندر انگلستان کی سیاسیات میں بہت بڑا تغیر ہو گیا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ پامرسٹن کے مکان کی اینٹ سے اینٹ بج گئی ہے۔ ۱۸۶۵ء کے بعد سے جو تغیرات ہوئے ہیں وہ کسی ایک خصوص میں نہیں ہوئے ہیں بلکہ ہزاروں خصوص میں ہوئے ہیں۔ یہ تغیر مختص جزیات میں نہیں ہوا ہے بلکہ خود انداز طبیعت میں تغیر ہو گیا ہے جس کے اثر سے کوئی محفوظ نہیں ہے۔ انگریز اسوقت ایک تعلیمی قانون کی خفیف خفیف جزئیات پر جرح و قدح کر رہے ہیں لیکن لارڈ پامرسٹن کے وقت میں ایسا کوئی قانون منظور ہی نہیں ہوتا۔ لارڈ پامرسٹن کے زمانہ میں سر جارج گرے نے کہا تھا کہ آئرش کلیسا کی منسوخی ایک "انقلابی کارروائی" ہوگی، یہی کلیسا اب بہت بڑی کثرت رائے سے منسوخ کر دیا گیا ہے اور خود سر جارج گرے نے بھی اس تنسیخ سے اتفاق کیا ہے۔ ایک نئی دنیا پیدا ہو گئی ہے جو قدیم دنیا کے مماثل نہیں ہے، اور انگریز طبعاً اس تغیر کو قانونی اصلاح کی طرف منسوب کرتے ہیں، مگر یہ بالکل غلط ہے۔ اگر قانون اصلاح وجود پذیر نہ ہوتا تو بھی انگریزی سیاسیات میں بہت بڑا تغیر ہو جاتا۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ایک تغیر ایسا ہو گیا ہے جس سے اور دوسرے تغیرات از خود پیدا ہو جاتے ہیں، یعنی ایک نسل گزر گئی اور دوسری نسل آگئی ہے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ سیاسیات

ہیں ایک نسل تقریباً بالکل ہی خاموشی کے ساتھ دوسری نسل کی جانشین ہو جاتی ہے۔ ہر زمانہ میں تیس اور ستر برس کے درمیانی عمر کے لوگوں کو معقول اثر و اقتدار حاصل رہتا ہے۔ ہر سال بہت سے سال خوردہ اشخاص دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں، جو رہتے ہیں وہ زیادہ سن رسیدہ ہو جاتے ہیں، بہت سے نئے اشخاص اس میدان میں داخل ہو جاتے ہیں پس یہ قلب ہیئت ایسی تدریجی طور پر ہوتی رہتی ہے کہ ہمیں اس کا کچھ پتہ بھی نہیں چلتا۔ اس سیاسی کمپنی (شرکت) کے ڈائرکٹروں (ناظموں) کی مجلس میں ہر سال چند خفیف تغیرات ہوتے رہتے ہیں، اور اس لئے شرکا کو کسی ناگہانی تغیر کا احساس نہیں ہوتا، مگر کبھی کبھی ناگہانی تغیر بھی پیش آجاتا ہے۔ گاہ بگاہ ایسا ہوتا ہے کہ متعدد حکمران ڈائرکٹر (ناظم) جو کم و بیش ایک ہی عمر کے ہوتے ہیں، برسوں تک زندہ رہتے اور اس دوران میں شرکت کا تمام کاروبار چلاتے رہتے ہیں، اور پھر تقریباً سب کے سب ایک ساتھ اس منظر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں کمپنی کے معاملات میں بہت بڑے تغیرات کے ہو جانے کا احتمال رہتا ہے، اس سے بحث نہیں کہ یہ تغیر اچھا ہو گا یا برا۔ کبھی تو کمپنی اور زیادہ کامیاب ہو جاتی ہے اور کبھی تباہی کی حد کو پہنچ جاتی ہے مگر ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ اس قسم کے وقوعہ کے بعد، وہ علی حالہ قائم و برقرار رہے اسی سے ملتا جلتا واقعہ ۱۸۶۵ء کے قبل پیش آیا۔ ۱۸۳۲ء و ۱۸۶۵ء کے تمام درمیانی زمانہ میں ۱۸۳۲ء سے قبل والے مدبرین، لارڈ ڈاربی، لارڈ رسل، لارڈ پامرسٹن وغیرہم بڑے ذی اقتدار تھے۔ لارڈ پامرسٹن آخر تک بہت بڑی انتناعی قوت کے مالک بنے رہے، بعض اعتبارات سے اگرچہ وہ ہمیشہ نوجوان ہی رہے مگر اپنے سے نوجوان تر نسل کے ساتھ انھیں ذرہ برابر بھی ہمدردی نہیں تھی۔ انھوں نے کسی نوجوان شخص کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اور نوجوانوں کے جتنے خواہشات تھے، سب میں رخنہ ڈال دیا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے انتقال کے بعد ایک نئی نسل دفعتہً نمودار ہو گئی اور ۱۸۳۲ء سے قبل والے تمام مدبرین ایک ساتھ کنج عدم میں روپوش ہو گئے۔ ان نئے مدبروں میں بہت سے ایسے تھے جنھیں لارڈ پامرسٹن اپنے پوتوں کے برابر سمجھنا چاہئے۔ لارڈ موصوف پارلیمنٹ میں ۱۸۰۶ء میں شامل ہوئے تھے، یہ لوگ اگست ۱۸۵۶ء کے بعد پارلیمنٹ میں داخل ہوئے۔ پس کام کرنے والوں کی عمر میں

ایسے تغیر عظیم کے ہو جانے سے یہ لازمی تھا کہ جس کام کی کوشش کی جا رہی ہے اسکی نوعیت میں اور جس طرح پر وہ کام انجام پا رہا ہے اسکے طریق میں تغیر واقع ہو جائے ہم جس شئے کو سیاسیات کی "در اصل" کہتے ہیں اسمیں جتنا یقینی تغیر نسل کے بدل جانے سے ہوتا ہے اتنا کسی اور وجہ سے نہیں ہوتا۔ اگر قانون اصلاح وجود میں نہ بھی آیا ہوتا تو صرف اسی ایک سبب سے نہایت اہم تغیرات رونما ہو گئے ہوتے محض مسئلۂ اصلاح کے طے ہو جانے سے بھی بہت بڑا تغیر ہو گیا۔ اگر یہ معاملہ کسی دوسرے تغیر یا کسی قسم کے تغیر کے بغیر ہی طے ہو گیا ہوتا، تب بھی اس کا اثر بہت عظیم الشان ہوتا۔ نئے مسائل فوراً بروئے کار آ جاتے، سیاسی ملک کی مثال امریکہ کے جنگل کی سی ہے۔ آپ کو صرف اتنا کرنا ہے کہ آپ پرانے درختوں کو کاٹ ڈالئیے اور فوراً ہی نئے درخت اُن کی جگہ اُگ آئینگے تخم زمین میں موجود ہوتے ہیں، پرانے درختوں کے نکل جانے سے جوں ہی روشنی اور ہوا انہیں ملتی ہے وہ بڑھنے لگتے ہیں۔ یہ نئے مسائل از خود نئی فضا، نئے فریق اور نئے مباحث پیدا کر دیتے ہیں۔

در حقیقت، میں یہ دعوی نہیں کرتا کہ ۱۸۶۷ء کے قانونِ اصلاح میں جیسی اہم جدت دکھائی گئی ہے، ایسی جدت کے قانون سے بہت بڑے اثرات مترتب ہونگے۔ ہر طرح پر اغلب یہی ہے کہ اس سے بہت اثرات ظاہر ہونگے۔ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ اسوقت تک ہمیں یہ نہیں معلوم ہوا کہ وہ اثرات کیا ہیں، ۱۸۶۵ء کے بعد جو بہت بڑا بدیہی تغیر ہوا ہے وہ ہرگز اس قانون کی وجہ سے نہیں ہوا ہے بلکہ اغلب تو یہ ہے کہ وہ قانون اس تغیر کی وجہ خاص کبھی نہیں قرار پا سکتا، ابھی ہمارے لئے یہ سوچنا باقی ہے کہ اس قانون سے کیا اثرات پیدا ہونگے اور کیا نہونگے۔

ان خطبات کے ایک اہم اصول مسلمہ سے یہ خاص سوال نہایت طبعی طور پر پیدا ہو جاتا ہے۔ میں نے یہ کہا ہے کہ انگلستان میں کابینی حکومت اس وجہ سے ممکن ہے کہ انگلستان ایک "باادب" ملک ہے۔ اس سے میرا منشا یہ تھا کہ برائے نام حلقۂ انتخاب اصلی حلقۂ انتخاب نہیں ہے، "دوس اشرفی والے مکاندار" کا حصۂ کثیر فی الحقیقت خود اپنی کوئی رائے نہیں رکھتا اور نہ اپنے نمائندوں کو اپنی رائے کی اطاعت پر مجبور کرتا ہے، ان کا فیصلہ ان سے بہتر تعلیم یافتہ طبقات کی رہبری

کے تابع ہوتا ہے، وہ انھیں تعلیم یافتہ طبقات سے اپنے نمائندے مقرر کرنا پسند کرتے ہیں اور ان نمائندوں کو بہت آزادی دیدیتے ہیں۔ اگر ۱۸۳۲ء سے قبل کی کسی پارلیمنٹ میں کسی معجزے کے زور سے چھوٹے چھوٹے دکاندار شامل ہو جاتے تو وہ وہاں اپنے کو برادری سے باہر سمجھتے۔ اس زمانہ کی پارلیمنٹ میں جن حلقوں سے منتخب ہوتی تھیں اُن کے اوسط درجہ کے عام آدمیوں سے وہ اس درجہ مغائر ہوتی تھیں کہ کسی دو چیزوں میں اس سے زیادہ مغائرت نہیں ہو سکتی۔

درحقیقت میرا منشا یہ نہیں ہے کہ دس پاونڈ کے مکاندار علم و ذہانت کے بڑے قدر شناس تھے یا نفاست پسندی کے بڑے مبصر تھے، سب جانتے ہیں کہ ان میں سے اکثر و بیشتر مطلقاً ایسے نہ تھے۔ معدودے چندہی اگر ایسے ہونگے جن میں یہ خوبیاں ہوں۔ انگریز خیالات سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ واقعات سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان پر محسوس و مرئی چیزوں کا اثر نہیں پڑتا بلکہ غیر محسوس و غیر مرئی چیزوں کا اثر پڑتا ہے، اگر بہت نزاکت آفرینی سے کام نہ لیا جائے تو صاف الفاظ میں یہ کہنا چاہئے کہ ان پر منصب و دولت کا اثر پڑتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انہیں سے افضل قسم کے لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جو لوگ ان ناقابل بحث اعتبارات میں ان سے فائق تھے وہ علم و فہم کے غیر مرئی اوصاف میں بھی ان سے فائق ہونگے، گو قدیم انتخاب کنندوں کا ہم غفیر تجربہ و تخیل سے بہت زیادہ کام نہیں لیتا، وہ اس امر کو پسند کرتے ہیں کہ ان سے اعلیٰ و افضل لوگوں میں سے کوئی شخص اُن کی نمائندگی کرے۔ اگر وہ شخص دولتمند ہوتا تو وہ اسکی بہت عزت کرتے تھے اور اگر وہ کوئی لارڈ ہوتا تو اسے اور بھی زیادہ پسند کرتے تھے۔ ان انتخاب کنندوں کے سامنے سوال یہ پیش ہوتا تھا کہ ان دو دولتمندوں میں سے تم کس کا انتخاب کروگے اور ان دولتمندوں میں سے ہر شخص ان جلیل القدر فرقوں کی طرف سے آگے بڑھایا جاتا تھا جن کے خیالات انھیں دولتمندوں کے خیالات اور جن کے تجاویز انھیں دولتمندوں کے تجاویز ہوتے تھے۔ انتخاب کنندوں کا کام صرف یہ تھا کہ وہ ایک یا دو دولتمند شخصوں کو اس غرض سے منتخب کردیں کہ وہ انجمنوں کی تجاویز کو چلائیں ٭

یہ حالت اس درجہ تک بڑھی ہوئی تھی، کہ دس پاونڈ کے مکان والوں

کا حصہ کثیر جس طبقہ سے تعلق رکھتا تھا، یعنی ادنیٰ طبقہ متوسط، اسی پہ تمام طبقوں سے زیادہ محصول کا بار عاید کیا جاتا تھا، ایک چھوٹا دوکاندار یا ایک محرر جس کی بس اتنی ہی استطاعت ہوتی تھی کہ وہ محصول آمدنی ادا کر سکے، غالباً تمام ملک میں محصول کا بار اسی پہ سب سے زیادہ پڑتا تھا۔ اسکے علاوہ وہ اجناس کے، چاء، شکر، تنباکو، خمیر، اور اسپرٹ (جوہر شراب) کے محصول ادا کرنے پڑتے تھے، اور اس کے ساتھ ہی محصول آمدنی بھی دینا ہوتا تھا مگر اس کے ذرائع آمدنی نہایت ہی کم تھے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ جو طبقہ اصولاً سب پہ حاوی و غالب سمجھا جاتا ہو، اسی کے ساتھ مال کے اعتبار سے سب سے زیادہ بدسلوکی کی جاتی ہو۔ انگلستان کی تمام سابقہ پارلیمنٹوں کی تاریخ کو از ابتدا تا انتہا دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انتخاب کنندگان، ان پارلیمنٹوں کی پسند کردہ روش میں اپنی ہدایت رائے کو اتنا ہی دخل دے سکتے تھے جتنا وہ نظام شمسی میں دخیل ہو سکتے تھے ؏

جیسا کہ میں نے اس جلد میں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے قدیم انتخاب کنندے اپنے سے اعلیٰ و افضل لوگوں کا جو ادب و احترام کرتے تھے وہی ایک ذریعہ تھا جس سے انگریزوں کا قدیم دستور قائم رہ سکتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ذہن میں ایسے ممالک کا تصور قائم کیا جا سکتا ہے جن میں رائے دہندوں کا حصۂ کثیر عمدہ رائے قائم کرنے کی کامل اہلیت رکھتا ہو۔ ایسی صورتیں موجود ہیں جو کم و بیش اس حالت کے قریب پہنچ گئی ہیں، مگر چھوٹے چھوٹے انگریز دوکانداروں کی یہ حالت نہیں تھی۔ ان میں بس اتنی ہی قابلیت تھی کہ وہ اعلیٰ خیالات کی دو صنفوں میں سے ایک کو پسند کریں اور چونکہ اس قسم کے لوگوں کے تصورات تجربہ کی بہ نسبت شخص کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں، اس لئے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ دو مخالف فریقوں میں سے (جن میں سے ہر ایک ان اعلیٰ خیالات کے متعلق اپنا ایک حصۂ خاص رکھتا تھا) ایک فریق کو پسند کریں۔ بس اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر ان کے ذاتی خیالات کے متعلق ان سے جرح کی جاتی تو وہ ہمیشہ نہایت کج مج جواب دیتے اور اکثر نہایت احمق ثابت ہوتے تھے۔ ان میں بس اتنی ہی اہلیت ہوتی تھی کہ جو امر تنقیح طلب اعلیٰ طبقات نے قائم کر دئے ہیں، اس پہ ایک فیصلہ صادر کر دیں اس سے زیادہ وہ کچھ اور نہیں کر سکتے تھے ؏

اب اہم سوال یہ ہے کہ یہ قدیم دستور خاص کس حد تک باقی رہیگا اور کس حد تک اس میں تبدیلی ہوجائیگی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ خیال مجھے یکقلم ترک کرنا پڑے گا کہ اس میں تمام وکمال تبدیلی ہوجائیگی، اور یہ تبدیلی بہتری کی جانب مائل ہوگی۔ میں توقع نہیں کرسکتا کہ رائے دہندوں کا نیا طبقہ پرانے طبقہ کے بہ نسبت زیادہ صائب رائے قائم کرسکیگا۔ فی الحقیقت ایسا خیال موجود تھا اور جسوقت اس کتاب کا پہلا اڈیشن شائع ہوا ہے، اسوقت تو یہ خیال بہت ہی عام ہو رہا تھا کہ ماہر کاریگروں کا ایک طبقہ ایسا موجود ہے جس کی نیابت نہیں ہوتی حالانکہ وہ قومی معاملات پر اعلیٰ درجہ کی رائے قائم کرسکتا ہے اور اس کے پاس اس رائے کے اظہار کا وسیلہ ہونا چاہئے۔ انھیں اس وسیلہ کے عطا کرنے کے لئے بہت ہی دقیق و مشرح تجویزیں مرتب کی گئیں۔ مگر سنہ ۱۸۶۷ء کا قانون اصلاح ماہر مزدوروں ہی تک محدود نہیں رہا۔ اس لئے غیر ماہر مزدوروں کو بھی حق رائے دہی عطا کردیا۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ معمولی مزدور جنھیں کوئی خاص قابلیت نہو اور جن پر صرف اس وجہ سے محصول لگایا جاتا ہو کہ اُن کے پاس مکان موجود ہے۔ وہ ذہنی مسائل پر کچھ اچھی رائے قائم کرسکتے ہیں۔ دفتر کے ہرکارے وہاں کے محرروں سے زیادہ ذہین نہیں ہوتے، نہ اُن کی تعلیم محرروں سے بہتر ہوتی ہے، اگر کچھ ہوتی ہے تو بدتر ہوتی ہے، لیکن جن طبقات کو نیا نیا حق رائے دہی عطا ہوا ہے، اُن میں یہ ہرکارے ان طبقات کے غالباً بہت ہی اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان میں سے اوسط درجہ کے لوگ معمولی محنت مزدوری سے بہت دشواری سے قابل کفاف اجرت پیدا کرسکتے ہیں۔ اُن کے پاس اپنی اصلاح و ترقی کا وقت نہیں ہے کیونکہ وہ تمام دن مزدوری کرتے رہتے ہیں اور ان کی ابتدائی تعلیم اسقدر کم ہوتی ہے کہ اکثر اسمیں بھی شک ہوتا ہے کہ اگر ان کو زیادہ وقت ملتا تو بھی وہ اپنی تعلیم سے کچھ اچھا کام لے سکتے۔ اب جس طبقہ کو حق رائے عطا کیا گیا ہے وہ اس ضرورت کہیں پرانے طبقہ کی بہ نسبت زیادہ بے نیاز نہیں ہے کہ اس سے اعلیٰ و افضل اشخاص اُس کی رہبری کریں، بلکہ اس کے برعکس پرانے طبقہ کی بہ نسبت نئے طبقہ کو اس رہبری کی زیادہ ضرورت ہے۔ اصلی سوال یہ ہے کہ آیا وہ انقیاد سے کام لیں گے یا نہیں، وہ دولت و منصب اور اعلیٰ اوصاف کا ویسا ہی احترام کرینگے یا نہیں جیسا پرانے طبقہ والے کرتے تھے، یہ دولت و منصب

درحقیقت اعلیٰ اوصاف ہی کے ظاہری علامات اور عام لوازم ہیں۔ اس سوال کا جواب دینے میں ایک خاص مشکل حائل ہے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ کسی قانون کی منظوری کے متعلق جو مباحث ہوتے ہیں، ان میں نہایت قابل قدر اشارے اس امر کے موجود ہوتے ہیں کہ اس قانون سے کیا توقعات رکھنا چاہئے۔ مگر ۱۸۸۱ء کے قانونِ اصلاح کے مباحث میں اس کا کچھ ایسا پتہ نہیں چلتا۔ یہ مباحث تو ابواب دہندہ، اور مالک مکانات وغیرہ کے اصطلاحی دقیقہ سنجیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ملک میں کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ کیا کیا جا رہا ہے۔ اسی زمانے میں مجھے ایک خالص زرعی اور کنسروٹیو (مستحفظ) صوبے میں جانے کا اتفاق ہوا اور میں نے وہاں کے ٹوریوں سے پوچھا کہ تم اس قانون اصلاح کو سمجھتے ہو، تمھیں یہ معلوم ہے کہ تمھاری کنسرویٹو حکومت نے ایک ایسا مسودۂ قانون پیش کیا ہے جو سابق کے قانون کی بہ نسبت بہت زیادہ ریڈیکل (استیصالی) ہے اور بہت قوی امید یہ ہے کہ وہ منظور ہو جائیگا؟ جواب یہ ملا کہ "آپ کیا کہہ رہے ہیں، یہ مسودہ اصلاح دو ریڈیکل (استیصالی) کیونکر ہو سکتا ہے، برائٹ تو اس کی مخالفت کر رہا ہے"۔ اسکا جواب الجواب اسطرح نہیں دیا جا سکتا تھا جسے ایک عام جوری کی قابلیت کا شخص سمجھ سکے۔ ٹائمز اس مسودۂ قانون کی تائید کر رہا تھا اور مسٹر برائٹ اس کے مخالف تھے، اسلئے بلا امتیاز فریق کنسرویٹو اور عام اعتدال پسند لوگوں کا حصۂ کثیر اس کے اثر کے متعلق کوئی تصور ہی نہیں قائم کر سکتا تھا اب اگر ہم انھیں سمجھانے کی فکر کرتے تو وہ کہتے تھے کہ یہ لندن کے مزخرفات ہیں۔ درحقیقت پارلیمنٹ کے مباحث کو عام طور پر قوم اس نظر سے دیکھتی ہے کہ مسودات کے اثر کے متعلق ان کے خیالات پر کچھ روشنی پڑے، مگر اس معاملہ میں کوئی فریق بھی بہ حیثیت فریق کے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ بہت سے کنسرویٹو بلکہ انکے ذی فہم افراد میں سے اکثر و بیشتر اشخاص اس تجویز کے نتائج سے ہراساں تھے، لیکن چونکہ خود انھیں کے فریق کے سرگروہوں نے یہ تجویز پیش کی تھی اسلئے وہ اس کی مخالفت کرنا پسند نہیں کرتے تھے، اور فریقانہ انضباط انھیں اپنی رو میں بہالے گیا دوسری جانب بہت سے لبرل بلکہ اغلب یہ ہے کہ ان کے ذی فہم اشخاص میں سے اکثر و بیشتر لوگ اس مسودۂ قانون پر پیچ و تاب کھا رہے تھے، لوگ برسوں سے

قوانین اصلاح کے پیش کرنے کے عادی رہے ہیں، وہ ہر ایک قانون کے باہمی فرق کو جانتے تھے اور یہ دیکھ رہے تھے کہ یہ مسودۂ قانون تمام مسودات سے جو کسی وزارت نے اسوقت تک پیش کئے ہوں زیادہ وسیع الاثر ہے۔ مگر ان میں سے تقریباً سب کے سب اس کا اقرار کرنے سے گریزاں تھے، اگر وہ ٹوریوں کے کسی مسودۂ قانون کی اس بنا پر مخالفت کرتے کہ وہ ضرورت سے زیادہ عمومیت کی طرف مائل ہے تو وہ اپنے رائے دہندوں کے ایک بہت بڑے حصہ کو آزردہ کر دیتے۔ عمومیت کے انتہا پسند طرفدار یہ کہتے کہ دو قوم کے دشمن ٹوری قوم پر اتنا اعتماد دکھائیں کہ یہ اختیار اُسے تفویض کریں اور آپ لبرل ہوکر اور قوم کے دوست بنکر قوم پر اتنا اعتماد نہ کریں۔ اگر یہی ہے تو پھر ہم آپ کے لئے آیندہ کبھی رائے نہ دینگے۔ بہت سے استیصالی ارکان جو برسوں سے مکانداری کے اصول پر حق رائے کا مطالبہ کر رہے تھے اسکے حصول کی توقع کو بر آتے دیکھکر خوش ہونے کے بجائے حیرت میں پڑ گئے۔ سودا کرنے والوں کی طرح انھوں نے بڑی سے بڑی امکانی قیمت پر اسکا مطالبہ کیا تھا مگر اُنھیں اس کے حصول کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ تمام لبرل یا کم از کم ان کے انتہا پسند حصہ کی حالت اس شخص کی سی ہوئی، جو کسی بند دروازے کو زور سے دھکیلے کہ دفعتہً دروازہ کھل جائے اور دباؤ کے نہ رہنے سے وہ خود سر کے بل گر پڑے۔ جو لوگ اس قسم کی ناگوار حالت میں پھنس جائیں اُن سے کسی موثر تنقید کی بہت کم امید ہوسکتی ہے اور یہ تو یقینی ہے کہ لبرلوں نے اس مسودہ پر شدت سے نکتہ چینی نہیں کی۔ انگریزوں کے لئے سابق مباحث ایسے موجود نہ تھے جن سے اس مسودۂ اصلاح کے متعلق کچھ ہدایت حاصل ہوتی اور نہ خود اس موقع پر ایسا مباحثہ ہوا جیسا معمولی حالات میں ہوا کرتا ہے۔

آخری انتخاب کے تجربہ سے بھی کچھ ایسی زیادہ مدد نہیں ملتی۔ حالات نہایت ہی غیر معمولی تھے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ مسٹر گلیڈ اسٹون کی ذاتی ہر دلعزیزی ایسی تھی کہ مسٹر پٹ کے بعد سے یہ حالت کبھی دیکھنے میں نہیں آئی ہے اور نہ آیندہ اس کی توقع ہے، اتنا تو یقینی ہے کہ ایسی ہر دلعزیزی کسی کو بہت ہی شاذ و نادر حاصل ہوگی۔ ایک خراب مقرر کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے

کسی نے یہ سوال کیا کہ وہ کس طرح امیدواری میں کامیاب ہوگیا، اس نے جواب دیا کہ "واہ، یہ بھی کوئی بڑی بات ہے، جب میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ میں کیا کہوں تو میں کہدیتا تھا "مسٹر گلیڈ اسٹون" اور یہ یقینی تھا کہ لوگ چیرز دینگے، بس اس اثنا میں کچھ سوچ لیتا تھا" فی الحقیقت اس ہیرو پرستی نے رائے دہندگان اور ارکان دونوں کے لئے تنگ راہ کا کام دیا۔ امیدواروں نے صرف یہ کہدیا کہ وہ مسٹر گلیڈ اسٹو کے ساتھ رائے دینگے اور انتخاب کنندوں نے صرف انھیں کا انتخاب کیا جنھوں نے ایسا کہا تھا۔ جس طرح فریق غالب کی نسبت یہ کہہ سکتے تھے کہ وہ گلیڈ اسٹون کا طرفدار ہے، اسی طرح فریق مغلوب کی نسبت یہ کہہ سکتے تھے کہ وہ گلیڈ اسٹون کا مخالف ہے۔ باسوا اسکے قدیم انتخابی تنظیم کے باقی ماندہ اثرات بھی نہایت قوی تھے پرانے رائے دہندوں نے اسیطرح رائے دی جس طرح ان سے کہا گیا اور نئے رائے دہندے اکثر و بیشتر انھیں کے ساتھ ہوگئے۔ بہت ہی کم ایسی صورتیں پیش آئیں جہاں کوئی امیدیا مخالف تنظیم قائم ہوئی ہو۔ گذشتہ انتخاب میں نئے دستور کی جانچ کا کچھ زیادہ موقع نہیں آیا اور جس حد تک آیا وہ بھی کسی خاص رہنما کے زیر اثر تھا۔

اس اثنا میں انگلستان کے مدبروں کو ایسے اہم مواقع حاصل ہوئے کہ سالہا سال سے ایسے مواقع حاصل نہیں ہوئے تھے، اور اس لحاظ سے ان کے فرائض بھی نہایت ہی عظیم الشان ہوگئے۔ حق رائے عمل میں لانے کے متعلق انھیں نئے رائے دہندوں کی رہبری کرنا پڑی۔ وہ اس رہبری کے کام کو خاموشی کے ساتھ اور بغیر یہ کہے ہوئے انجام دیتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں مگر ہر طرح عوام کو اپنی معیت میں لے چلنا تھا۔ آزاد ملکوں میں سربرآوردہ مدبروں کو بہت بڑی ہنگامی قوت حاصل ہوجاتی ہے وہی یہ طے کرتے ہیں کہ لوگ آپس میں کن مباحث پر عام طور سے گفتگو کرینگے۔ انھیں کی دو ایک تقریروں سے یہ طے ہوجاتا ہے کہ آئندہ بہت دنوں تک کیا کہا جائیگا اور کیا لکھا جائیگا یہی مدبرین اپنے مشیروں کے اتفاق رائے سے اپنے فریق کا لائحہ عمل تیار کرتے ہیں (جسے اہل امریکہ "پلیٹفارم" کہتے ہیں) اور وہ خود اور ان کے پیشکار اس لائحہ عمل کو اپنی سیاسی مہم کی شمع ہدایت بناتے ہیں۔ دنیا انھیں مدبروں کے مختلف لوائح عمل کا مقابلہ کرکے اپنی رائے قائم کرتی ہے۔

عام دل ودماغ کے آدمی اس امر کے لئے بالکل ناموزوں ہیں کہ وہ خود اپنے لئے
یہ متعین کریں کہ وہ کس سیاسی مسئلہ پر توجہ کرینگے۔ ان کے لئے اتنا ہی بہت ہے
کہ جو مسائل از خود ان کے سامنے آجاتے ہیں) یا ان کے سامنے لائے جاتے ہیں) وہ
ان مسائل پر معقولیت کے ساتھ رائے قائم کریں۔ وہ خود کبھی یہ تصفیہ نہیں کرتے
کہ ان کے مباحث کیا ہونے چاہئیں وہ اتنا ہی کرتے ہیں کہ مباحث کے تنقیحات
پر کوئی فیصلہ کردیں۔ اب اگر یہ قرار دینے کے لئے کہ یہ مسائل کیا ہونگے مدبّروں نے
ایسے سوالات اٹھائے جن سے بنی نوع انسان کے ادنیٰ طبقوں میں اضطراب
پیدا ہوا یا جن کے متعلق تصفیہ کرنے سے ان طبقات کے غلطی میں پڑجانے کا گمان
ہوگیا، تو ان مدبّروں پر اسوقت خاص طور پر بہت بڑی ذمہ داری عاید ہوجاتی ہے۔
اور اگر انھوں نے ایسے سوالات پیدا کئے جنمیں ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے مقاصد
سلطنت کے مجموعی مقاصد سے مطابقت نہ رکھیں یا متغائر ہوجائیں تو وہ بڑے
سے بڑا امکانی نقصان پہنچا دینے کا موجب ہونگے ملک انگلستان کا مستقبل ایک
نازک تجربہ کے خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پاجانے پر منحصر ہے اور اگر مدبّروں
نے ایسا کیا تو وہ اس تجربہ کی ناکامی کے بالکلیہ ذمہ دار ہوں گے
ہوسکتا ہے کہ عین اس موقع پر جبکہ میدان سیاسیات میں نئے داخل ہونے والے
جاہل آدمیوں کے سامنے اچھے اور صرف اچھے مباحث کے پیش کرنے کی
ضرورت ہو ان مدبّروں نے ناقص مباحث پیش کردیئے ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ
انھوں نے ایسے مباحث پیش کردیے ہوں جو غربا کو ایک طبقہ کی حیثیت سے باہم
متحد کردیں یا ایسے مباحث پیش کئے ہوں جن سے وہ امرا کے خلاف برانگیختہ ہوجائیں
یا ایسے مباحث پیش کئے ہوں جن کی گفت وشنید ان کے کانوں تک صرف اسطرح
پہنچی ہو کہ کوئی نیا قانون ان کے لئے موجب آسائش ہوجائیگا اور موجودہ قانون ہی
اُن کی پریشانی کا باعث ہے۔ حکومت کے ہاتھ میں ناقابل ختم خزانہ موجود ہے اور
بغیر اسکے کہ کسی اور جگہہ مزید احتیاج پیدا ہوجائے حکومت اس خزانہ سے موجودہ
اہل حاجت کی حاجت روائی کرسکتی ہے۔ اگر غریب رائے دہندوں کا پہلا کام یہ ہے کہ
وہ "غربا کے لئے بہشت" مہیا کردینے کی کوشش کریں تو وہ عظیم الشان سیاسی امتحان

جواب شروع ہونے والا ہے صرف بجا کا کام رہیگا، اور یہ امر کچھ بعید نہیں ہے کیونکہ غربا اس قسم کے بہشت کا خواب دیکھتے ہی رہتے ہیں اور وہ یہ بھی سمجھتے رہتے ہیں کہ وہ اسے پیدا بھی کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں حق رائے کا یہ انعام خطیر تمام قوم کیلئے ایک بلائے بے درماں ثابت ہوگا اور جو لوگ اس سے مستفید ہونگے ان کیلئے بھی اس کی مصیبت اوروں سے کم نہ ہوگی ؟

درحقیقت میرا یہ منشا نہیں ہے کہ مدبّر بالکلیہ آزاد ہیں کہ وہ جس بحث کو چاہیں پیش کردیں اور جس بحث کو چاہیں حذف کر دیں۔ میں اس امر سے کما حقہ آگاہ ہوں کہ انھیں نہایت سخت حالات کے تحت میں ان مباحث کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ جن اوقات میں عوام الناس کی طبیعتوں پر اضطراب طاری ہوتا ہے ان وقتوں میں مدبّروں کو اپنی قوت تمیزی سے کام لینے کا کچھ بھی موقع نہیں ملتا۔ عام ہیجان میں یہ خود بخود طے ہو جاتا ہے کہ کس امر کو زیر بحث لانا چاہیے اور کسے نہ لانا چاہیے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی ہے کہ پرسکون اوقات میں مدبّروں کو بہت بڑا اختیار حاصل ہوتا ہے جسوقت کوئی آگ مشتعل نہیں ہوتی اسوقت وہ یہ قرار دیسکتے ہیں کہ کونسی آگ مشتعل کیجائے اور چونکہ خوش قسمتی سے نئی حق رائے دہی کے امتحان کا موقع پرسکون اوقات میں آیا ہے اس لیئے مدبّروں کی ذمہ داری بہت بڑھی ہوئی ہے کیونکہ ان کا اختیار بھی بہت بڑھا ہوا ہے ؟

مسائل کا انتخاب جس درجہ اہم ہے، تقریبًا اسی قدر اہمیت ان منتخب شدہ مسایل کی بحث کو بھی حاصل ہے۔ اعلیٰ مدبّروں کا کام یہ ہے کہ وہ عوام الناس کی رہبری کریں نہ کہ عوام الناس خود ان کے رہبر بن جائیں۔ اسمیں شک نہیں کہ جب مدبّروں کا عروج وزوال عوام کی نظر عنایت پر منحصر ہے جیسا کہ انگلستان میں ہے، ان سے یہ مطالبہ بہت سخت معلوم ہوتا ہے اور بہت غور و فکر سے اسے محدود کرنے کی ضرورت ہے میرا یہ منشا نہیں ہے کہ انگلستان کے مدبّروں کو انگریزی قوم کے ساتھ معلمانہ و تحکمانہ انداز اختیار کرنا چاہیئے۔ انگریزی قوم کو اگر کسی شے سے حقیقی و قطعی نفرت ہے تو وہ بس یہی شے ہے، اور اس تنفر میں وہ بالکل حق بجانب ہے، اگر کوئی شخص ہدایت و تعلیم بغیر اس کے نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے سامعین سے باضابطہ طور پر یہ کہے کہ میں تم سے

برتر ہوں میں نے اس امر کا مطالعہ اسطرح کیا ہے کہ تمنے اُسطرح اسکا مطالعہ نہیں کیا ہے"
تو پھر وہ شخص ایک موزوں ہادی یا معلم نہیں بن سکتا کسی مدبر سے اس قسم کی بدمذاقی کا
ظاہر ہونا دلیل ہے اس کے نارسائی ذہن کی، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں لوگوں
کے ساتھ معاملت کرنے کی قابلیت نہیں ہے اور جو کام اس نے اختیار کیا ہے اسمیں
یہ امر فی نفسہ بہت بڑی دقت کا باعث ہوگا، لیکن عوام الناس کی رہبری کیلئے بہت زیادہ
استدلال کی ضرورت نہیں ہے، اور اس استدلال کے باقاعدہ اظہار کی تو اور بھی کم
ضرورت ہے بڑی ضرورت یہ ہے کہ صاف و واضح نتائج کو مردانہ وار بیان کردیا جائے
اگر کسی مدبر نے ان نتائج کو خوشگوار طریقہ پر بیان کردیا تو اس نے اپنا کام پورا کردیا اور
اگر اسمیں چند پر مذاق خوشگوار تمثیلوں کا اضافہ کردیا تو اور بھی نور علیٰ نور ہوگیا، مدبر ایک
اصولی بات سنا دیتا ہے، اسپر واعظ و پند کہتے رہنا اخبار نویسوں اور انشا پردازوں کا کام ہے
مدبر کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ خود اپنے فطری خصوصیات کا اظہار کردے اور اس کی
نظر میں جو اہم صداقت معلوم ہو اسے صاف الفاظ میں بیان کردے، لیکن جبکہ معاملات
عامہ پر غیر معمولی جہالت کا غلبہ ہو اور خاص ایسے موقع پر وہ ایسی جہالت کے فیصلہ کو قبول
کرکے اسی کو دہرانا چاہے تو وہ محض قوم کا بدخواہ ہے اور نقصان کے سوا اس سے
کوئی نفع نہیں ہوسکتا ؛

کہا جائیگا کہ یہ تو بہت ہی کھلی ہوئی بات ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ دو اور دو،
چار ہوتے ہیں اور اس کا حساب لگانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مگر میرا جواب یہ ہے
کہ عمل کے وقت اس سبق پر نظر نہیں رہتی۔ لوگ اپنی سیاسی حاصل جمع کو اسطرح نہیں
جوڑتے۔ انگلستان کے تمام سیاسی خطرات میں مجھے سب سے بڑا خطرہ یہی نظر آتا
ہے کہ لوگ اس کی پروا نہ کرینگے۔ صاف الفاظ میں یہ کہنا چاہیئے کہ مجھے اندیشہ ہے
کہ انگلستان کے دونوں سیاسی فرقے مزدوروں کی تائید حاصل کرنے کیلئے ایک دوسرے
کو مات دینا چاہینگے۔ دونوں فرقے مزدوروں سے یہ وعدہ کرینگے کہ مزدور اگر صرف اپنا منشا دلی
ان پر ظاہر کردیں تو وہ بخوشی تمام اسپر عمل کرینگے، اور چونکہ تمام معاملات میں، اب آخری فیصلہ
مزدوروں ہی کی رائے پر ہوگا اسلئے دونوں فریق انکی خوشامد کرینگے کہ وہ انکی جانب رائے دیں غریب و
جاہل لوگوں کیلئے اس سے زیادہ مخرب و مصیبت انگیز کوئی امر میرے ذہن میں نہیں آسکتا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ

اور دولتمند اشخاص کی دو جماعتیں علی الدوام انکے فیصلہ کے سامنے سر جھکانے پر آمادہ رہیں اور اس فیصلہ کو عمل میں لانے کے لئے حصول اقتدار کے واسطے باہم مقابلہ کرتی رہیں عامۃ الناس کی آواز، سے اگر اس طرح کام لیا گیا تو وہ (بجائے خدا کی آواز کے) شیطان کی آواز، ہو جائیگی۔

دوسری طرف میرا تصور ایک مخالف خطرہ بھی پیدا کر رہا ہے۔ میرے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ ایسے مسئلے پیش کئے جائیں گے جن پر اگر بار بار شور و اضطراب برپا رہا تو وہ مزدوری پیشہ لوگوں کو ایک طبقہ کی حیثیت سے متحد کر دینگے، اعلیٰ درجات کے لوگوں کو یہ سوچنا ہے کہ آیا وہ ایسی کارروائی پر رضامند ہو جائینگے جس سے یہ سوالات طے پا جائیں یا وہ مزدوروں کے متحد ہو جانے کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہونگے۔

بیشک اس مسئلہ پر مجرد اً بحث کرنا آسان نہیں ہے بہت کچھ انحصار اس پر ہوگا کہ ہر خاص واقعہ کی کارروائی کی نوعیت کیا ہے، اگر اس سے اتفاق کیا جائے تو اس سے کیا خرابی لاحق ہوگی، اگر اس سے انکار کیا جائے تو مزدوروں کے طبقات کو اس خیال سے کس حد تک وابستگی رہے گی، لیکن ان تمام حالتوں میں اس امر کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ادنیٰ طبقات کا بہ حیثیت اپنے طبقہ کے اور خاص اپنے مقاصد کے لئے سیاسی اتحاد قائم کرنا اول درجہ کی خرابی کا موجب ہوگا، اور (اب کہ ان میں سے اتنے کثیر افراد کو حق رائے حاصل ہو گیا ہے)، ان کا دائمی اتحاد انھیں ملک میں سب پر غالب کر دیگا، اور وہ جس حالت میں ہیں ان کے لحاظ سے ان کی فوقیت کے معنی یہ ہونگے کہ جہالت کو تعلیم پر اور تعداد کو علم پر فوقیت حاصل ہو جائے۔ جبتک وہ باہم ملکر کام کرنا نہیں سیکھتے، اوسیوقت تک اس بلا کو ٹالنے کا موقع ہے اور اسکا ٹالنا صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اعلیٰ طبقات غایت درجہ کی دانشمندی اور نہایت دور بینی سے کام لیں۔ ان پر لازم ہے کہ وہ نہ صرف ہر ایک واقعی برائی سے بچتے رہیں بلکہ ان باتوں سے بھی بچتے رہیں جسمیں بظاہر برائی کا ایک شائبہ بھی نظر آتا ہو۔ جبتک اختیار انکے ہاتھ میں ہے، انھیں چاہیئے کہ وہ ہر ایک حقیقی شکایت کو رفع کر دیں انھیں چاہیئے کہ جس مطالبہ کو وہ بے خطر پورا کر سکتے ہوں اسے پورا کر دیں تاکہ انھیں

جبراً و قہراً ایسے مطالبہ کو نہ پورا کرنا پڑے جس سے تحفظ ملک خطرے میں پڑ جائے "
اس صلاح کے نسبت بھی یہ کہا جائے گا کہ یہ تو بالکل بدیہی بات ہے، مگر مجھے
بہت ہی بڑا اندیشہ یہ ہے کہ جب وقت آویگا تو اس صلاح کو جبن و بزدلی قرار دیکر
بالائے طاق رکھ دیا جائیگا۔ انسان میں جنگجوی کا جذبہ اسقدر قومی ہے کہ وہ نہ لڑنے کی
نسبت لڑ کر ہار جانا زیادہ پسند کرتا ہے۔ لوگوں کو یہ سمجھانا کہ وہ لڑنے سے اپنے دشمن
کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ نہایت مشکل کام ہے، لیکن اس موقع پر ایسا ہی ہوگا۔ وجہ یہ ہے
کہ ایک ہزیمت یافتہ معرکہ اور خاصکر ایسا معرکہ جس میں بہت دیر تک میدان کارزار
گرم رہا ہو دونوں درجوں کو باہم متحد ہو جانیکی پوری طرح تعلیم دیدیگا اور اعلیٰ درجات کو ایک
کبیدہ خاطر، منتظم اور فائق رائے دہندہ قوت سے دو چار ہونا پڑے گا، جس شجاعت
سے کہ دشمن کو تقویت پہنچتی ہو اور اس تقویت کی وجہ سے نہ صرف موجودہ جنگ بلکہ مابعد
کی بہت سی جنگوں میں ہزیمت اٹھانا پڑے، ایسی شجاعت افراد و اقوام کے لئے
لعنت ہے "

میرا خیال یہ ضرور ہے کہ ایک جزوی اعتبار سے، ہم ۱۸۶۷ء کے قانون اصلاح
کے اثر کو صاف طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اس اصلاح نے اس ایک تغیر
کو مکمل کر دیا ہے جسکا آغاز ۱۸۳۲ء کے قانون نے کیا تھا۔ اس قانون نے دار الامراء
اور دار العوام کے تعلقات میں جو تغیر کیا تھا، اسکو اس قانون نے تکمیل کو پہنچا دیا ہے
جیسا کہ میں نے اس کتاب میں تشریح کرنے کی کوشش کی ہے، اس معاملہ میں انگریزی
دستور سلطنت کا علمی نظریہ حسب معمول بالکل غلط ہے۔ اس نظریہ کے بموجب
ایوان مجلس وضع قوانین کی دو شاخیں ہیں جو بالکل مساوی اور ایک دوسرے سے
ممیز ہیں، مگر ۱۸۳۲ء کے قانون کے قبل وہ اس طرح سے ممیز نہیں تھیں۔ اسوقت
تک ایک بہت بڑا اور بہت زبردست مشترک عنصر موجود تھا؛ چونکہ اکثر اضلاع
و قصبات میں امرا کا اثر غالب تھا اس لئے دار العوام کے ایک معقول حصہ کی نامزدگی
انھیں کے اختیار میں تھی باقی حصہ میں بھی متمول شرفا کی کثرت تھی اور یہ لوگ بھی اکثر اعتبار سے مثل
امرا ہی کے ہوتے تھے اور امرا ہی سے ہمدردی بھی رکھتے تھے۔ اسوقت دستور سلطنت
جس حالت میں تھا اسکے لحاظ سے دونوں ایوان حقیقتاً ممیز نہیں تھے بلکہ یکساں

نوعیت کے ایوان تھے۔ دونوں ایوانوں کا حاوی وغالب جزو ایک ہی طبقہ یعنی خطاب یافتہ وغیر خطاب یافتہ شرفا میں سے لیا جاتا تھا۔ ۱۸۳۲ء کے قانون سے اس میں بہت تغیر ہوگیا۔ دارالعوام میں امراو شرفا کا غلبہ جاتا رہا، اور یہ غلبہ طبقۂ متوسط کی طرف منتقل ہوگیا۔ اسوقت سے دونوں ایوان بالکل ممیز ہوگئے مگر اس کے ساتھ ہی مساوات بھی نہیں باقی رہی۔ ڈیوک ولنگٹن نے اپنی ایک نہایت مشہور تحریر میں یہ دکھایا ہے کہ دارالامرا کو اس امر پر رضامند کرنے میں اسے کسقدر زحمت برداشت کرنا پڑی کہ وہ اپنی نئی حیثیت کے سامنے سر تسلیم خم کردے اور وقتاً فوقتاً اپنی مرضی کو دارالعوام کی مرضی کے تابع کرتا رہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ ۱۸۳۲ء کے قانون نے جس کام کو شروع کیا اور نامکمل چھوڑ دیا تھا، اسے ۱۸۶۷ء کے قانون نے قطعاً مکمل کردیا ہے۔ اس دوسرے تغیر سے طبقۂ متوسط کے عنصر کو بہت نفع اور طبقۂ اعیان کو بہت نقصان پہنچ گیا ہے۔ اگر آپ دارالعوام کے دونوں جانب کے ارکان اور خاصکر ذی وجاہت ارکان کی فہرست کو نظر غائر سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ ان میں علی العموم امیرانہ نام مثل انگلستان نہیں ہیں۔ خطاب یافتہ امرا کے اقتدار و حیثیت کو دیکھکر آپ کو تعجب ہوگا کہ انگلستان کی حکمراں جماعت کے عہدہ داروں میں ان کا حصہ کسقدر کم ہے۔ اسوقت کے دارالعوام کا انداز اعیانی نہیں بلکہ امیرانہ ہے۔ اسکے نہایت ہی نمایاں مدبرین، قدیم خاندان یا موروثی ریاستوں کے افراد نہیں ہیں بلکہ وہ زیادہ تر مرفہ الحال لوگوں میں سے ہیں مگر اسکے ساتھ ہی ان کا گہرا تعلق نو دولت تاجروں سے بھی ہے۔ اسوقت دونوں ایوانوں کے انداز میں اس سے بدرجہا زیادہ مغایرت ہوگئی ہے جتنی اس سے بیشتر کبھی ہوی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۳۲ء کے قانون اصلاح کی پوری اثرپذیری کے التوا کا باعث وہی تھا جس کا میں ابھی ذکر کرچکا ہوں یعنی جو مدبر اس نئے قایم شدہ نظام کو عمل میں لائے انھوں نے خود اس نظام کے تحت میں تعلیم پائی تھی جسے منہدم کردیا گیا تھا، یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ ان کی پرزور رہبری اس تمام زمانہ تک قائم رہی جبتک خود یہ نظام قائم رہا۔ لارڈ پامرسٹن، لارڈ رسل، لارڈ ڈاربی نے ۱۸۶۷ء سے برس ہی دو برس قبل انتقال کیا یا ان کا اثر زائل ہوگیا؛ دارالامرا کے

متعلق ۱۸۳۲ء کے قانون کے کامل نتائج اسوقت تک نظر نہیں آسکتے تھے جبتک کہ دارالعوام اس قسم کے امرائے جلیل القدر کی رہبری کے زیر اثر تھا۔ ۱۸۳۲ء کے قانون سے جن تغیرات کی توقع تھی ان میں سے بہت سے تغیرات معلق رہے اور اسوقت تک ان کا آغاز نہیں ہوا جبتک کہ اس کارروائی کے بعد ایک دوسری اسی کے مثل اور اس سے زیادہ پرزور کارروائی عمل میں نہ آگئی ہو۔

پس ڈیوک ولنگٹن نے جس کام کو انجام دیا تھا، اب اسے بھی مکمل کرنا ہے۔ اُس نے نصف مشکل کا مقابلہ کیا، اب ہمیں پوری مشکل پر غالب آنا ہے۔ اب انگریزوں کو چپکے ہی چپکے ایسے قواعد بنانا اور ایسے عادی مگر غیر مدون امور رائج کرنا ہیں کہ جن سے دستور سلطنت کے حسب حاجت جب اور جتنی مرتبہ ضرورت ہو دارالامرا، دارالعوام سے دب جائے۔ مجھ سے یہ سوال کیا جائے گا کہ کتنے بار ایسا ہو اور وہ کونسا معیار ہے جس سے آپ کو معلوم ہو کہ اب ایسا ہونا چاہیئے؟

میں اسکا جواب یہ دونگا کہ جب کبھی دارالعوام کی رائے وہی ہو جو قوم کی رائے ہے اور جب یہ واضح ہو جائے کہ قوم نے اپنا عزم مصمم کر لیا ہے تو پھر دارالامرا کو دب جانا چاہیئے۔ اب سوال یہ رہتا ہے کہ قوم نے اپنا عزم مصمم کر لیا ہے یا نہیں اسکا فیصلہ ہر صورت خاص کے تمام واقعات گرد و پیش سے ہونا چاہیئے اور اسی عام طریقہ پر ہونا چاہیئے جس طرح تمام عملی سوالات کا تصفیہ ہوتا ہے۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو ایک طرح کا حتمی و قطعی معیار قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ دارالامرا کو اسبات کا مجاز ہونا چاہیئے کہ جس کارروائی کو دارالعوام نے ایک یا دو یا کسی خاص تعداد تک منظور کیا ہو، اسے دارالامرا مسترد کر سکتا ہے، اور پھر اگر اس کے بعد بھی دارالعوام اسے بار بار پیش کرتا رہے تو یہ نتیجہ نکال لینا چاہیئے کہ قوم نے عزم مصمم کر لیا ہے، مگر حقیقت امر یہ ہے کہ کوئی اہم عملی سوال اسطرح پر کسی معینہ و مشخصہ قاعدے کے بموجب یکساں طور پر فیصل نہیں ہو سکتا۔ اس قاعدے سے تو یہ لازم آتا ہے کہ امرا ۱۸۳۲ء کے قانون اصلاح کو مسترد کر سکتے تھے جسوقت کہ قوم میں اضطراب و استقلال دونوں موجود ہوں اسوقت میں اس قسم کا قاعدہ ایک مہلک و خطرناک سیاسی زہر ہو جائیگا۔ یہ قاعدہ دارالامرا کو یہ سکھائیگا کہ وہ تمام حقیقی واقعات سے آنکھ بند کر لے اور محض ایک مجرد قاعدہ کلیہ کے موافق فیصلہ کرنے لگے۔ اگر ۱۸۳۲ء

ہیں امرا نے اسطرح عمل کیا ہوتا تو انقلاب عظیم ہوگیا ہوتا۔ اسمیں شک نہیں کہ اس قاعدہ میں ایک عام صداقت ضرور ہے۔ کسی مسودۂ قانون کا ایک بار آنا اور اسکا متفقہ و بار آنا اس رائے کے قائم کرنے میں نہایت درجہ مدد و معاون ہوتا ہے کہ آیا قوم اس کارروائی کو قانونی صورت میں لانے پر مصر ہے یا نہیں۔ یہ ایک طرح کا اظہار خیال ہے مگر صرف اظہار خیال ہی ہے اس کے سوا اور امور بھی ہیں جو اسی درجہ تک فیصلہ کن ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ قوم کی متفقہ رائے اسقدر زبردست ہو اور وہ اتنے مختلف ذرائع سے پہنچائی جائے کہ اسکا پائیدار ہونا مسلم سمجھ لیا جائے۔

انگریزی قوم اسقدر مجموعۂ متفرقات ہے کہ جس امر نے ان میں سے ایک بڑے مختلف طبقہ کو الحال کسی شے کا واقعی یقین دلا دیا ہو تو بظن غالب یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ دائماً ایسا ہی یقین کرتے رہیں گے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک قسم کے لوگ کسی عارضی و غلط جوش میں مبتلا ہو جائیں مگر یہ بہت ہی بعید ہے کہ تمام انواع و اقسام کے لوگ ایک ساتھ اسی گرداب میں پھنس جائیں۔

میں تو یہاں تک کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ قاعدہ کم و بیش یہ ہونا چاہئے کہ کسی اول درجہ کے مسئلہ پر جو قانون ایک مرتبہ بھی بہت بڑی کثرت رائے سے دارالعوام میں منظور ہوگیا ہو اس کے مسترد کرنے میں دارالامرا کو بہت ہی پھونک پھونک کر قدم اٹھانا چاہئے۔ یہ ضرور ہے کہ میں اس قاعدے کو ایک ناقابل تبدیل قاعدہ نہیں قرار دیتا ہوں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں عملی ضروریات کے لیئے غیر مبدل قاعدہ پر یقین ہی نہیں رکھتا ہوں۔ کسی جانب کثرت کا ہونا حقیقی و مصنوعی دونوں ہوسکتا ہے اور اگر وہ کثرت حقیقی نہیں ہے، اگر وہ نمائندوں کی رائے کے ساتھ انتخاب کنندوں کی رائے کی بھی حامل نہیں ہے تو کوئی شخص بھی اس پر کسی قسم کی توجہ کرنے کا متقاضی نہ ہوگا۔ لیکن اگر قوم کی رائے مستحکم و ہمہ گیر ہو، اگر ارکان پارلیمنٹ اور جن لوگوں نے انھیں وہاں بھیجا ہے دونوں اس پر فی الواقع یقین رکھتے ہوں تو میری رائے میں امرا کو چاہئے کہ فوراً اس کے آگے سر جھکا دیں اور کسی طرح مقاومت نہ کریں۔

میری خاص دلیل ایک ہے جس پر بہت زیادہ زور نہیں دیا گیا ہے۔ چونکہ میں دعملی دائرہ سے خارج محض، ایک اصولی اہل قلم ہوں اس لئے میں اس بات کے

کہنے کی جرأت کرسکتا ہوں جس کے کہنے کی جرأت پارلیمنٹ کا کوئی منتخب شدہ رکن
نہیں کرسکتا خواہ وہ کنسرویٹو ہو یا لبرل میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میں نئے حلقہائے انتخاب کے
جاہل جم غفیر سے نہایت ہی خائف ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی مقاومت کرنے کیلئے
جہاں تک بھی ہوسکے ایک عظیم الشان و مربوط طاقت قائم ہوجائے دار الامراء و
دار العوام کے تفرقہ نے اس طاقت کو منقسم کردیا ہے۔ جیسا کہ میں تشریح کرچکا ہوں اور
دار العوام اب بھی زیادہ تر اہل دولت کی نمائندگی کرتا ہے اور دار الامراء طبقۂ اعیان کی
ان دونوں طبقوں کا مقصود خاص ایک ہی ہے کہ غیر تعلیم یافتہ ارکان کی حکمرانی کو روکا
یا گھٹایا جائے مگر اسے موثر طور پر روکنے کے لئے انھیں چاہیئے کہ وہ خود آپس ہی میں
منافشہ نہ برپا کریں۔ ان کو یہ نہ چاہیئے کہ وہ اپنے مشترک مخالف کو اپنا مددگار بنانے
کے لئے ایک دوسرے سے بازی لیجانے کی فکر کریں، لیکن دار الامراء اور دار العوام
کے تفرقہ باہمی کا اثر بالکل یہی ہوتا ہے۔ تعلیم یافتہ و دولتمند ونکی دو جلیل القدر جماعتیں حلقہائے
انتخاب سے اپنا فیصلہ چاہتی ہیں اور انتخاب کنندوں کا حصۂ کثیر اب غیر تعلیم یافتہ
غربا پر مشتمل ہے یہ روش دونوں میں سے کسی کے لئے بھی مفید نہیں ہوسکتی تو

علاوہ ازیں ایسا کرنے میں امرا اپنے اس ذاتی وقار کو ضائع کرتے ہیں جس سے
انکھیں بیش از بیش قوت حاصل ہوتی اور جس سے وہ بیش از بیش فائدہ پہنچا سکتے۔ انھیں
اس حکومت امیرانہ کا سرگروہ ہونا چاہیئے تھا۔ تمام ممالک میں نئے اہل دولت پرانے
اہل دولت کی پرستاری کے لئے تیار رہتے ہیں بشرطیکہ وہ انھیں اس کا موقع دیں اور
مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے انگلستان میں نئے اہل دولت اس کے مشتاق ہیں
ظرافت نگار برابر یہ چٹکیاں لیتے رہے ہیں کہ نئے اہل دولت پرانے اہل دولت کے
ساتھ ملجانے کے لئے جسقدر تیز گام، و مضطر و متمنی رہتے ہیں، غالباً کوئی ملک ایسا
نہوگا جہاں منصب کی "بازاری قیمت" اسقدر چڑھی ہوئی ہو جتنی اسوقت انگلستان میں
ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بہت سے ممالک ایسے ہیں جہاں بعض قدیم خاندان امیر ہوں
یا غریب ان کی پرستش تمام آبادی کی طرف سے ایسے جوش اور ایسے جذبات وفاداری
کے ساتھ ہوتی ہے کہ انگلستان کو وہ بات نصیب نہیں ہے لیکن مجھے اس امر میں شک
ہے کہ آیا کوئی ملک ایسا بھی ہے جہاں تمام پرانے اور تمام خطاب یافتہ خاندانوں

کی عزت و توقیر لوگوں کی طرف سے جو دولت میں ان کے برابر بلکہ شاید ان سے برتر، تعلیم و تربیت میں ان کے ہمسر اور صرف نسب و منصب میں ان سے کمتر ہوں۔ اس سے زیادہ آمادگی کے ساتھ ہوتی ہے جیسی انگلستان میں ہوتی ہے۔ علمائے اقتصادیات جن لوگوں کو زندگی کے "مادی" امتیازات کا مالک قرار دینگے وہ ان لوگوں کی پرستش کے لئے گرے پڑتے ہیں جو غیر مادی امتیازات رکھتے ہیں۔ سیاسی اعتبار سے کوئی شئے اس قسم کی اطاعت شعاری سے زیادہ کارآمد نہیں ہوسکتی، بشرطیکہ اس کا استعمال ہوشیاری کے ساتھ کیا جائے اور اس سے روگردانی کرنے اور اسے مسترد کردینے سے بڑھ کر کوئی حماقت نہیں ہوسکتی؛

اس پرستش کی سیاسی اہمیت اس اعتبار سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ بالاتر سیاسی شخص فروتر سیاسی شخص کی پرستش کرتا ہے۔ انتخاب کے وقت میں غیر خطاب یافتہ خطاب یافتوں سے بہت زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ بعض خاص خاص امرا کو ان کی بہت بڑی املاک کی وجہ سے انتخابی معاملات میں بہت بڑا اثر حاصل ہوتا ہے مگر بہ حیثیت مجموعی دارالامرا کو کوئی خاص انتخابی طاقت نہیں ہے۔ اس ایوان کے اندر اسقدر بے زر اور اس ایوان سے باہر اسقدر زردار لوگ موجود ہیں کہ اسکی انتخابی وقعت میں فتور آگیا ہے۔ علاوہ ازیں عالی مرتبگی کے عجیب و غریب اثر کی ایک نوعیت یہ بھی ہے کہ لوگوں پر مجموعۃً اس کا اثر کم پڑتا ہے اور فرداً فرداً زیادہ پڑتا ہے۔ یہ ایک ایسا اثر ہے کہ جسے اکثر لوگ نہیں تو اکثر انگریز، بہت زیادہ محسوس کرتے ہیں اس سے اکثر انگریز کسی قدر شرماتے بھی ہیں۔ اس لئے جب کچھ ایسے لوگ یکجا جمع کئے جائیں جنمیں سے ہر ایک دل میں منصب و بلند مرتبگی کی پرستش کرتا ہے تو یہ تمام جماعت منصب کے خلاف گونہ سخت تقریروں کو صبر و سکوت کے ساتھ سنے گی اور اکثر حالتوں میں اسپر تحسین و آفریں بھی کریگی، ہر شخص کے دلمیں یہ کھٹک رہتی ہے کہ (بالفاظ مسٹر گلیڈ اسٹون) کہیں "امر کیجانب اسکا پنہانی رجحان ظاہر نہ ہوجائے" انھیں اس امر کا یقین نہیں ہوتا کہ ان کے اردگرد کے لوگ کس حد تک ان کی اس کمزوری میں شریک ہیں۔ اسطرح انگریز بہت آسانی کے ساتھ اعیانی جذبات کی مخالفت کے مقر ہوجاتے ہیں حالانکہ یہ امر ان کے احساس کے بالکل

مغایر ہوتا ہے، ان کا مجموعی فعل تو امرا کے سخت مخالف ہوتا ہے مگر علیحدہ علیحدہ ایک ایک کا باطنی احساس خصوصیت کے ساتھ امرا کی جانب مائل ہوتا ہے۔ سنہ ۱۸۳۲ء میں وہ "اجیبی قصبات" جو زیادہ تر امرا کے قبضۂ اقتدار میں تھے اور جس قدر وہ واقعتاً زیر اثر تھے اس سے زیادہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ ان کے زیر اثر ہیں وہ سب کے سب جوش مسرت کے شور و شغب میں گویا بہ گئے، اور ممکن ہے کہ اضطراب و ہیجان کا کوئی اور ایسا ہی بڑا موقع آئے تو امرا اگر اس کے سزاوار ہیں تو وہ بھی غرق سیل فنا ہو جائیں منتشر جوش کو بھڑکانے اور لوگوں کو بڑے بڑے مجامع میں یکجا جمع کرنے سے عمومی جوش میں ترقی ہوتی ہے احیائی حیات کی ترقی سکون و خاموشی سے ہوتی ہے اور ان کا بہت زیادہ اثر خود لوگوں پر اور ان کے خاندانوں پر پڑتا ہے اور بالتخصیص جبکہ نسوانی اثر مفقود نہ ہو۔ امرا کی علانیہ انتخابی قوت ان کی معاشرتی انتخابی قوت کے ہمپایہ نہیں ہوتی۔ انگلستان میں ایک اور بھی درشت ترشے موجود ہے جسے طبقۂ اہل دولت کہتے ہیں اسے "رام کرنے کی ضرورت ہے، اسے زیر نہیں کر سکتے"، یہ لوگ اگرچہ طبقۂ امرا کی بہت کچھ عزت و وقعت کرتے ہیں مگر وہ بہت آسانی کے ساتھ امرا کی مخالفت پر بھی آمادہ کئے جا سکتے ہیں، اور چونکہ وہ طبقہ امرا کی بہ نسبت بہت زیادہ قوی ہیں اس لئے اگر وہ مشتعل ہو جائیں تو امرا کو نیست و نابود بھی کر سکتے ہیں، اگرچہ طبقۂ اعیان کے تباہ کرنے کے لئے یہ ضرور ہے کہ اہل دولت کو جاہل غربا میں ولولہ دار جوش پیدا کرنا پڑیگا لیکن ان جاہلوں کا جوش جب ایک مرتبہ بھڑک اٹھتا ہے تو پھر آسانی کے ساتھ فرو بھی نہیں کیا جا سکتا اور اس کام کے آغاز کرنے والے اس سے جو کام لینا چاہتے ہیں اس سے وہ بدرجہا زیادہ مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

یہ اس اجتماع ضدین کی توضیح و تشریح ہے جس نے بہت سے زیرک امرا کو حیران کر رکھا ہے۔ وہ اگرچہ زبان سے نہیں کہتے مگر دل میں یہ سوچتے ہیں کہ ہمیں کیوں یہاں باندھ کے رکھا گیا ہے؟ ہم دار العوام میں کیوں نہ جائیں جہاں ہمیں اس سے بہت زیادہ اقتدار حاصل ہو جائیگا؟ ہمیں یہ برائے نام منصب حقیقی اثر کے عوض میں کیوں دیا گیا ہے، اگر ہم اصلی وزن کو بے اصل اشیا پر ترجیح دیں تو کیوں نہ ہم حقیقی اثر حاصل کریں"، اس کا جواب یہ ہے کہ جبتک دار الامرا قائم ہے اسوقت تک امرا کی تمام

جماعت بہ حیثیت مجموعی سوسائٹی (نظم معاشرت) پر اس سے بے انتہا زیادہ اثر کرتی رہیگی جتنا کہ دارالامرا کے منسوخ کر دینے کی صورت میں ہوگی، نیز یہ کہ اگرچہ وہ ایک ہوشیار نوجوان امرا دارالعوام میں بہتر کام کر سکتے ہیں لیکن امرا کا قدیمی طبقہ جس میں بڈھے اور جوان، ہوشیار اور غیر ہوشیار سب شامل ہیں، وہ جہاں ہے وہیں اسکا رہنا بہتر ہے۔ اس مسئلہ پر امرا کے کیسی گروہ کا خود غرضانہ احساس وشعور، وہ ایک امرا کی جودت وطباعی کے بہ نسبت دور رس اور عادل منصف ہے ٭

دارالامرا اگر کبھی ناپدید ہوگا تو وہ کسی طوفان ہی میں ناپدید ہوگا اور یہ طوفان اور چیزوں کو بھی علیٰ حالہا باقی نہ چھوڑے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ یہ طوفان دارالامرا کو تو برباد کر دے اور نوجوان امرا کو مع دولت وخطابات کے دارالعوام میں بیٹھنے کیلئے سلامت رہنے دے۔ یہ طوفان غالباً تمام خطابات اور کم از کم تمام قانونی خطابات کو اپنی رو میں بہالیجائیگا اور کسی نہ کسی طرح اس عجیب وغریب نظم کو شکست کر دیگا جسکے بموجب بڑے بڑے خاندانوں کی جایدادیں کل کی کل بڑے لڑکے کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں۔ یہ نظم ایک نہایت مصنوعی نظم ہے۔ آپ اس کے نسبت نازک و دقیق دلائل قائم کر سکتے ہیں مگر ایسے بلند بانگ دلائل نہیں قائم کر سکتے جو عوام الناس کے کانوں تک پہنچیں اور ان پر اثر ڈال سکیں۔ یہ ناانصافی سی معلوم ہوتی ہے اور عام جوش کے زمانہ میں اسکا قائم رہنا محال ہے۔ نپولین کے ضابطہ میں تو اس کے لئے لازمی مساویانہ تقسیم قرار دیگئی ہے۔ انگلستان میں اتنا تو نہو گا مگر املاک کے اسطرح کثرت کے ساتھ یکجا جمع ہونے کے لئے شدید ترین قواعد قائم کئے جا سکتے ہیں۔ یہ یقینی ہے کہ کسی ایسے زوردار طوفان کا اٹھنا اغلب نہیں جس سے بڑی بڑی موروثی جائدادیں تباہ ہو جائیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی اغلب نہیں ہے کہ کوئی ایسی ہنگامہ خیزی ہو جو دارالامرا کو برباد کر دے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ جو تباہی ان دونوں میں سے ایک کو مسمار کر دیگی وہ دوسرے کو بھی باقی نہ چھوڑے گی ٭

پس میرا خیال یہ ہے کہ دارالامرا کے وسیع اختیار کو بہت ڈرتے ڈرتے اور بہت احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے۔ ارباب دولت کے فریق کی سرگروہی کو اپنے ہاتھ میں رکھنے اور اس وسیلہ سے قوم کی سرگروہی پر قابض رہنے کے لئے

امرا کو چاہئے کہ وہ ان ارباب دولت کو آزردہ نہ کریں جن معاملات پر ان کو بنا پڑتا ہے
وہ بہت ہی جزوی معاملات ہیں، انھیں تو چاہئے کہ اپنے اختیار کی بنیاد کو متزلزل
کرنے کے بجائے بہت سے اہم معاملات پر بھی دب جائیں۔ آمدنی میں سے بہت
بڑا حصہ نذر کر دینے سے اگر وہ اپنے اصل سرمایہ کو محفوظ رکھ سکیں، تو انھیں چاہئے
کہ اسے محفوظ رکھیں۔ ڈیوک ولنگٹن نے اس طریق پر برسوں دار الامرا کی رہبری کی
ہے، اور امرا اور اہل ملک کے لئے اس سے بہتر کامیابی کسی اور صورت میں نہیں
ہو سکتی تھی، امرا کو اب صرف یہی کرنا ہے کہ ڈیوک نے جس روش پر انھیں لگایا تھا اسی
روش پر چلتے رہیں ؎

۱۸۵۷ء کے واقعات نے مادام الحیات امرا کی نسبت بڑی بحثیں پیدا
کر دی تھیں اور اس سے ہمیں یہ اہم مقصد حاصل ہوا ہے کہ ایک طرف دار الامرا نے
ٹوری فریق کے سابق سرگروہ لارڈ لنڈہرسٹ نے مادام الحیات امرا کے تقرر کی آخری
تجویز کو شکست دی تو دوسری طرف لارڈ ڈربی نے اپنے زمانہ سرگروہی میں اس کی
خواہش ظاہر کی تھی چونکہ اس قسم کے امرا کے تقرر کی نسبت میں اپنے خیال کے
موافق بہترین دلائل بیان کر چکا ہوں، اس لئے میں یہاں ان دلائل کے اعادے
کی ضرورت نہیں سمجھتا، مجھے صرف اسقدر کہنے کی ضرورت ہے کہ اس خیال کے
متعلق اب میری رائے کیا ہے ؎

میں مادام الحیات امارت کو اس نظر سے نہیں دیکھ سکتا جس نظر سے
اس کے بعض قوی ترین حامی اسے دیکھتے ہیں، میں یہ نہیں خیال کر سکتا کہ یہ کوئی ایسا
طریقہ ہوگا جس سے دار الامرا اور دار العوام کی مستقل مخالفت یا تضاد اٹھ جائے گا،
اس طریق پر اس کے موثر ہونے کے لئے ضرورت ہے کہ مادام الحیات امرا کی
تعداد بہت کثیر ہو۔ لیکن دار الامرا بغیر طوفان برپا کئے مادام الحیات امرا کے یہ تعداد کثیر
مقرر کئے جانے پر ہرگز رضامند نہ ہوگا۔ کوئی ایسی ہی وحشت طاری ہو جائے تو اور
بات ہے، ورنہ امرا ایسا نہ ہونے دینگے، اب اگر یہ طوفان اس شدت کے ساتھ اٹھے
کہ وہ اتنا کچھ کر لے تو ہر طرح پر اغلب یہی ہے کہ اس کی شدت اتنی ہوگی کہ وہ اور
بھی بہت کچھ کریگا۔ اگر یہ انقلاب اسقدر قوی اور اسقدر پر اشتیاق ہے کہ وہ مادام الحیات

امرا کی ایک کثیر تعداد مقرر کردے تو غالب یہ ہے کہ وہ ایوانِ اعلیٰ میں سے موروثی
اصول کو بالکل ہی اڑا دیگا۔ بیشک اس کے برعکس بھی خیال میں آسکتا ہے، ہم ذہن
میں کسی ایسے سیاسی طوفان کا تصور بھی قائم کر سکتے ہیں جو مادام الحیات امرا کے
بنا دینے ہی تک محدود ہے اور پھر دفعتہً رک جائے۔ مگر سیاسیات میں ہمیں نہایت
مستثنٰے حالات کے متعلق اپنے کو پریشان نہ کرنا چاہئے۔ یہی بہت دشوار ہے کہ صریحی
ومنضبط امور کے اغلب وقوع کی نسبت کافی بحث کے ساتھ رائے و قیاس قائم کرلیا
جائے۔ ریاضی کی اصطلاح میں یہ کہنا چاہئے کہ اگر ہم قرون اور نقاط زوج میں ہمہ تن
منہمک ہو جائینگے تو ہم سیاسی قوس شخصی کی رفتار مستقل سے دور جا پڑینگے ؏

دوسری طرف یہ بھی ہے کہ مادام الحیات امارت پر جو اعتراضات ہوتے
ہیں میں ان سے اس قسم کی ہمدردی بھی نہیں کر سکتا جیسی ہمدردی ریڈیکل (استیصالی)
فریق کے بعض ارکان بالطبع محسوس کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مادام الحیات
تقرر سے امرا کو تقویت حاصل ہو جائے گی اور اسطرح ان میں عوام کی مخالفت کرنیکی
زیادہ قابلیت پیدا ہو جائے گی۔ وہ اگرچہ زبان سے نہیں کہتے مگر دل میں یہ سمجھتے
ہیں کہ دارالامرا ہمارا اور تمام لبرلوں کا دشمن ہے۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ امرا کا زیادہ
حصہ ذہین و فطین نہیں ہے، اسمیں دو چار زیرک و ہوشمند پیدا ہو جاتے ہیں،
اس کا تو ہم کچھ علاج نہیں کر سکتے مگر ہم از خود ذہانت و فطانت کے جراثیم انمیں داخل
نہ کرینگے ہم ان میں ہوشیار و فہمیدہ آدمیوں کا کوئی گروہ شامل نہیں کرنا چاہتے کہ مبادا
وہ ہمارے ہی خلاف ہو جائیں،، اس اعتراض سے یہ لازم آتا ہے کہ ہوشیار و فہمیدہ
امرا سے بھی یہی توقع رکھنا چاہئے کہ وہ دارالعوام کی مخالفت اسیطرح کرینگے جیسے
بلید الطبع امرا کیا کرتے ہیں۔ مگر مجھے اس سے انکار ہے۔ بظاہر دارالامرا جیسی اعلیٰ
جگہ ہے ایسی جگہ پر پہنچکر بہت سے ہوشمند اشخاص تا حد مقدور اس جگہ سے محروم
ہو جانے پر مائل نہ ہونگے، کسی اہم فرض کا جب صاف وصریح مقابلہ ہو تو ممکن ہے کہ
وہ یہ نقصان برداشت کریں مگر صرف ایسے ہی مطالبہ کے وقت وہ ایسا کرینگے۔
ایک ذی ہوش شخص کے لئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ دارالعوام کی مسلسل مخالفت ہی
وہ شئے ہے جو دارالامرا کو خطرے میں ڈال سکتی ہے یا جو کسی خاص امیر کو اس کے

منصب امارت سے محروم کر سکتی ہے۔ آپ امرا کے "فہم و ادراک" میں جتنا ہی
اضافہ کرینگے اتنا ہی وہ اس کو سمجھیں گے کہ ان کا حقیقی نفع اسی میں ہے کہ وہ ارباب
دولت کے فریق سے یارانہ پیدا کریں اور اس کے سر گروہ بنیں اور اس دارالعوام کی
مخالفت کی خواہش نہ کریں جہاں ارباب دولت کا یہ فریق حکمرانی کرتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ایک بالکل ہی نیا دارالامرا جسمیں زیادہ تر وہ قابل اشخاص
شامل ہوں جنکا انتخاب ان کی قابلیت ہی کی وجہ سے ہوا ہو۔ وہ بہ اغلب وجوہ یہ
کوشش کریگا کہ سلطنت کے اندر لیاقت و قابلیت کو سب سے حاوی طاقت
بناوے اور دارالعوام کو زیر نہ کرے تو اس کا حریف مقابل تو ضرور ہی ہو جائے کیونکہ
دارالعوام میں علمیت و قابلیت کا معیار عام انگریزوں کے اوسط معیار سے کچھ بہت
زیادہ بلند نہیں ہے۔ مگر اسوقت انگریزوں کی جو حالت ہے اسمیں اس قسم کے دارالامرا
کا تمام اثر بہت جلد زائل ہو جائیگا۔ لوگ کہیں گے کہ "یہ تو بڑے ہی شاطر نکلے"
اور کسی انگریز کی زبان سے یہ الفاظ سخت ملامت کے مرادف ہیں۔ انگریزی قوم اسے
بالکل ہی اجتماع ضدین سمجھے گی کہ متمول اشخاص کی منتخب شدہ جمعیت کے راستے
میں باتیں کرنے والوں اور لکھنے والوں کی نامزد شدہ جمعیت دقتیں ڈالے انگریز مرفہ الحال
و فہمیدہ اشخاص کی حکمرانی کو پسند کرتے ہیں، اور ذہین و طباع امرا کا کوئی گروہ اختیار و اقتدار
میں اس کی برابری نہ کریگا۔

یہ بھی صحیح ہے کہ دارالعوام کی اتفاق رائے کے ساتھ کام کرنے کے لئے اسوقت
اگر بعض ہوشمند و فہمیدہ امرا آمادہ و تیار ہیں تو بعض نہیں بھی ہیں مگر یہ کوئی خلاف فطرت
امر نہیں ہے کہ اعلی منصب اور بڑی قابلیت کے لوگ ایسے لوگوں کے سامنے سر خم
کرنے پر رضامند نہوں جو مرتبہ میں ان سے کمتر اور قابلیت میں بالیقین ان سے
زیادہ نہوں (اس قسم کے امرا بہت ہی کم ہیں بہر حال جو ہیں) ان میں سے بعض
یہ کہینگے "اگر اس اطاعت ہی کے عوض میں سیاسی حقوق ملتے ہیں تو ہمیں یہ زیادہ
پسند ہے کہ ہم ان حقوق سے دستکش ہو جائیں" مگر ایک مادام الحیات امیر جو خود
اپنے زور بازو سے امارت تک پہنچا ہو کبھی ایسا خیال نہ کرے گا۔ وہ نو عمر اشخاص
جنھیں منصب امارت ورثہ میں ملا ہے، وہ اسے خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔ مگر

جنھوں نے کہولت یا پیری کی عمر کو پہنچکر اس منصب کو حاصل کیا ہے وہ ایسا نہ کرینگے۔ مادام الحیات امرا کی ایک معقول تعداد تقریباً ہمیشہ امرا کو اعتدال کی صلاح دیتی رہیگی اور اس صلاح میں وہ تقریباً ہمیشہ برسر حق ہوگی ❊

حال کے مباحث میں ایک اور جزو کو بھی عجیب وغریب نمود حاصل ہوگئی ہے۔ میں نے اس کتاب میں یہ لکھا ہے کہ لوگوں کو اگر یہ بتا دیا جائے کہ ملکہ معظمہ پارلیمنٹ کے مشورے کے بغیر کسقدر کام کرسکتی ہیں، تو لوگ سخت حیرت میں پڑ جائیں اور اس کا ثبوت یقینی ایک واقعہ سے مل چکا ہے۔ چنانچہ فوجی عہدوں کی خریداری کو منسوخ کرنیکا مسودۂ قانون جب امرا نے مسترد کردیا اور ملکہ نے اپنے اختیار خاص سے اس خریداری کو منسوخ کردیا تو ایک عام حیرت طاری ہوگئی ❊

مگر ملکہ معظمہ از روئے قانون جو کچھ کرسکتی ہیں اس کے مقابلہ میں یہ کارروائی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ دوسری باتوں کا کیا ذکر ہے، ملکہ معظمہ اگر چاہیں تو فوج کو منتشر کردیں۔ قانوناً وہ ایک معینہ تعداد سے زیادہ آدمیوں کے رکھنے کی مجاز نہیں ہیں لیکن اگر وہ ایک آدمی بھی نہ رکھیں تو اس کے لئے وہ مجبور نہیں ہیں۔ وہ سپہ سالار اعظم سے لیکر ادنیٰ درجہ کے تمام افسروں تک کو برطرف کرسکتی ہیں۔ وہ تمام جنگی جہاز اور تمام بحری سامان کو فروخت کرسکتی ہیں، وہ کارنوال کی قربانی چڑھاکر صلح کرسکتی اور برٹینی کے فتح کرنے کے لئے جنگ کرسکتی ہیں۔ وہ سلطنت متحدہ کے ہر ایک مرد وعورت کو درجۂ امارت عطا کرسکتی ہیں۔ وہ سلطنت متحدہ کے ہر ایک حلقہ مذہبی کو ایک دار العلوم بنا سکتی ہیں۔ ملکی حکام میں سے اکثروں کو وہ برطرف کرسکتی ہیں، اور تمام بری وبحری فوجوں کو برطرف کر کے ملک کو غیر قوموں کے حملہ کے مقابلہ میں غیر محفوظ بنا سکتی ہیں۔ تو پھر انگریزوں کو یہ خوف کیوں نہیں لگا رہتا کہ ملکہ اس قسم کا کوئی کام کر گزرینگی۔

وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے دو روک موجود ہیں ایک تو وہی مقدمہ چلانے کی قدیمی و درشت روک ہے اور دوسری تبدیلِ وزارت کی جدید و نازک روک ہے۔ کوئی وزیر جو ملکہ کو ان کے اختیار شاہی کے اسطرح استعمال کرنے کی صلاح دیگا جس سے ملک کا امن خطرے میں پڑجائے، اس پر غداری کا مقدمہ چلایا جاسکتا ہے اور ایسا ہوگا۔ انگلستان کے قانون کے اصطلاحی الفاظ میں یہ کہا جائیگا کہ "اس نے ملکہ کے

خلاف جنگ آزمائی کی یا جنگ آزمائی کرنے میں مدد دی ملکہ کو اختیار شاہی کے اسطرح استعمال کرنے کی صلاح دی تا جج کے فیصلہ کے بموجب خود ملکہ کے خلاف بغاوت کا ارتکاب ہوگا اور اس مختصر مگر موثر طریقہ سے ملزم پر الزام ثابت ہوگا اور وہ گردن زدنی قرار پائیگا۔ اختیارات شاہی کے ناواجب استعمال کے لئے یہ ایک کافی حفاظت ہے مگر چھوٹی چھوٹی غلطیوں کے خلاف اس حفاظت سے کام نہیں لیا جاسکتا نیک نیتی کے ساتھ اگر رائے قایم کرنے میں کوئی غلطی ہو جائے اور جس کے نتائج صرف اس حد تک پہنچتے ہوں جسے ایک شخص اچھا اور دوسرا برا کہتا ہو تو اس کے متعلق اسطرح سزا نہیں دیجاسکتی۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی وزیر جو ملکہ کی فوج کو منتشر کردے اس پر مقدمہ چلایا جائے اور ایسا یقیناً ہوگا مگر فرض کیجئے کہ کوئی وزیر بری یا بحری فوج کو اس کی مجوزہ قوت سے بہت گھٹادے، مثلاً فرض کیجئے کہ پارلیمنٹ نے اس غرض کے لئے جو رقم منظور کی ہو وہ اس کا ایک ثلث صرف کرے یا فرض کیجئے کوئی وزیر جو لارڈ پامرسٹن کے سے اصول کا پیرو رہا ہو دفعتہً مسٹر برائٹ و مسٹر کوبڈن کے اصول کا معتقد بن جائے، تو اس صورت میں ان وزرا پر مقدمہ نہیں قائم کیا جاسکتا۔ غداری کا قانون ایسے افعال پر عاید نہیں کیا جاسکتا اور نہ عاید ہونا چاہئے جنہیں عمداً غلطی نہ کی گئی ہو بلکہ ان میں محض فیصلہ اور رائے کی غلطی ہو، جس کے نسبت نیک نیتی سے یہ ارادہ کیا گیا ہو کہ اس سے سلطنت کی بہبود کو نقصان نہ پہنچیگا بلکہ اس سے ترقی و فروغ حاصل ہوگا۔ اختیارات شاہی کے استعمال میں اس قسم کی غلطیوں کا تدارک تبدیل وزارت ہے اور عام طور پر اس سے بہت اچھا کام نکلتا ہے اس جسارت کو اپنے سر لینے کے پہلے ہر ایک وزیر خوب سوچ سمجھ لیتا ہے کوئی وزیر بے سوچے سمجھے اس گرداب بلا میں نہیں پھنسنا چاہتا، مگر باایں ہمہ اس میں دو نقص ہیں۔ پہلا نقص تو یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اس سے تدارک کا کام ہی نہ نکلے بلکہ یہ محض ایک سزا ثابت ہو۔ ممکن ہے کہ کوئی وزیر اپنی موقوفی کی پروا نہ کرے اور کوئی ایسا کام کر گزرے جس کا پلٹنا دشوار ہو، اور اس کے بعد جو کچھ ہوسکتا ہے وہ صرف یہی کہ اسے برطرف کردیا جائے اور اس پر اظہار ملامت کیا جائے۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ اس تدارک کے متعلق زیادہ تر پارلیمنٹ کا ایک ہی ایوان کچھ کرسکتا ہے۔ یعنی صرف دارالعوام ملامت کی قرارداد منظور کرکے وزیر کو

برطرف کرسکتا ہے۔ تیس برس سے اکثر وزارتیں ایسی ہی ہوئی ہیں جنھیں دارالامرا کا
اعتماد حاصل رہا ہے اور اس صورت میں لامحالہ دارالامرا کا اظہار ملامت بہت کم وزن
رکھیگا۔ یہ صرف اتنا ہی ہوگا کہ عام سیاسی ناپسندیدگی میں ایک خاص امر کا یقین کردیا
جائے گویا کسی لبرل حکومت پر کارلٹن کلب نے یا کسی ٹوری حکومت پر رفارم کلب
نے اظہار ملامت کردیا۔ غرض کسی حالت میں دارالامرا کے مخالفانہ اظہار رائے کا
وہ قطعی اثر نہیں ہوگا جو دارالعوام کے اظہار رائے کا ہوگا۔ ایوانِ زیریں ہی حکمران و
انتخاب کنندہ ایوان ہے اور اگر کوئی حکومت اس پر حاوی ہے تو وہ اپنے ضروریات
کے دس حصوں میں سے نو حصہ کی مالک ہے۔ دارالامرا کی تائید شان بڑھانے والی
ہے، برخلاف اس کے دارالعوام کی تائید ضروری ولابدی ہے ؎

یہ مشکلات بالتخصیص خارجی حکمتِ عملی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اندرونی
معاملات میں اکثر و بیشتر مسائل کے متعلق رواجاً یا قانوناً اختیار شاہی محدود ہوگیا ہے
اندرونِ ملک کی حکمرانی کی صورت یہ ہے کہ موجودہ قوانین پر چلتے چلتے گویا ایک گہرا
نشان بن گیا ہے اور اکثر ارباب نظم و نسق انھیں نشانوں پر اسوجہ سے چلتے رہے
ہیں، کہ کسی اور روش پر چلنے کے بہ نسبت ان پر چلنا زیادہ آسان ہے۔ سیاسیات
میں اکثر نازک مواقع مثلاً وہ اظہار رائے جس سے حکومت کی قسمت کا فیصلہ ہوتا
ہے، بالعموم خارجی حکمت عملی یا نئے قوانین کے متعلق پیش آتے ہیں۔ خارجی حکمت عملی
کے مسائل بالعموم اس طور پر وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ حکومت پہلے ہی کوئی کارروائی
کرچکی ہوتی ہے، اور مجلس وضع قوانین کے دو حصوں یعنی دارالامرا اور دارالعوام میں سے
اب صرف ایک حصہ یعنی دارالعوام کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ یہ بتائے کہ اس معاہدے
کے کرنے سے حکومت نے اپنی منزلت زائل کردی ہے یا نہیں ؎

میرا خیال ہے کہ ہر شخص یہ تسلیم کریگا کہ یہ انتظام ایسا نہیں ہے جو بظاہر درست
معلوم ہوتا ہو۔ معاہدات کی اہمیت بھی بالکل ایسی ہی ہے جیسے دوسرے قوانین
کی ہے، پس قانون کے ایک ایک لفظ کے متعلق مشرحاً نیابتی مجالس کی رائے
لینا اور معاہدہ کے نفس مضمون تک پر ان سے مشورہ نہ کرنا صریحاً و بدیہاً مضحکہ خیز
معلوم ہوتا ہے۔ انگریزی دستور سلطنت کی قدیمی صورتوں میں یہ بالکل صحیح ہوتا کیونکہ

اس زمانہ میں اختیار واقعی بادشاہ کے ہاتھ میں تھا، اور چونکہ پارلیمنٹ کا اجتماع بہت ہی کم کم ہوتا تھا اور ہوتا بھی تھا تو دیگر اغراض کے لئے ہوتا تھا، اس لئے اس زمانہ میں یہ ضروری تھا کہ بہت سے معاملات کے متعلق بادشاہ کو اس سے بدرجہا زیادہ اختیار حاصل ہو جتنا اس زمانہ میں کافی و وافی سمجھا جاتا ہے، مگر اب اصلی اختیار بادشاہ کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ یہ اختیار وزیر اعظم و کابینہ یعنی پارلیمنٹ کی ایک مقرر کردہ مجلس اور اس مجلس کے صدر کے ہاتھ میں ہے۔ یہ صورت عملدرآمد سے پیدا ہو گئی لیکن پہلے کوئی شخص یہ تجویز پیش کرنے کی جرأت نہ کرتا کہ خارجی معاملات پر پارلیمنٹ کی کسی ذیلی مجلس کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ پارلیمنٹ یا ملک سے مشورہ کئے بغیر ملک کو بڑی سے بڑی بین الاقوامی ذمہ داریوں کا پابند بناوے۔ کسی دوسری ذیلی مجلس کو اس کے مثل اختیارات حاصل نہیں ہیں اور جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انگریزوں نے دوسرے ماتحت ارباب اختیار کو کس قدر مقید و محدود کر رکھا ہے تو پھر یہ امر نہایت ہی حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے پرخطر و نازک معاملات کو تنہا ایک خفیہ ذیلی مجلس کو تفویض کر کے اسے اسقدر اختیار تمیزی دیدیں۔ اسمیں شک نہیں کہ ایسا کرنا نفع سے خالی نہ ہوگا، بہت سی بظاہر متضاد باتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ مگر پہلی نظر میں یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا تھا۔

میں یہ اقرار کرتا ہوں کہ اگر دونوں ایوان کافی طور پر ہمخیال و ہمرنگ ہوتے تو پھر ایسا کرنے میں کوئی نفع نہیں تھا، اسکے برعکس اگر دونوں ایوان ایسے ہی ہوتے جیسے انھیں ہونا چاہئے، تو میں اس صورت میں بالیقین ایک بڑا نقص سمجھتا۔ اگر ارباب نظم و نسق کو دونوں ایوانوں میں کثرت رائے حاصل ہوتی لیکن کثرت رائے سے غرض مصنوعی کثرت نہیں ہے جو ہر امر کو قبول کر لے بلکہ مراد ایک جائز و معقول کثرت ہے جو حکومت کو برسر حق سمجھنے پر پہلے سے مائل ہو مگر واقعات کے خلاف اور ہر چہ بادا باد کہکر حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے کے لئے تیار نہ ہو اگر کوئی ایسی عمدہ حکومت ہوتی تو میں اسے قطعاً بہتر سمجھتا کہ دول خارجہ کے ساتھ ارباب نظم و نسق کی قرارداد دول کو پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا جائے، اسوقت انھیں وہ بات میسر آتی جو کاروبار کے تمام انتظامات کے لئے بہترین صورت ہے

یعنی عاقلانہ وہمدردانہ تنقید کا فائدہ حاصل ہوتا اور باوجود ہمدردی کے تنقید سے
متجاوز نہ ہوتا چونکہ مجلس وضع قوانین کا حصہ کثیر حکومت کی جانبداری کی طرف مائل
ہوتا اس لئے وہ اس حالت میں کہ حکومت سے کوئی بہت بڑی اور صریحی غلطی
ہو جائے اور کسی صورت میں اسے ملزم نہ قرار دیتا لیکن اگر حکومت سے ایسی غلطی
ہو جاتی تو مجلس وضع قوانین کی کثرت رائے یقیناً اسے ملزم قرار دیدیتی۔ جو ملک
پارلیمنٹی تنظیمات کے لئے موزوں ہوتا ہے اسمیں مجلس وضع قوانین کے ارکان کی جانبداری
کبھی بھی قوم کے صریحی مقصد کی علانیہ مخالفت کی حد کو نہیں پہنچتی۔ اگر ارکان ایسا کریں
تو قوم چونکہ (پارلیمنٹی تنظیمات کی اہلیت رکھنے والی تمام قوموں کی طرح) معاملات عامہ
پر مسلسل توجہ کرتی رہتی ہے اس لئے وہ آئندہ انتخاب اور بعد کے متعدد انتخابوں
کے مواقع پر ان ارکان کے اوپر بڑے سے بڑا پارلیمنٹی تاوان عاید کریگی یعنی وہ
ان کی سیاسی زندگی کا خاتمہ کردیگی۔ انگلستان کا کوئی فرقہ غالب کسی بیحد ناقص معاہدے
کی حمایت میں رائے دینے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ وہ خود اپنی یقینی تباہی کو مول لینے
کے بہ نسبت اپنے سرگروہ سے ترک رفاقت کر لینے کو زیادہ پسند کریگا۔ علیٰ ہذا
کوئی فرقہ قلیل، جسے پارلیمنٹی معاملات کا طویل تجربہ حاصل ہوگا وہ کسی غیر حکومت
کے ساتھ کئے ہوئے معاہدے کو مسترد کردینے کے لئے کسی طرح آمادہ نہوگا۔
انگلستان میں فریق مخالف کے سرگروہ مدرسہ کے لڑکوں کے اس مقولہ کے اچھے
ماہر ہوتے ہیں کہ "دو دو ملکر خوب کھیل سکتے ہیں"، وہ جانتے ہیں کہ دوسری مرتبہ
جب وہ برسر اقتدار ہونگے تو ان کے خلاف بھی اسی قسم کے تیز حربہ سے کام
لیا جائیگا اور اس لئے وہ خود ہی اسکا استعمال نہ کرینگے۔ یہ میلان خیال اس قدر
قوی ہے کہ بہت زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ فریق مخالف کے ایک معمولی رکن نے
باعلان یہ کہا تھا کہ دار العوام کے دونوں فریقوں کے "صدر آرا" (یعنی حکومت
و مخالفت دونوں کے سرگروہ) ہمیشہ درپردہ یہ قرار داد کرتے رہتے ہیں کہ وہ آزاد
ارکان کے اعتراضات کو دبا دینگے۔ اور اس رکن نے جو کچھ کہا تھا وہ اکثر بالکل صحیح
ہوتا ہے۔ اکثر ایسے ظاہری اعتراضات ہوتے ہیں جو حقیقت سے بالکل معرا
ہوتے ہیں یا کم از کم یہ ہوتا ہے کہ مخصوص حالات میں وہ اعتراضات مخالف وجوہات کے

سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ ان آزاد ارکان پر چونکہ خود کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی اور نہ اپنی کسی غلطی کی وجہ سے انھیں نقصان پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے اسلیئے یہ یقینی ہے کہ وہ موقع بے موقع شور مچاتے رہینگے اور کچھ کام کرنے کا شوق دکھائینگے لیکن کسی فریق کے ذمہ دار گروہ جنھیں خود اسی قسم کے مسائل بلکہ ہوسکتا ہے کہ خود انھیں مسائل کا تصفیہ کرنا پڑے وہ اسکو روا نہیں رکھینگے وہ اپنے خاص مفاد اور حب الوطنی کی وجہ سے اس سے انکاری رہتے ہیں کہ ملک کے اندر اپنے اور اپنے فریق کے کسی آنی فائدے کے لئے ملک کو غیر ممالک کے ساتھ دائمی خلش میں پھنسا دیں۔ اسلئے جو حکومت کسی معاہدے کے متعلق گفت وشنود کریگی وہ یہ محسوس کریگی کہ اسکے معاہدہ پر بالیقین نکتہ چینی ہوگی مگر یہ نکتہ چینی راستی اور نرمی کے ساتھ ہوگی۔ یہ معاہدہ ایسے ججوں کے سامنے جائیگا جن کے حصہ کثیر کا میلان اسی طرف ہوگا اور جن کے حصۂ قلیل کا سب سے زیادہ با اثر جزو اس معاملہ میں بڑھی ہوی مخالفت کے خلاف ہوگا، اور معاہدہ پر گفت وشنود کرنے والوں کے لئے بظاہر اس سے بہتر کوئی صورت حال پیدا نہیں ہوسکتی یعنی انھیں یہ یقین ہوگا کہ انھیں فہمیدہ و معقول اشخاص کے سامنے جواب دینا ہے، نافہم ونامعقول اشخاص سے سروکار نہیں ہے۔

اسوقت جو حکومت کسی معاہدے کے نسبت گفت وشنود کرتی ہے کہا جاسکتا ہے کہ وہ مقام باز پرس میں نہیں ہے۔ بلاشبہ اس پر مبہم الفاظ میں ملامت کیجائیگی بینجمین فرینکلین نے کہا ہے کہ " مجھے کسی ایسے صلح نامے کا حال نہیں معلوم ہے خواہ وہ بہترین مفاد کے ساتھ کیوں نہ کیا گیا ہو، جس پر غیر مکتفی ہونے کا الزام نہ لگایا ہو اور اس صلح کے مرتب کرنے والوں کو غیر دانشمند یا خائن نہ کہا گیا ہو، میرے خیال میں اس حکم ربانی کے نسبت کہ مبارک ہیں صلح کرانے والے، یہ سمجھا جائے کہ یہ عالم آخرت سے متعلق ہے کیونکہ اس دنیا میں تو ان پر اکثر لعنت ملامت ہی ہوتی ہے" انگلستان میں معاہدات کی نسبت اس زمانہ میں جو خیال ظاہر کیا جاتا ہے وہ اکثر اسی قسم کا ہوتا ہے۔ فریق مخالف کے اعتراضات میں کوئی بات کام کی نہیں ہوتی، جس سے بعد میں خود اس فریق کے راستے میں

وقت پیدا ہو، اتنا یقینی ہے کہ فریق مخالف کے سرگروہ تقریباً ہر ایک ممکن اعتراض کو پیش کر دینگے۔ کام تو ہو چکا ہے اور اب وہ اسے پلٹ نہیں سکتے انکی نہایت ہی طبعی خواہش بس یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ اگر وہ برسر اقتدار ہوتے اور یہ کام انکے ہاتھ سے انجام پایا ہوتا تو وہ اسے بہت بہتر طریق سے انجام دیتے۔ دوسری طرف یہ بھی بالکل ممکن ہے کہ معاہدے پر واقعی نکتہ چینی بالکل نہو یا یہ کہ جب حکومت نے معاہدہ کر لیا ہے اور کوئی دوسرا اسے باطل نہیں کر سکتا اس لئے فریق مخالف اس کی نسبت کچھ زیادہ کہنا بیکار سمجھے۔ پس حکومت کو کسی نکتہ چینی کا کبھی قطعی یقین نہیں ہوتا۔ نکتہ چینی سے بچ نکلنے کا اسے بہت اچھا موقع حاصل رہتا ہے لیکن اگر کوئی نکتہ چینی ہو تو حکومت کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ نکتہ چینی بہت ہی تند و تیز اور منحصا ہوگی۔ یہ نکتہ چینی کسی غیر ذمہ دار معترض کی سی نکتہ چینی ہوگی، اس ذمہ دار فریق کی سی نکتہ چینی نہ ہوگی جو یہ سمجھتا ہو کہ اگر وہ کوئی مشکل پیدا کرے گا تو ممکن ہے کہ اسے اس مشکل کا تدارک بھی کرنا پڑے اور اسلئے جس بات سے اس مشکل کے پیدا ہونے کا احتمال ہو اس کے کہنے میں وہ محتاط رہیگا۔

یہی وہ صورت ہے۔ جو عام حالات میں واقع ہوتی رہتی ہے اور (ایک فیصدی) غیر معمولی حالت میں جبکہ فریق مخالف کو یہ امید ہو کہ حکومت نے جو معاہدہ کیا ہے اسکی مفروضہ خرابی کی بنا پر وہ حکومت کو شکست دیدیگا تو پھر یہ یقینی ہے کہ نکتہ چینی نہایت ہی ناگوار قسم کی ہوگی اور ایسی باتیں کہی جائینگی جو غیر اقوام کو نہایت ہی گراں گزرینگی حکومت کے مخالفانہ تحریر و تقریر کرنے والوں کی تمام بالغ نظری یقیناً یہ ثابت کرنے میں صرف کیجائیگی کہ انگلستان فریب کھا گیا ہے، چنانچہ واقعی ایک مرتبہ یہ کہا گیا تھا کہ "اخلاق و ذہنی اوصاف کے گویا دو حصے ہو گئے ہیں ایک اخلاقی اور ایک ذہنی اگر پارلیمنٹ کی گفت و شنود کا پہلو اخلاقی ہے اور فریق مخالف کا پہلو ذہنی ہے" وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد فریقانہ بغض و عناد کو انتہائی حد تک پہنچا دیا جاتا ہے کیونکہ فریق مخالف کے لئے کوئی امر مانع نہیں ہوتا۔ معاہدہ ہو چکا ہے، اور اگرچہ اس معاہدہ پر لعنت بھیجی جائے اور جس فریق نے وہ معاہدہ کیا ہو اسے خارج کر دیا جائے لیکن جس مرض کا علاج کرنا ہے وہ علاج تو پورا ہو چکا ہے، اور فریق مخالف اگر برسر اقتدار ہو جائیگا تو اسے اس مرض

کا مدا وا اسکو نا پڑیگا -

مجرد نظریئے کے لحاظ سے انگریزوں کے موجودہ طریق عمل میں یہ نقائص بہت اہم معلوم ہونگے مگر عملاً ایسا نہیں ہے - انگریز مدبر اور انگلستان کے فرنِے درحقیقت بہت بڑے محب وطن ہیں، شاید ہی ان کے جذبات یا ان کے اغراض انھیں اس امر پر راغب کرسکیں کہ وہ انگلستان کے حقیقی مفاد کے خلاف کوئی کام کر گزریں، یا ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جس سے غیر اقوام کی نظروں میں انگلستان کی سُبکی ہو - اگر وہ ایسا کرینگے تو انھیں خود بہت سخت نقصان پہنچ جائیگا لیکن پھر بھی انگریزوں کے موجودہ طریق کار کے حقیقی میلانات وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئے اور ان کی روک صرف قوم کے اور مدبروں کے ذاتی اوصاف کی وجہ سے ہوتی ہے - انگریز اگر اپنے طرز عمل کو بدل دیں تو بھی یہ اوصاف بدستور باقی رہینگے ؏

اس طرز کا بدل دینا درحقیقت مختلف اعتبارات سے مفید ہوگا - اگر یہ ضرورت ہو کہ اس قسم کے معاہدات کے متعلق کسی نہ کسی صورت میں پارلیمنٹ کی منظوری لیجائے تو پھر یہ ضروری ہے کہ معاہدات کے موکد ہونے کے قبل ان پر واقعی بحث کیجائے - معاہدے کے موافق و مخالف دونوں دلائل کو صاف صاف بیان کردینا چاہیئے - بحالت موجودہ جیسا کہ ہم دکھا چکے ہیں یہ مباحثہ اصلیت سے معرا ہوتا ہے - کام ہو چکا ہے اور اسمیں تبدیلی نہیں ہوسکتی، اور جو کچھ کہا جاتا ہے اکثر اسکا نہ کہنا ہی اچھا تھا کیونکہ وہ مخاصمانہ ہوتا ہے اور جو کچھ نہیں کہا جاتا اکثر اسکا کہنا بہتر ہے کیونکہ وہ اہمیت رکھتا ہے - اگر وزرا اس امر پر مجبور ہوں کہ خارجی معاہدات کے جائز العمل ہونے کے قبل وہ اسی طرح اس کو تشریح کرکے واضح کردیں جس طرح کہ وہ اپنے ملکی تجاویز کی قانونی صورت اختیار کرنے کے قبل تشریح کرتے ہیں تو خارجی حکمت عملی کے معاملہ میں انگریزوں کی روش زیادہ مردانہ اور زیادہ واضح ہو جائے ؏

جہاں تک مجھے علم ہے اس کے متعلق تین اور صرف تین ہی اعتراضات ہوسکتے ہیں ؏

اول یہ کہ وزرا کو ہمیشہ یہ گوارا نہ ہوگا کہ جس نیت سے انھوں نے غیر ملکی معاہدات سے اتفاق کیا ہے اسے صاف صاف بیان کردیں - کہا جاتا ہے کہ

"معاہدات ایک اہم اعتبار سے قوانین سے مختلف ہیں، جو حکومت معاہدات کی پابند
بنتی ہے اور جس قوم کو وہ معاہدات کا پابند بناتی ہے، ان معاہدات کا تعلق صرف انھیں
دونوں سے نہیں ہوتا بلکہ ان کا تعلق ایک تیسرے فریق یعنی ایک غیر ملک سے بھی ہوتا
ہے اور اس ملک کے حسیات کا خیال کرنا بھی ایسا ہی ضروری ہے جیسا خود اپنے حسیات
کا، اور دنیا کی موجودہ حالت میں ممکن ہے کہ شاید اس غیر ملک میں مطلق العنان بادشاہت
قائم ہو جہاں بحث و مباحثہ کا طریقہ رائج نہ ہو، جہاں مباحثہ کو کماحقہ سمجھا نہ جاتا ہو، جہاں
مختلف مقرروں کے بیانات کا صحیح صحیح اندازہ نہ کیا جاتا ہو، جہاں بات کی بات میں
نامناسب آزردگی پیدا ہو سکتی ہو"۔ اس اعتراض کو بہت آسانی کے ساتھ اس
طرح دفع کیا جاسکتا ہے، کہ پارلیمنٹ میں معاہدات پر جو مباحثے ہوں وہ امریکہ کی
مجلس سینیات کے اس قسم کے مباحثوں کی طرح "خفیہ اجلاس" میں ہوں اور ان کی کوئی
رپورٹ (اطلاع) شایع نہ کیجائے۔ مگر میں خود یہ سمجھتا ہوں کہ علانیہ مباحثہ کے خطرے میں پڑنا زیادہ
مناسب ہے۔ مطلق العنان حکومتیں انگلستان کی صورت حال کو سمجھ نہیں سکتی ہیں،
"ان کے لئے تو انگلستان ایک مجمع الاضداد ہے جسے اس اجتماع اضداد کے لئے گویا
خدا سے پروانگی ملگئی ہے"۔ وہ اکثر انگلستان کے تنظیمات پر حیران، اس کے مدبروں
سے پریشان اور اسکے اخباروں سے غضبناک رہا کرتے ہیں۔ پس اگر اس حیرانی و پریشانی
میں تھوڑا سا اور اضافہ ہو جائے تو میرے نزدیک اسمیں چنداں قباحت نہیں ہے،
اور اگر اس وجہ اخفا سے مراد یہ لیجائے (اور اکثر منشا یہی ہوتا) کہ تمام صحیح صحیح حالات
کو بیان نہیں کیا جاسکتا تو میرا جواب یہ ہے کہ قوانین کے متعلق بھی تمام صحیح صحیح حالات
کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ تمام اہم قوانین کا اثر بہت وسیع اغراض مالکانہ پر پڑتا ہے،
یہ قوانین سیاسی قوت کے بہت بڑے منبع و مخزن میں مداخلت کرتے ہیں، اور ان
اہم اغراض کو کسی غیر قوم کی حسیات کی طرح نہایت ہی نازک و معنی خیز الفاظ میں زیر بحث
لانا پڑتا ہے۔ پارلیمنٹی وزیر ایسا شخص ہوتا ہے جسے مشق و مہارت سے وہ قدرت
حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کی زبان سے فضول باتیں نہیں نکلتیں ادھر انگریزی پارلیمنٹ
بھی ایک ایسی جمعیت ہے جو لغو و مہمل گستاخانہ باتوں کو بالتخصیص ناپسند کرتی ہے،
اگر ان باتوں سے مقرر کے ساتھ ہی خود ارکان پارلیمنٹ اور ملک کا بھی نقصان

ہوتا ہے تو وہ اسے اور بھی زیادہ ناپسند کریگی ؟

میں خود اس امر سے کلیتہً انکار کرنے کی طرف مائل ہونگا کوئی ایسا معاہدہ بھی ہو سکتا ہے جس کے کافی و مناسب وجوہ انگریزی قوم کے سامنے بیان نہیں کئے جا سکتے اور پھر بھی انگریزی قوم کے لئے اس معاہدے کا کیا جانا ضروری ہے۔ میرے خیال میں تاریخ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سفارتانہ معاملات کے جن امور کے متعلق سکوت اختیار کیا جاتا ہے ان میں سے بہت بڑا حصہ ایسا ہے جنکا ظاہر کر دینا زیادہ بہتر ہوتا۔ بدترین خاندان وہ ہوتے ہیں جن کے ارکان کبھی اپنا دلی خیال ایک دوسرے پر ظاہر نہیں کرتے، وہ ایک طرح کا بناوٹی انداز رکھتے ہیں اور ہر ایک کے دلمیں کچھ نہ کچھ کدورت دبی رہتی ہے۔ ممالک متعلقہ کے لئے تقریباً ہمیشہ یہ بہتر ہوگا کہ وہ حقیقی وجوہات کو سنیں جن کی وجہ سے معاہدے کی گفت و شنود کرنے والوں کو معاہدے مؤکد کرنے کی رغبت ہوئی ہو، اور یہ گفت و شنود کرنیوالے بھی اس صورت میں اپنا کام زیادہ خوبی سے کرینگے کیونکہ معاہدوں میں نصف ابہامات تو اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ معاہدے کی گفتگو کرنے والے اظہار واقعہ کو پسند نہیں کرتے یا اتنی تکلیف نہیں اٹھانا چاہتے کہ اپنے مفہوم کو صاف طور پر خود اپنے ہی دل کے سامنے پیش کردیں اگر انھیں ایک بڑی جمعیت کے سامنے بدلائل اس معاہدے کی حمایت کرنا پڑے تو وہ اس مسئلہ کو صاف کرنے پر مجبور ہو جائینگے ؛

دوسرے یہ کہ جو تبدیلی تجویز کی گئی ہے اس پر یہ اعتراض بھی وارد ہو سکتا ہے کہ پارلیمنٹ ہمیشہ اجلاس نہیں کرتی رہتی اور اگر معاہدات کے لئے پارلیمنٹ کی منظوری کی شرط ہو تو کبھی کبھی پارلیمنٹ کو خلاف وقت بھی طلب کرنا پڑے گا ورنہ معاہدات میں تعویق واقع ہوگی۔ یہ اعتراض فی نفسہ ایک بجا اعتراض ہے مگر میرا خیال یہ ہے کہ اس کا اثر زیادہ دور تک نہیں پہنچتا۔ معاہدات کا بڑا حصہ ایسا ہوتا ہے جسمیں تھوڑی سی تاخیر سے کوئی نقصان نہیں ہوتا اور جن معدودے چند حالات میں ضرورت عاجل داعی ہو تو موسم خزاں میں بھی پارلیمنٹ کا اجلاس ہو سکتا ہے کیونکہ یہ موقع نہایت اہم و نازک ہوگا ؛

تیسرے یہ کہ خارجی معاہدات کے جائز العمل ہونے کے قبل دونوں ایوانہائے پارلیمنٹ کی منظوری ضروری ہو تو اس سے دار الامرا کا اختیار بہت بڑھ جائیگا اور جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے میرے خیال میں یہ بھی ایک بجا اعتراض ہے۔ دار الامرا چونکہ معاہدات کے متعلق وزارت کو خارج نہیں کرسکتا ہے اسلئے اگرچہ غیر ملکی حکمت عملی کے متعلق اس کے مباحثے بہت خوب ہوتے ہیں مگر کسی مختص معاملہ میں اسکا قول قول فیصل نہیں ہوتا اور دار الامرا میں اس قسم کا وقار پیدا کرلنے سے فی الحال واقعی خطرہ ہے۔ وہ اس رہبر کے نقش قدم پر نہیں چلتے جس رہبر کے نقش قدم پر دار العوام چلتا ہے دار العوام میں وزارت کو لازماً کثرت رائے حاصل ہوتی ہے اور یہ فریق کثیر اپنے سرگروہوں کے مرتب کردہ معاہدات سے اگر بوجوہ مناسب اتفاق کرسکتا ہے تو ضرور اتفاق کریگا وہ اختلاف کرنے کے لیے بیچین نہیں ہوگا مگر یہ ممکن ہے کہ دار الامرا کی کثرت رائے ہمیشہ مخالف ہو اور ادھر کچھ زمانہ سے تو بالعموم ایسا ہی ہو رہا ہے اور اس لئے معاہدہ ایسے نکتہ چینوں کے سپرد ہوگا جو قطعاً مخالفانہ روش کا عہد کرچکے ہونگے۔ یہ ایسا ہی ہوگا کہ جس ماہر تعمیرات کے متعلق یہ معلوم ہو کہ وہ "ازمنۂ وسطی کے اصول" کا پابند ہے اس کے نقشہ کو تنقید کے لیئے ایک ایسی مجلس کے سپرد کیا جائے جو "ازمنہ قدیمہ کے اصول" پر کاربند ہو۔

تاہم بہ حیثیت مجموعی میرا یہ خیال ہے کہ امرا کا اختیار بڑھانے میں کسی شدید نقصان کا واقعی خطرہ نہیں ہے۔ جیسا کہ مشرحاً بیان ہوچکا ہے انگلستان کے موجودہ طریق عمل پر صرف اسی وجہ سے کام ہو رہا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں کام ہے وہ معاملہ فہم ہیں اور نئے طریقِ عمل کو بھی اسی قسم کی معاملہ فہمی و موقع شناسی پر اعتماد کرنا چاہیئے۔ دار الامرا کو معاہدات کی منظوری کے متعلق اس طریق پر چلنا چاہیے جس طریق پر وہ قوانین کی منظوری کے متعلق چلتا ہے۔ امرا کو چاہیے کہ خود ان کی رائے اگر مخالفت کی طرف بھی مائل ہو تو بھی وہ ملک کی آواز اور دار العوام کے اقتدار کا پاس و لحاظ کریں چونکہ وہ بھی انگریز ہیں اس لئے نہایت اہم معاہدات کے متعلق غالباً ان کا خیال بھی وہی ہوگا جو اور انگریزوں کا ہوگا۔ اگر ان مواقع پر وہ قوم کی خواہش کے موافق چلنے میں پس و پیش کرینگے تو انھیں وہی سبق ملیگا جو داخلی قوانین کے اہم و اضطراب انگیز

مسائل میں خلاف کرنے سے ملتا اور غیر ملکی معاملات میں اسصورت حال کے واقع ہونیکا اتنا بھی گمان نہیں ہے (جتنا ملکی معاملات میں ہے) کیونکہ اندرونی و تنظیمی مسائل پر امرا کے اغراض واحساس بالطبع دوسرے طبقات سے خلاف ہوتے ہیں یعنی وہ اس اختیار کا اپنے ہاتھ سے نکلجانا نہیں چاہتے جس کے حاصل کرنے کے لئے دوسرے طبقات بیچین ہوئے جاتے ہیں، لیکن خارجی حکمت عملی میں اس قسم کے مخالف اغراض کا کوئی موقع نہیں ہے۔ اس معاملہ میں امرا اور غیر امرا کے اغراض وخواہشات بالطبع ایک ہی سے ہوتے ہیں ؀

خارجی حکمت عملی کے معاملات میں پارلیمنٹ کو اسوقت جسقدر اقتدار حاصل ہے، اگر اس سے زیادہ راست اقتدار دینے کی خواہش ہو تو غالباً یہ بہتر ہوگا کہ معاہدہ کی ہر ایک دفعہ پر باضابطہ اظہار رائے کا مطالبہ نہ کیا جائے، اسکے لئے اتنا کافی ہوگا کہ معاہدہ دونوں ایوانوں کی میز پر کچھ دنوں مثلاً دو ہفتہ کے لئے رکھ دیا جائے اور اگر اس مدت کے اختتام کے قبل کوئی ایوان اس پر اعتراض نہ کرے تو اسے جائز العمل سمجھ لیا جائے ؀

اس کتاب کے لکھے جانے کے بعد انگریزی دستور سلطنت کے جن داخلی امور میں تغیرات ہوئے ہیں یا تغیر کا خیال پیدا ہوا ہے ان کی بابت مجھے جو کچھ کہنے کی ضرورت ہے وہ وہی ہے جنکا میں نے اوپر ذکر کر دیا ہے لیکن غیر ممالک میں بھی کچھ واقعات ایسے پیش آئے ہیں جن سے اس دستور سلطنت پر روشنی پڑتی ہے اور ان کے متعلق بھی میں چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں ؀

یہ ایک طبعی امر ہے کہ ان تمثیلی تغیرات میں سے سب سے زیادہ نمایاں تغیر فرانس میں ہوا ہے۔ ۱۷۸۹ء کے بعد سے فرانس پیہم سیاسی تجربات کی آزمائش کر رہا ہے، اگرچہ ابتک اسے خود ان تجربوں سے بہت کم نفع پہنچا ہے مگر دوسروں کو ان تجربات سے بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ فرانس اب ایک ایسے امر کا تجربہ کر رہا ہے جو خصوصیت کے ساتھ انگریزی دستور سلطنت کا آئینہ ہے۔ جسوقت اس کتاب کا پہلا اڈیشن شائع ہوا تھا اسوقت مجھے لوگوں کو یہ سمجھانے میں بڑی مشکل پیش آئی کہ ایک غیر شاہی سلطنت کے لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ حکام کے

حقیقی سرگروہ یعنی وزیراعظم کو جمعیت قومی کی رائے سے نامزد اور برطرف کیا کرے، اسوقت جو جمہوریتیں موجود تھیں اور جن سے لوگ مانوس تھے وہ ممالک متحدہ امریکہ اور اسی کی مقلد جمہوریتیں تھیں، اور ان میں صورت حال بالکل برعکس تھی، وہاں حکام عاملانہ کا تقرر بھی اسی طرح قوم کی طرف سے ہوتا تھا جس طرح مجلس وضع قوانین کا تقرر ہوتا ہے۔ کسی دوسری قسم کی جمہوریت کی کوئی نمایاں مثال اسوقت موجود نہیں تھی، مگر اب فرانس نے ایک مثال پیش کردی ہے (ایک استثنا کے ساتھ)، موسیو تی ایر اسوقت بالکل ویسا ہی سرگروہ جماعت عاملانہ ہے جس کا خاکہ اتار نے کی میں نے ایک سے زائد مرتبہ اس کتاب میں کوشش کی ہے تی ایر کا تقرر جمعیت کی طرف سے ہوا ہے اور وہی اسے برطرف بھی کرسکتی ہے۔ وہ اس میں بالکل اسی طرح آتا اور اسی طرح تقریر کرتا ہے جسطرح انگلستان کا وزیراعظم تقریر کرتا ہے۔ اب کسی شخص کو ایسی جمہوریت کے امکان میں کوئی شک نہیں رہ گیا ہے جس میں عاملانہ و تشریعی اقتدارات متحد و معین ہوں۔ اب کوئی شخص یہ دعوے نہیں کرسکتا کہ اس قسم کا اتحاد آئینی بادشاہت کی وہ خصوصیت ہے جو اس سے منفک نہیں ہوسکتی ہ

مگر افسوس یہ ہے کہ اس قسم کے دستور سلطنت سے ہنوز ہم اتنا ہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس قسم کا دستور سلطنت ممکن ہے۔ اسوقت تک ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اچھا ہوگا یا برا۔ حالات نہایت ہی مخصوص ہیں، اور یہ خصوصیت تین اعتبارات سے ہے۔ اول یہ کہ ایک خاص پارلیمنٹی جمہوریت یعنی ایک ایسی جمہوریت جس میں پارلیمنٹ وزرا کا تقرر کرتی ہو، اس کا تجربہ ایک قوم میں ہو رہا ہے جس کی نسبت اگر کچھ نہ کہا جائے تو اتنا تو کہنا ہی پڑیگا کہ اسے پارلیمنٹی حکومت کا کوئی خاص ذوق نہیں ہے اور ممکن ہے کہ اسے اس سے خاص بے ذوقی ہو۔ ان خطبات میں آخری خطبہ سے قبل کے خطبہ میں میں نے پارلیمنٹی حکومت کے ذہنی شرائط میں سے ایک شرط کے بیان کرنے کی کوشش کی ہے جسے میں "عقلیت" کہتا ہوں۔ مگر اس سے میری مراد استدلالی قوت نہیں ہے بلکہ اس سے میری غرض دوسروں کے دلائل کے سننے اور ان دلائل کا خاموشی کے ساتھ خود اپنے دلائل سے مقابلہ کرنے اور

جو نتیجہ نکالا جائے اس کی رہبری میں چلنے سے ہے، مگر کسی فرانسیسی مجلس میں بحث و حجت کرنا آسان نہیں ہے۔ ہر ایک مجلس فریقوں، اور فریقوں کے اجزا میں منقسم ہوتی ہے اور فرانس میں ہر ایک فریق بلکہ تقریباً ہر ایک فریق کا ہر یک جزو جو وقت کوئی بات ایسی سنتا ہے جسے وہ بالتخصیص ناپسند کرتا ہو تو وہ شکوہ و شکایت نہیں کرتا بلکہ اسی وقت چیخنا شروع کر دیتا ہے اور چیخنا بھی ایسا جو صرف فرانسیسیوں ہی سے ہو سکتا ہے، پس جس مجلس کا مزاج اس قسم کا ہو وہاں حقیقی بحث و مباحثہ تو ناممکن ہی ہے پارلیمنٹی حکومت بھی ناممکن ہے کیونکہ وہاں پارلیمنٹ نہ آدمیوں کا انتخاب کر سکتی ہے، نہ کارروائیوں کا۔ رجعت شاہی کے زمانہ کی فرانسیسی مجلسیں نسبتاً خاموش معلوم ہوتی ہیں، غالباً اسکی وجہ یہ ہوگی کہ چونکہ ان کا انتخاب ایک محدود حلقۂ انتخاب سے ہوتا تھا اس لئے انمیں اسقدر مختلف الرائے عناصر موجود نہیں ہوتے تھے۔ ان میں پریشان کرنے والے لوگ کم تھے اور اسباب پریشانی کے انواع و اقسام بھی کم تھے، مگر ۱۸۴۸ء والی جمہوریت کی مجلسیں بے انتہا ابتری پیدا کرنے والی تھیں۔ میں نے اس آخری مجلس کو بچشم خود دیکھا ہے اور میں اس امر کی تصدیق کرتا ہوں کہ وہاں کسی نازک مسئلہ پر باستقلال بحث ممکن نہ تھی۔ کسی دوسرے کی سننے کے لئے کوئی راضی نہ تھا، اسوقت جو مجلس ورسیلز میں نشست کر رہی ہے وہ بھی بلا شبہہ اکثر اوقات نہایت ہی طوفان خیز بن جاتی ہے اور جس پارلیمنٹی حکومت کی شکل میں وہ حکمرانی کرتی ہے اُس حکومت کا ایک خاص مشکل میں مبتلا رہنا ضروری ہے کیونکہ بہ حیثیت ذی اقتدار حکمران کے وہ غیر متیقن، حریص اور سرکش ہے۔

یہ دشواری اسوجہ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس جمعیت پر فرانسیسی قوم کی طرف سے کوئی روک نہیں ہے اور ہے بھی تو بہت ہی خفیف، فرانسیسیوں کو بہ حیثیت قوم کے پارلیمنٹی حکومت کی نہ فکر ہے اور نہ وہ اس کی قدر کرتے ہیں، میں نے اس امر کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ناآزمودہ قوموں کے لئے اس قسم کی حکومت کا اختیار کرنا کس قدر دشوار ہے اور غیر تعلیم یافتہ انسان کو بادشاہ کی وفاداری نسبتاً کسقدر زیادہ طبعی یعنی آسان معلوم ہوتی ہے۔ جس قوم کو پارلیمنٹ سے کسی نفع کی توقع نہ ہو اس سے یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی پارلیمنٹ پر نگرانی رکھے گی یا اسے سزا دیگی۔ مجھے اندیشہ

یہ ہے کہ فرانس کو جو کچھ درکار ہے اس کے حصول کی وہ پارلیمنٹ سے بہت کم توقع رکھتا ہے۔ اب چونکہ فرانس میں حق رائے دہی عام ہے تو جماعتہائے ترکیبی کی اوسط تعلیم و تربیت بے انتہا کم ہے اور جو لوگ کچھ دل و دماغ رکھتے بھی ہیں، وہ مدتوں سے حکام کے طوق غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ فرانس کے کسانوں کو دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ فکر یہ رہتی ہے کہ موجود الوقت عہدہ دار سے ان کے تعلقات اچھے رہیں، یہ کسان اسقدر جاہل ہیں کہ پارلیمنٹ کی روک تھام کرنا اور اس پر نظر رکھنا ان سے بعید ہے اور وہ دل کے ایسے بودے ہیں کہ اگر انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ انکے قریب ترین حکام عاملانہ اسے پسند نہیں کرتے تو وہ مذکورہ بالا دونوں میں سے کوئی کام بھی نہ کرینگے۔ ایک قطعی پارلیمنٹی جمہوریت یعنی ایک ایسی جمہوریت جس میں پارلیمنٹ حکام عاملانہ کا تقرر کرتی ہو، اس کا تجربہ فرانس میں انتہا کے ناموافق حالات میں ہو رہا ہے کیونکہ فرانس میں بہت زیادہ اغلب یہی ہے کہ پارلیمنٹ ناقص ہوگی اور اسی طرح یہ بھی بہت زیادہ اغلب ہے کہ وہ اپنے نقائص کے اظہار کے لئے کافی طور پر آزاد ہوگی۔

دوسرے یہ کہ فرانس کا موجودہ نظم سلطنت، برطانوی دستور سلطنت کے تمام موثر و باکار اجزا کی نقل نہیں ہے بلکہ اس کے صرف ایک جزو کی نقل ہے۔ برطانیہ کے دستور سلطنت کے بموجب دارالعوام کے برطرف کرنے کا اختیار رسماً تو ملکہ کو حاصل ہے مگر فی الواقع یہ اختیار وزیر اعظم کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن موسیو تی ایر کو اس قسم کا کوئی اختیار نہیں حاصل ہے اور اس لئے میرا خیال ہے کہ معمولی حالات میں یہ دستور سلطنت بہت جلد ناقابل انتظام ہو جائیگا۔ جیسا کہ میں نے تشریح کرنے کی کوشش کی ہے، نتیجہ یہ ہوگا کہ مجلس ہمیشہ وزارت کو بدلتی رہے گی اور چونکہ اس تغیر سے فرانسیسی مجلس کو اس تاوان کا اندیشہ نہ ہوگا جو اکثر انگلستان میں پیش آتا رہتا ہے، اس لئے وہ ہمیشہ اس قسم کا تغیر کرنے کے لئے تیار رہیگی۔ اس قسم کی مجموعہ متفرقات مجلسوں کا خاص وصف ان کا تلون ہے اور اگر ان پر کوئی روک نہوگی تو وہ علی الدوام اسقدر انتخابات کرتی رہینگی کہ ان کے منتخب کردہ اشخاص کو کبھی زبان سے کچھ کہنے کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ لیکن فرانس کے موجودہ دستور سلطنت کا یہ خاص خطرہ اس کے مخصوص حالات کی وجہ سے رک گیا ہے۔ جمعیت موسیو تی ایر کے برطرف کرنے کی طرف مائل نہیں ہے

کیونکہ اسوقت مجلس کی جیسی افسوسناک حالت ہے، اس حالت میں، وہ موسیو تی ایر
کے بجائے کسی اور کو مقرر نہیں کر سکتی۔ جسقدر شہرت میسر ہو سکتی ہے، تی ایر نے
ان سب کا گویا اجارہ لے لیا ہے۔ جس شہنشاہی کی وہ ہمیشہ مخالفت کرتا رہا ہے اسی
شہنشاہی کے طفیل میں اسے یہ منزلت نصیب ہوی ہے۔ فرانس میں بیس برس تک
بڑے سیاسی نام و نمود کا کوئی شخص پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ شہنشاہ حکمرانی کرتا تھا اور
کوئی دوسرا رکن حکومت کی قابلیت کا اظہار نہیں کر سکتا۔ موسیو روہے۔ اگرچہ
بڑی قابلیتوں کا شخص تھا مگر عام خیال یہی تھا کہ وہ محض شہنشاہ کا کارکن ہے۔ اور
ایسا نہ بھی ہو تو یہی موسیو روہے چونکہ شہنشاہیت کا ایک ہی بڑا شخص تھا۔ اسلئے
وہ ایسے وقت میں کہ شہنشاہی کے خلاف سخت رجعت عمل ہو رہا تھا، اس حکومت
کا سرگروہ نہیں منتخب ہو سکتا تھا۔ بیس برس کی خاموشی کے قبل جن لوگوں کو سرگروہی
حاصل تھی اور جن ممتاز افراد کی نسبت یہ معلوم تھا کہ وہ پارلیمنٹ کے کام کو چلا سکتے
اور پارلیمنٹ پر حکمرانی کر سکتے ہیں، ان میں سے صرف ایک موسیو تی ایر ہی وہ شخص تھا
جس کی صحت جسمانی ایسی تھی کہ وہ اس کام کو از سر نو اختیار کر سکے۔ اس کا اعجاز یہ ہے
کہ چوہتر برس کی عمر میں بھی وہ اس کام کے کرنے کے قابل ہے۔ چونکہ پارلیمنٹی دور کا
کوئی اور بڑا سرگروہ زندہ نہیں رہا تھا اس لئے موسیو تی ایر کا انتخاب نہ صرف بہترین
انتخاب ہے بلکہ اسکے سوا کوی اور انتخاب ہو ہی نہیں سکتا تھا اگر وہ علٰحدہ کر دیا جائے تو کسی
دوسرے کا منتخب کرنا نہایت ہی دشوار ہوگا اور یہی مشکل اسے اسکی جگہ پر قائم کئے ہوئے ہے ہر نازک
موقع پر مجلس یہی سمجھتی ہے کہ موسیو تی ایر کے بعد، طوفان،، آجائیگا اور اسی احساس
پر اسکا دارومدار ہے رئیس جمہوریہ کا تغیر اگرچہ قانوناً ایک سادہ امر ہے مگر عملاً وہ قریب
بہ محال ہے کیونکہ سب لوگ یہ جانتے ہیں کہ یہ تغیر رئیس جمہوریہ کا تغیر نہ ہوگا بلکہ اس
سے اور بھی بہت سی باتیں متغیر ہو جائینگی۔ بہت ممکن ہے کہ اس سے نظم سلطنت
ہی میں تغیر واقع ہو جائے یعنی شاہی یا شہنشاہی نظم پھر قائم ہو جائے؛؛

آخری امر یہ ہے کہ اس خاص حیثیت کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ موسیو تی ایر اسطرح
حکمرانی نہیں کرتا ہے جسطرح ایک پارلیمنٹی وزیر اعظم حکمرانی کرتا ہے۔ وہ فخریہ کہتا ہے
اور ہے بھی ایسا ہی کہ وہ کسی فریق کا سرگروہ نہیں ہے اور چونکہ وہ ایک ایسا شخص ہے

جس کی ضرورت ہر ایک فریق کو ہے اسلئے وہ تمام فریقوں میں سے وزرا کا انتخاب کرتا ہے، وہ ایسا کابینہ مرتب کرتا ہے جسمیں کوئی وزیر کسی معاملہ میں دوسرے سے اتفاق نہیں کرتا اور اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ خود تی ایر تمام ارکان کابینہ سے مختلف الرائے ہو جاتا ہے۔ انتخاب بالکلیہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ معمولی حالت میں پارلیمینٹی وزیر اعظم خود انتخاب نہیں کرسکتا، اسکا فریق اسے اس جگہ پر پہنچاتا ہے، اسکا فریق ہی اسے اس عہدے پر قائم رکھتا ہے، اور اس لئے اس فریق کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ چونکہ وہ وزیر کی مدد کرتا ہے اسلئے وزیر اسکی مدد کرے، چونکہ وہ فریق سلطنت کی بہترین شے وزیر کو دیتا ہے اس لئے وزیر اس سے دوسرے درجہ کی بہترین اشیاء اپنے فریق کو دے، مگر موسیو تی ایر پر کوئی ایسی قید عاید نہیں ہے۔ وہ جس طرح چاہے، انتخاب کرسکتا ہے اور کرتا ہے۔ کابینہ کے انتخاب اور ایوانوں کے انتظام کسی میں بھی وہ ان امور کے زیر اثر نہیں چلتا جن کے زیر اثر عام حالات میں کوئی ایسا ہی دوسرا شخص چلیگا۔ وہ اپنے وقت کا ایک استثنا ہے وہ کسی دائمی حالت کی کوئی مثال نہیں ہے؎

پس ان وجوہ سے اگرچہ ہم خالص پارلیمینٹی جمہوریت یعنی بغیر بادشاہ کی شاہی کے خیال قائم کرتے ہیں فرانس کے موجودہ دستور سلطنت سے اپنے تصورات و تخیلات میں کارآمد اعانت حاصل کرسکتے ہیں، مگر اس سے بہت زیادہ آگے قدم نہیں بڑھانا چاہتے۔ وہ اپنی نوعیت میں اسقدر منفرد اور اپنے حادثات و واقعات میں اس قدر مخصوص ہے کہ وہ اپنے سوا اور کسی کی رہبری کا کام نہیں دیسکتی؎

اس خطبہ میں میں نے انگریزی دستور سلطنت سے مقابلہ کرتے وقت امریکہ کے دستور سلطنت پر بھی بہت سی رائیں دی ہیں اور میری پہلی تحریر کے بعد سے اس دستور سلطنت کے تجربہ کا بالکل ہی نیا عالم سامنے آگیا ہے۔ میرا بڑا مقصد یہ تھا کہ رئیس جمہوریہ کے عاملانہ عہدہ دار ہونے کی حیثیت سے وزیر اعظم سے اس کا مقابلہ کرکے دکھاؤں اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ایک خاص اعتبار سے انگریزی نظم اس سے بدرجہا بہتر ہے میں نے بہت زیادہ جگہ صرف کردی۔ انگلستان کا وزیر اعظم چونکہ حاوی و غالب مجلس تشریعی کے انتخاب سے مقرر ہوتا اور اسی کی مرضی سے برطرف کیا جاسکتا ہے اس لئے یہ یقینی ہے کہ وہ اس مجلس پر

اعتماد کر سکیگا۔ اگر اسے اپنی روش کی اعانت کے لئے وضع قانون کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے لئے یہ نہایت ہی آسان ہے اور وہ اس روش کو چلا سکتا ہے، مگر امریکہ کے رئیس جمہوریہ کو یہ اطمینان نہیں حاصل ہو سکتا۔ اس کا انتخاب ایک خاص طور پر ایک خاص وقت میں ہوتا ہے اور کانگریس (موتمر) کے دونوں ایوانوں کا انتخاب دوسرے طریق پر اور دوسرے وقت میں ہوتا ہے، دونوں کے باہم وابستہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی اور واقعی تو یہ ہے کہ وہ برابر ایک دوسرے سے خلاف کرتے رہتے ہیں ؎

یہ تحریر مسٹر لنکن کے زمانے میں لکھی گئی تھی جبکہ کانگریس (موتمر) رئیس جمہوریہ اور تمام شمال ایک شخص واحد کی طرح جنوب کے خلاف جنگ میں متحد تھا، اسوقت خاص نا اتفاقی کی کوئی مستند مثال نہیں تھی، لیکن ان خطبات کے پہلی مرتبہ "فورٹ نائٹلی ریویو" میں شایع ہونے اور ان کے کتاب کی صورت میں جمع کئے جانے کے درمیانی زمانہ میں مسٹر لنکن قتل ہو گئے، اور مسٹر جانسن نائب رئیس جمہوریہ، رئیس ہو گئے اور تقریباً چار برس اس عہدہ پر فائز رہے ایسے وقت میں صدارتی طریقہ کی مخصوص خرابیاں نہایت ہی نمایاں طور پر ظاہر ہوئیں، بجائے اسکے کہ جمہوریہ اور مجلس میں گہرا اتحاد ہوتا اتنا بھی نہیں تھا کہ وہ معمولی مراسم اخلاق کو نگاہ رکھتے (حالانکہ عمدہ حکومت کے لئے اتحاد باہمی کی ضرورت مسلم ہے) بجائے اس کے کہ وہ مسلسل و مربوط اتحاد عمل سے کام لیتے، دونوں ہر وقت ایک دوسرے کے راستہ میں دقتیں حائل کرنے میں سرگرم رہے۔ جنوب کو ساکن کرنے کے لئے رئیس جمہوریہ کی تجویز کچھ اور تھی، موتمر کی تجویز کچھ اور تھی، موتمر رئیس جمہوریہ کی تجاویز کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی اور رئیس کو جب تک دستور سلطنت کی رو سے موقع ملتا رہا وہ موتمر کی تجویزوں کو محو کرتا رہا اور جب باوجود اس کے بھی وہ تجویزیں منظور ہو گئیں تو اس سے جہاں تک ہو سکا اس نے ان کے عملدرآمد میں دقتیں ڈالیں (اور یہی غنیمت تھا) اکثر ملکوں میں یہ مناقشہ قانونی حد سے باہر نکل جاتا اور حرب و ضرب کی نوبت آجاتی لیکن امریکہ تک میں (جو تمام ملکوں سے زیادہ قانون کا شیدائی ہے) یہ مناقشہ قانون کی انتہائی حد تک پہنچ گیا تھا۔ مسٹر جانسن نے مجلس وضع قوانین کی نہایت

عمومی شاخ یعنی دارالنائبین کی نسبت یہ کہا کہ وہ ایک جماعت ہے "جو حکومت کی
جان کے پیچھے لگی رہتی ہے" اور اس ایوان نے رئیس کو مجرم قرار دیکر اس امید میں
اس پر مقدمہ چلایا کہ اس طرح قانون ملکی کے اندر رہ کر وہ اس سے گلو خلاصی کر لے گی
دستور سلطنت کی حیثیت سے کوئی امر اس واقعہ سے زیادہ امریکہ کے دستور سلطنت
کے لئے مضر نہیں ثابت ہو سکتا۔ باہم معاند مجلس وضع قانون اور جماعت عاملانہ اس
طرح ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دی گئی تخفیف کہ مجلس نے اس کی جماعت عاملانہ سے
خلاصی حاصل کرنے کے لئے اس پر خلاف قانون کارروائیوں کا الزام لگایا اور پھر بھی
اس مقصد میں اسے کامیابی نہوئی۔ مجلس وضع قانون، رئیس جمہوریہ کے قانونی اختیار سے
اس درجہ خائف تھی کہ اس نے اس پر ناواجب طور پر قانون سے متجاوز کارروائی
کرنے کا الزام لگایا۔ اس سے امریکہ کے دستور سلطنت پر جسقدر الزام عاید ہوتا ہے
اسی قدر اہل امریکہ کی سیاسی اخلاق کی تعریف بھی نکلتی ہے۔ بہت ہی کم قومیں ایسی ہونگی، بلکہ شاید
کوئی بھی نہوگی جو ایسے کڑے امتحان میں اس سہولت اور کمال کے ساتھ پوری اتراتی۔
رئیس جمہوریہ اور موتمر کے درمیان کسی وقت میں بھی جو ناچاقی واقع ہوی ہو
یا آئندہ واقع ہو یہ اس کی ایک نہایت ہی نمایاں مثال ہے۔ غالباً ممالک متحدہ
سالہا سال تک بہت ہی تلخی کے ساتھ اس امر کو یاد رکھینگے کہ ان کی تمام تاریخ میں
جسوقت سب سے زیادہ ضروری یہ تھا کہ جنوب کو ساکن کرنے کی روش کے متعلق
وہ اپنی تمام قوت و دانائی کو مجتمع کر دیں، عین اسی وقت اس روش میں ایک ایسے مناقشہ
کی وجہ سے اختلافات پیدا ہو گئے جو انتہائی حد تک ناموزوں و ذلت آمیز تھے۔ لیکن
یہ کام زمانۂ مابعد کے کسی قابل مورخ کا ہوگا کہ وہ صحت و تفصیل کے ساتھ انتہا تک
اس کو پتہ چلائے، ابھی اس واقعہ کو گزرے ہوئے بہت ہی کم زمانہ ہوا ہے اور میں
یہ ادعا نہیں کرسکتا کہ مجھے اس کے متعلق کافی معلومات حاصل ہیں۔ میں خود ان واقعات
سے کافی نتایج اخذ کرنے کی جرات نہیں کرسکتا، میں صرف اتنی پیشین گوئی کر سکتا ہوں
جب یہ نتایج اخذ کئے جائینگے تو نہایت ہی اہم اور نہایت ہی دلچسپ ہونگے ؛
لیکن واقعات کا ایک سلسلہ ایسا ہے جو خانہ جنگی کے شروع ہونے اور
اس کتاب کے پہلی مرتبہ شایع ہونے کے بعد سے امریکہ میں پیش آیا ہے اور

اس کے متعلق میں کچھ تفصیل سے کہنا چاہتا ہوں، میری مراد مالی واقعات سے ہے
یہ واقعات میرے مخصوص مطالعہ کی حد کے اندر واقع ہیں اور اس پر رائے قائم کرنا
بھی نسبتاً آسان ہے کیونکہ شمار و اعداد کے دقیق مباحث جو کچھ بھی ہوں مگر نقدی
معاملات کے اہم نتائج کا اثر تمام نوع انسان پر پڑتا ہے اور سب کو اس سے دلچسپی
ہے۔ امریکہ کی مالیاتی تاریخ کے اس حصہ کے ہر ایک جزوی واقعہ سے پارلیمنٹی و
صدارتی حکومت کا فرق واضح و روشن ہو جاتا ہے *

پارلیمنٹی حکومت کی نمایاں صفت یہ ہے کہ معاملت عامہ کے ہر ایک
درجہ پر بحث و مباحثہ ہوتا ہے۔ عوام اس بحث مباحثہ میں مدد دیتے ہیں اور جو
ارباب حکومت عوام کے حسب خواہش کام نہیں کرتے انھیں وہ پارلیمنٹ کے
توسط سے خارج کر سکتے اور ان کے بجائے ایسے لوگوں کو با اقتدار بنا سکتے ہیں
جو ان کے حسب خواہش کام کریں مگر صدارتی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں اکثر مواقع
پر اس قسم کا کوئی مباحثہ نہیں ہوتا، اور مباحثہ ہوتا بھی ہے تو حکومت کی قسمت کا
انحصار اس پر نہیں ہوتا اور اس لئے قوم اس پر کچھ توجہ نہیں کرتی۔ فی الجملہ یہ ہوتا
ہے کہ ارباب نظم و نسق جس کام کو چاہتے ہیں کرتے ہیں اور جس کام کو نہیں چاہتے
اس سے گریز کرتے رہتے ہیں، ان پر بس اتنی ہی روک رہتی ہے کہ عامۃ الناس کو
ضرورت سے زیادہ آزردہ نہ کردیں قوم بالعموم کچھ توجہ نہیں کرتی ہے۔ لیکن اگر
مہیب غلطیاں کر کے آپ اسے اس جانب متوجہ کردیں تو وہ اسے یاد رکھے گی اور
وقت آنے پر آپ کو خارج کر دے گی۔ وہ آپ پر یہ ظاہر کردیگی کہ آپ کا اختیار بہت کم
ہے اور اسلئے فی الوقت اس اختیار کو کمزور کردیگی، ایک آزاد قوم کے ہاتھ میں سکڑوں
طریقے ایسے ہیں جنھیں وہ بلا توقف ان حکمرانوں کے متعلق کام میں لا سکتی ہے جنھیں
اسنے کل منتخب کیا ہے اور اگلے دن انھیں خارج کردیگی یا دوبارہ منتخب کریگی۔ پس قوم
انھیں ذرائع سے ان کی موجودہ حکومت کے بقا کو ناقابل برداشت اور ناگوار بنا دیگی *

امریکہ میں مالیات کے متعلق نہایت ہی نمایاں اثر ظاہر ہوا ہے وہ پہلی نظر
میں یقیناً بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس سے حکومت کو یہ موقع ملگیا ہے کہ وہ اخراجات
سے زائد آمدنی میں سے بہت بڑی بچت کر کے اسے قائم رکھے۔ خانہ جنگی کے

قبل بھی ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۷ء تک حکومت نے ایسا کیا تھا۔ اگرچہ یہ نہایت ہی
تعجب انگیز معلوم ہوگا مگر مسٹر ولز کہتے ہیں کہ "کوئی برس بھی ایسا نہیں تھا کہ قومی خزانہ
میں مختلف ذرائع سے حاصل شدہ بچت سال رواں کے اختتام میں سالِ ماسبق کے
مجموعی خرچ سے زائد نہ ہو جاتی ہو۔ اور بعض سال ایسے گزرے ہیں کہ سابق کے
بارہ مہینوں میں جتنا خرچ ہوا ہو بچت اس سے قطعاً زیادہ ہو جاتی تھی"۔ لیکن جنگ
کے بعد جو کچھ واقع ہوا اُس کے مقابلہ میں جنگ کے قبل کی تاریخ کچھ بھی نہیں ہے۔
خانہ جنگی کے بعد سے مخارج سے مداخل کی افزونی حسب ذیل ہوئی ہے:۔

سال مختتمہ ۳۰ جون	
۱۸۶۶ء	۵۵۹۳۰۰۰ پاؤنڈ
۱۸۶۷ء	۲۱۵۸۶۰۰۰ "
۱۸۶۹ء	۴۴۴۲۰۰۰ "
۱۸۷۰ء	۱۸۶۲۷۰۰۰ "
۱۸۷۱ء	۱۶۷۱۲۰۰۰ "

جو شخص پارلیمنٹی حکومت کے کاموں سے کچھ بھی واقف ہوگا وہ ایک لمحہ کیلئے
بھی یہ خیال دل میں نہ لاویگا کہ کوئی پارلیمنٹ بھی حکام عاملانہ کو اتنی وسیع بچت اپنے ہاتھ
میں رکھنے کی اجازت دیدے گی۔ انگلستان میں جنگ واٹرلو کے بعد اسوقت کی حکومت
نے یہ تجویز کی تھی کہ وہ معتدل مقدار میں کچھ بچت اپنے ہاتھ میں رکھے اور اسے قرضہ
کی تخفیف میں صرف کرے مگر انگریزی پارلیمنٹ اس کی بھی روادار نہ ہوئی حالانکہ یہ وہ
حکومت تھی جس نے جنگ کو کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچایا تھا، فتح واٹرلو کا سہرا
اس کے سر تھا اور اس لئے وہ حکومت نہایت ہی مضبوط تھی اور علاوہ اس کے
جنبی تعصبات کے عناصر کی تقویت بھی اسے حاصل تھی، اس کے خزانہ کا اثر ایسا تھا
کہ اس کے بعد تو بالیقین کسی حکومت کو یہ اثر حاصل نہیں ہوا ہے اور شاید اس کے
قبل بھی کسی حکومت کو حاصل نہ رہا ہو ایسی حکومت کو بھی کوئی بچت اپنے پاس رکھنے میں
کامیابی نہیں ہوئی۔ ارباب نظم ونسق کو باوجود اپنی تمام طاقت وقوت کے (خواہ وہ نیکی
سے حاصل ہوئی ہو یا بدی سے) اطاعت ہی کرنا پڑی۔ محصول آمدنی منسوخ کر دیا گیا اور

اس کے ساتھ ہی بچت بھی غایب ہوگئی، اور بچت کے مفقود ہونے سے قرضے کے کسی معقول حد تک گھٹانے کے تمام موانع بھی اسوقت ناپدید ہوگئے۔ سچ یہ ہے کہ محصول ادا کرنا اسقدر تکلیف وہ ہے کہ کسی ذی حس قوم میں جسے اپنے خیالات کے ظاہر کرنے اور انھیں عمل میں لانے کے مستحکم وسائل حاصل ہوں، کسی بڑی بچت کا قائم رکھنا نہایت دشوار ہے۔ فریق مخالف ہمیشہ یہ کہیگا کہ یہ بے ضرورت ہے، نامناسب ہے، غیر منصفانہ ہے اور اس کی صدا سے بازگشت سے ہر ایک حلقۂ انتخاب گونج اٹھیگا۔ خاص شہروں میں علی التواتر بڑے بڑے جلسے ہونگے، یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے حلقہائے انتخاب میں بھی علیٰ قدر حیثیت چھوٹے چھوٹے جلسے منعقد ہونگے۔ جو لوگ ارکانِ پارلیمنٹ کا انتخاب کرتے ہیں وہ پارلیمنٹ کے ہر ایک رکن پر دباؤ ڈالیں گے۔ اس معاملہ میں شہر اور دیہات میں کوئی فرق نہ رہیگا کیونکہ دیہاتوں کے معززین اور کاشتکار بھاری محصولوں کو ویسا ہی ناپسند کرتے ہیں جیسے شہر کے لوگ۔ قرض ادا کرنے کے لئے بھاری محصولوں کے ذریعہ سے گراں مقدار بچت کا قائم رکھنا انگلستان میں کبھی ممکن نہیں ہوا ہے اور امریکہ نے جتنی وسیع بچت قائم کر رکھی ہے، وہ تو صریحاً ناممکن ہے؛

اس میں شک نہیں کہ انگلستان و امریکہ کے درمیان بعض فرق سیاسی اسباب سے نہیں بلکہ اقتصادی اسباب سے پیدا ہوتے ہیں امریکہ ایسا ملک نہیں ہے جسے محصولوں کا احساس ہو، بلکہ شاید کبھی کوئی بڑا ملک ایسا نہیں ہوا ہے جو اس بارے میں اس درجہ بےحس ہو۔ بہر نوع اتنا تو یقینی ہے کہ اس معاملہ میں انگلستان کے مقابلہ میں امریکہ کا احساس بہت ہی کم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ بہت زیادہ مالدار ہے وہاں روزمرہ کی صرفت نہایت ہی عام، نہایت ہی ماہرانہ، اور نہایت ہی نفع بخش ہے، اس لئے وہاں کے لوگوں کو مالی بار کا کچھ زیادہ فکر نہیں ہوتا۔ سائنس، ہنرمندی اور ترتیب یافتہ محنت کے جو وسائل مدتہائے دراز تک بڑی زحمتیں اٹھانے کے بعد قدیم ممالک میں پیدا ہوئے ہیں، امریکہ ان تمام وسائل کو نئے ممالک کی زرخیز ترین زمین اور زرپاش ترین معاون کو ترقی دینے میں، بڑی سرعت کے ساتھ کام میں لا رہا ہے، اور اس کا ثمرہ یہ ہے کہ وہاں کی دولت کا کوئی حد و قیاس نہیں، ایسی قوم میں اگر پارلیمنٹی حکومت

بھی ہو تو انگریز جتنی سہولت کے ساتھ کسی محصول کے برداشت کرنے پر آمادہ ہونگے، اس سے بدرجہا زیادہ سہولت کے ساتھ یہ قوم محصول کو برداشت کر سکتی ہے اور برداشت کرلے گی۔

مگر اس خصوص میں طبعی حالت کا فرق سیاسی نظام کے فرق کے مقابلہ میں بہت کم اہمیت رکھتا ہے۔ اگر امریکہ پارلیمنٹی حکومت کے تحت میں ہوتا تو اسے بہت جلد یہ یقین ہو جاتا کہ اس کثیر المقدار بجت کے قائم رکھنے اور اس بھاری محصول کے ادا کرنے سے وہ خود اپنے کو بہت بڑا نقصان پہنچا رہا ہے۔ امریکہ کوئی بڑا قرض نہیں ادا کر رہا ہے بلکہ ایک بڑی ناانصافی کو مستقل بنا رہا ہے۔ امریکہ اپنے اس طریق سے آئندہ نسلوں کو تخفیف محصول میں مدد دے رہا ہے مگر درحقیقت وہ صنعت و حرفت کو مفلوج اور اسے جگہ سے بے جگہ کر کے آئندہ نسلوں کے لیئے بدرجہا زیادہ نقصان رساں ہو رہا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسوقت کے گراں محصولوں کو قائم رکھنے کی وجہ سے یہ مجبوری لاحق ہو رہی ہے کہ بہت سے محصول جو آزاد تجارت کے اصول کے منافی ہیں وہ قائم رکھے جائیں۔ کروڑ گیری سے بے اندازہ محاصل کے وصول ہونیکی ضرورت ہے اور اہل امریکہ اس کی خواہش بھی کریں تو بھی یہ امر قریب بہ محال ہے کہ اندرون ملک کے مال پر اسی کے برابر محصول لگایا جاسکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اہل امریکہ علاوہ اس رقم کے جو وہ حکومت کو ادا کرتے ہیں ایک بہت بڑی رقم اپنے بعض ہموطنوں کو دیتے ہیں اور اسطرح بہت سی ایسی حرفتوں کی نشو و نما کا باعث ہوتے ہیں، جنھیں ہرگز قائم نہ رہنا چاہئے تھا، یہ حرفتیں اسوقت برے قسم کے ستونوں میں داخل ہیں کیونکہ دوسری حرفتوں میں اس سے بہتر فائدہ ہوتا اور بعد میں جب قرض ادا ہو جائیگا اور امدادی محصول اٹھا لیا جائیگا تو پھر ان حرفتوں کے باعث اپنی جیب سے بہت کچھ نقصان اٹھانا پڑیگا۔ اسوقت غالباً صنعت و حرفت اپنی طبعی روش پر آجائیگی، یہ مصنوعی تجارت پہلے تو گھٹے گی اور پھر بند ہو جائیگی اور جو معینہ سرمایہ اس تجارت میں لگا ہوگا اس کی قیمت بالکلیہ گر جائیگی اور اس کا بہت بڑا حصہ بیکار ہو جائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ تجارت و صنعت پر جتنے محصول بھی لگائے جاتے ہیں، سب مختلف اعتبارات سے ان کے لئے مضر ہیں، سیکڑوں طرح سے تجارت

کو نقصان پہنچائے اور اسکی قوت حاصل خیز کو بے انتہا گھٹانے کے بغیر آپ علی التسلسل
اس قسم کے بہت زیادہ محصول نہیں لگا سکتے۔ اسلئے اسوقت بھاری بیڑیوں میں جکڑا ہوا
کام کر رہا ہے اور اس کے لیے غالباً یہ بہتر ہوگا کہ اگر ایک یا دو نسلوں کو نسبتاً گراں محصول
بھی ادا کرنا پڑے تو بھی وہ ان بیڑیوں کو ہلکا کر دے۔ ان نسلوں کو فی الحقیقت اس سے
نفع پہنچیگا کیونکہ ان کی دولت اسقدر زیادہ بڑھ جائیگی کہ حکومت کے خرچ میں خفیف
سے اضافہ کو وہ محسوس بھی نہ کرینگے۔ بہر نوع پارلیمنٹی حکومت کے تحت میں ہمیشہ اس
اصول کی تلقین ہوتی رہتی کا ایک پورا فریق اسی کے وعظ کہنے کو اپنا کام قرار دے لیتا، پارلیمنٹ
میں اس کے متعلق متواتر چھوٹی چھوٹی تحریکیں پیش کرتا رہتا اور اپنے خیالات کو عام بنالینے
کا یہی طریقہ ہے، اور مجھے اس میں شک نہیں ہے کہ آخر میں یہی لوگ غالب آجاتے
انھیں ایک ایسا سبق پڑھانا تھا جو خوشگوار بھی ہے اور سچا بھی ہے اور اس قسم کے
سبق بہت جلد یاد ہو جاتے ہیں۔ پس بحیثیت مجموعی اس مقابلہ کا نتیجہ یہ ہے کہ اخراجات
کے بعد آمدنی میں سے بہت بڑی رقم کا بچا رکھنا پارلیمنٹی حکومت کے بہ نسبت صدارتی
حکومت میں بہت زیادہ آسان ہے لیکن اس کے ساتھ ہی صدارتی حکومت میں
پارلیمنٹی حکومت کی طرح اس امر کی جانچ کرنے کی سہولت نہیں ہے کہ بچت کا قائم
رکھنا اچھا ہے یا نہیں اور اسلئے وہ آنکھ بند کر کے کام کرتی ہے، پس انداز سے
جسوقت انتہا کے نقصان ہوتا ہے اسوقت بھی وہ اسی طرح پس انداز کرتی جاتی ہے
جسطرح اسوقت پس انداز کرتی جب یہ پس انداز بہت سودمند ہوتی۔ اس خاص بچت
میں پارلیمنٹی حکومت کے ساتھ صدارتی حکومت کا مقابلہ دونوں پہلو لئے ہوئے
ہے۔ پارلیمنٹی حکومت کے نقائص میں غالباً ایک نقص یہ بھی ہے کہ قرض کی ادائی
کے لئے آمدنی میں سے بچا کر رکھنا مشکل ہوتا ہے اور صدارتی حکومت اس نقص سے
بچ نکلتی ہے، اگرچہ اس سے یہ نقصان ضرور ہوتا ہے کہ وہ پس انداز کرنے میں محل و موقع
کو نہیں دیکھتی اور ہر وقت پس انداز کرتی رہتی ہے مگر اور تمام اعتبارات سے پارلیمنٹی
حکومت کو مالی معاملات میں صدارتی حکومت پر بے رد و کد یہ فوقیت حاصل ہے
کہ پارلیمنٹی حکومت میں ہمیشہ بحث و مباحثہ ہوتا رہتا ہے، اگرچہ صرف ایک صورت
میں اس سے اچھائی اور برائی دونوں کے سرزد ہونیکا احتمال رہتا ہے مگر اکثر و بیشتر

صورتوں میں اس سے صرف اچھائی ہی کی توقع ہوتی ہے اور ان میں سے تین صورتیں امریکہ کے حال کے تجربہ سے واضح و روشن ہو گئی ہیں۔

پہلی غلطی تو وہی ہے جس کا ذکر مسٹر گولڈون اسمتھ نے چند برس پیشتر کیا تھا اور صاحب موصوف (امریکہ کے معاملہ میں بے لوث منصف نہیں ہو سکتے) انھوں نے یہ کہا تھا کہ "ممالک متحدہ امریکہ کی سب سے بڑی غلطی وہ ہے جسے "قانونِ جواز سکۂ کاغذی" کہتے ہیں، اس قانون کے ذریعہ سے حکومت نے خزانہ کے جاری کردہ ناقابلِ تبدیل کاغذی نوٹوں ہی کو ملک کے لئے سکۂ رواں بنا دیا، ایسا کرنے کی ترغیب و تحریص بہت قوی تھی کیونکہ اس سے وقت ضرورت جنگ کے لئے بہت بڑا سرمایہ جمع ہو گیا اور کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ اگر حکومت کے نوٹ ملک کے فلزاتی سکۂ رواں کو آٹھ کروڑ ڈالر تک ساقط کر سکتے ہیں تو یہ بمنزلۂ قرض کے ہے کہ حکومت نے اپنے جا اغراض کے لئے ملک کے اندر آٹھ کروڑ ڈالر کا جدید قرض لے لیا ہے۔ جب کبھی قیمتی فلزات کی ضرورت نہیں رہتی (اور اس قسم کی صورت میں خانگی مقاصد کے لئے ان کی حاجت رہتی بھی نہیں) تو پھر حکومت کو جو کچھ درکار ہوتا ہے وہ نوٹوں سے خریدا جا سکتا ہے اور جس حد تک حکومت نوٹ جاری کر دے، اسی حد تک وہ خریداری کر سکتی ہے لیکن کسی پیچیدہ مشکل سے نکلنے کی اور تمام آسان تدبیروں کی طرح یہ تدبیر بھی بہت بڑی خرابیوں کا موجب ہوتی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ان صورتوں میں یہ ایک باقاعدہ تدبیر ہو جاتی اور پیچیدہ مشکل کوئی مشکل ہی نہ رہتی۔ اسکے لئے ایک آسان راستہ سبکو معلوم ہو جاتا۔ یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ جو ناقابلِ تبدیل سکۂ قرطاس، حکومت کی طرف سے جاری کیا جاتا ہے، اسکا بہت بڑی مقداروں میں جاری کیا جانا یقینی ہے، اور یہی امریکہ میں بھی ہوا۔ اس کے ساتھ ہی روپیہ کا نرخ گھٹ جانا بھی یقینی ہے، قیمتوں میں ابتری اور بازاروں میں برہمی کا پیش آنا بھی یقینی ہے، قرض دینے والوں کا دھوکا کھانا بھی یقینی ہے، قرض لینے والے کو جتنا ملنا چاہیئے، اس سے زیادہ کا ملجانا بھی یقینی ہے۔ لیکن امریکہ کے معاملہ میں ان سب کے علاوہ ایک اور بھی خرابی واقع ہو گئی۔ نیا ملک ہونے کی وجہ سے اسے چاہیئے تھا کہ اپنی مالی ضرورت کے وقت پرانے ملکوں سے قرض

لیتا، مگر یہ اُن ممالک اس خوف میں مبتلا تھے کہ مبادا غیر قابل تبدیل سکّہ کاغذی
نامحدود حد تک جاری ہو جائے اور اس لئے وہ ایک شلنگ تک دینے پر بھی
آمادہ نہ ہوئے، اس سے امریکہ کی تجارتی ساکھ کے علاوہ اور باتوں کا بھی نقصان
ہو گیا۔ انگلستان کی بڑی بڑی تجارتی کوٹھیاں دوسرے ممالک کی خبروں کو پبلک
میں لانے اور شائع کرنے کے لئے نہایت ہی طبعی اور نہایت ہی موثر ذرائع ہیں۔
اگر مالی حیثیت سے انھیں اس امر سے دلچسپی ہوتی کہ وہ حالات جنگ کی قابل اعتماد
خبریں شائع کریں تو اہل یورپ کو قابل اعتماد اطلاعیں ملتی رہتیں۔ مگر چونکہ شمالی ریاستوں
نے لمبارڈ اسٹریٹ میں کسی قسم کا قرضہ نہیں لیا (اور اپنے مضرت رساں کاغذی
سکہ کی وجہ سے وہ قرضہ لے بھی نہیں سکتی تھیں)، اس لئے لمبارڈ اسٹریٹ کو
ان ریاستوں کی کچھ پروا نہ تھی اور اسی وجہ سے اس خانہ جنگی کے متعلق جو اسوقت
بالکل نئی اور بہت ہی پیچیدہ تھی، معمولی مواد کے بغیر رائے قائم کرنا پڑی، اور
(چونکہ سیاسی معاملات پر "بلدہ" (یعنی لندن کے اس حصے کی رہبری جو سیاست انگلستان
کا گویا مرکز ہے) بہت ہی خاموشانہ و غیر محسوس طور پر جاری رہتی ہے اسلئے) انگلستان کو یہ بھی
نہ معلوم ہوا کہ اس قسم کا مواد موجود بھی ہے یا نہیں*

بیشک اس قسم کی غلطی پارلیمنٹری حکومت کے تحت میں بھی سرزد ہو سکتی تھی
اور شاید ہو جاتی، لیکن صدور غلطی کی صورت میں اس کے نتائج کی کامل تحقیقات
ہوتی اور اسے حرف غلط کی طرح مٹا دیا جاتا۔ دنیا بھر میں جو سب سے بڑی تحقیقات
و مباحثات کی قوت ہے اس کا رخ اس معاملہ کی طرف پھیر دیا جاتا۔ پس دو برس کے
اندر امریکہ کے عامۃ الناس نے ہر طرح سے ارکان مجلس پر زور ڈالا ہوتا تاآنکہ وہ
اس مسئلہ پر حاوی ہو جاتے، لیکن حکومت کی صدارتی تشکیل کے تحت میں ہونے
اور بحث کے اٹھانے کی کمزور طاقت کی وجہ سے اہل امریکہ کو جو واقفیت حاصل
ہوئی وہ انتہا درجہ کی ناکمل تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ دس برس کے تکلیف دہ تجربہ کے بعد
وہ اب بھی یہ نہیں سمجھتے کہ اس ناقابل تبدیل سکۂ کاغذی کی وجہ سے انھیں کسقدر
نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ لیکن خانہ جنگی کے دوران میں امریکہ کی صدارتی حکومت
نے جسطرح محصول کے وصول کرنے کا انتظام کیا وہ اس کے نقائص کی اور بھی

زیادہ نمایاں مثال ہے مسٹر ویلز اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔
"ابتدا میں ہر طرح کے بلا واسطہ و اندرونی محصول سے اجتناب کیا گیا، بظاہر کانگریس (موتمر) کو یہ اندیشہ دامنگیر تھا کہ چونکہ لوگ اس قسم کے محصول کے عادی نہیں ہیں اور محصول کے تشخیص کرنے اور جمع کرنے کی تمام کل بگڑی ہوئی ہے اس سے اس کے اختیار کرنے سے بددلی پیدا ہوگی اور جنگ وجدل کی پرزور کارروائی میں خلل پڑ جائیگا۔ پس موتمر نے پہلے اپنے کو ایسی ہی کارروائیوں تک محدود رکھا جن سے درآمد مال پر بالواسطہ محصول بڑھا کر اضافہ آمدنی کی توقع ہو سکے اور جنگ کے واقعی جاری ہو جانے کے چار ماہ بعد یہ ہو سکا کہ دو کروڑ سالانہ کا بلا واسطہ محصول تمام ریاستوں پر حصہ رسدی عاید کیا گیا اور آٹھ سو ڈالر سے اوپر کی آمدنی پر تین فیصدی محصول آمدنی لگایا گیا۔ اسمیں علاً پہلے محصول کا اجرا وضع قانون کے آٹھ ماہ بعد اور دوسرے کا دس ماہ بعد قرار پایا۔ یہ ضرور ہے کہ اس قسم کے قوانین جاری ہوئے اور صرف وفادار ریاستوں میں ان کا عملدرآمد فی الفور ہو گیا اور ان سے کچھ قلیل مقدار آمدنی کی حاصل ہوئی اور اگرچہ بہت جلد محصول کے مد و دبڑھا دئے گئے تاہم جنگ کے دوسرے سال میں حکومت کے تمام وسائل یعنی محصول تیاری مال اندرون ملک، محصول آمدنی محصول اسٹامپ اور تمام دیگر اندرونی محاصل سے جملہ آمدنی چار کروڑ بیس لاکھ ڈالر سے کم ہوئی اور وہ بھی ایسے وقت میں جبکہ خرچ چھ کروڑ ماہانہ یا ستر کروڑ سالانہ کے اوسط سے بڑھا ہوا تھا اس امر کے ظاہر کرنے کے لئے کہ بلا واسطہ و اندرونی محصول کا تمام معاملہ قوم کیلئے کس قدر نئی بات تھی اور سرکاری حکام کو اس کا تجربہ کس قدر ناکافی تھا ذیل کا واقعہ کافی ہے۔ معتمد خزانہ نے اپنی ۱۸۶۳ء کی رپورٹ میں یہ بیان کیا ہے کہ اپنے وسائل کے متعین کرنے کی غرض سے اس نے ایک نہایت ہی ماہر شخص کو اس کام پر متعین کیا اور اس کی مدد کے لئے عملی تجربہ رکھنے والے آدمی مقرر کئے تاکہ وہ اندازہ کریں کہ آئندہ سال میں اندرونی محصول کے ہر ایک صیغہ سے غالباً کیا آمدنی ہوگی۔ اندازہ ساڑھے آٹھ کروڑ ڈالر کا کیا گیا مگر واقعی آمدنی صرف تین کروڑ ستر لاکھ ڈالر کی ہوئی تو اسمیں شک نہیں کہ پارلیمنٹی حکومت میں بھی ایسا ہو سکتا تھا، لیکن اس صورت میں پارلیمنٹ کے بہت سے ارکان اور پارلیمنٹ کا تمام فریق مخالف

اس عقدے کے واکرنے پر آمادہ ہوجاتا، مالیات کے تمام اصول زیر بحث آجاتے اور سب کی تشریح کیجاتی، روشنی اوپر سے آتی نیچے سے نہیں اٹھتی یعنی قوم میں روشنی پیدا ہوکر پارلیمنٹ تک پہنچنے کے بجائے پارلیمنٹ سے شعاع نور قوم کی طرف آتی۔ مگر امریکہ میں اس کے بالکل برعکس واقع ہوا، مسٹر ویلز اسی سلسلہ میں کہتے ہیں:۔

"لیکن اجرائے محصول کے اس معاملہ کے متعلق وفادار ریاستوں کے باشندے وہاں کے حکمرانوں سے زیادہ مستقل العزم و صادق العمل تھے اور زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ معاملات کی موجودہ حالت کے متعلق عام بیدلی علانیہ ظاہر ہونے لگی۔ ہر جگہ یہ رائے ظاہر کیجارہی تھی کہ فوراً ہی ہر ایک ممکن شکل اور انتہا سے حد تک محصول کا اجرا موثر و پرزور طور پر ہونا چاہیئے۔ اس سے موتمر کا جوش بڑھ گیا اور اسنے صحیح طور پر عوام کے احساس پر یہ اعتبار کیا کہ وہ اس کے کاموں میں اس کی تائید کرینگے اور آخر اس نے عزم و استقلال کے ساتھ اس کام کو ہاتھ میں لیا اور اندرونی بلاواسطہ محصول کا ایک طریقہ سوچا اور اسے جاری کیا۔ اس محصول کی ہمہ گیری اور اس کے خصوصیات اس درجہ وسیع ہیں کہ ملکی تاریخ میں اسوقت تک اس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور نہ اس کے بعد ایسے تجربہ کی توقع ہے۔ اسوقت کی ایک ضرورت تھی آمدنی، اور محصول کے ذریعہ سے اسے آسانی کے ساتھ وسیع مقدار میں حاصل کرنے کا بس ایک ہی اصول تھا اگر اسے اصول کہنا جائز ہو۔ یہ اصول اس صلاح کے مشابہ تھا جو ایک پرانے آئرش کو ڈونی بروک کے میلے میں جانے کے وقت دیگئی تھی کہ "جہاں کہیں کوئی سر نظر آئے اس پر ایک چانٹا لگادو"، یہی اصول یہاں بھی تھا کہ جہاں کہیں کوئی شے، کوئی پیداوار، کوئی تجارت کوئی پیشہ کوئی ذریعہ آمدنی نظر آئے، اس پر ایک محصول لگادو، اسی اصول کی متابعت میں ایک فرمان صادر ہوا اور قوم نے خوشی کے ساتھ اس کے سامنے سر جھکادیا۔ پانچ ہزار ڈالر سے کم کی آمدنی پر پانچ فیصدی محصول لگایا گیا اسمیں سے چھ سو ڈالر کی رقم اور مکان کا واقعی کرایہ مستثنیٰ رہا، مستثنیات اس بنا پر ہوئے تھے کہ اسوقت یہ رقم اس ضرورت کے لئے کافی سمجھی گئی کہ اس سے ایک چھوٹا سا خاندان اپنا کفاف مہیا کرلیگا، اور اس قانون کے حیطۂ عمل سے وہ لوگ خارج رہینگے جو اپنے روزانہ کے کام سے روزانہ کے ضروریات پورے کر

کرتے ہیں۔ پانچ ہزار سے زائد مگر دس ہزار سے کم آمدنی پر ڈھائی فیصدی کا مزید محصول لگایا گیا اور دس ہزار سے اوپر کی آمدنی پر بغیر کسی حذف واسقاط کے پانچ فیصدی کا مزید محصول عاید کیا گیا تھا۔

یہ جو کچھ ہوا یہ اس سے مغایر اور اس سے بدتر ہے جو کسی پارلیمنٹی حکومت کے تحت میں واقع ہوتا۔ پارلیمنٹی حکومت کے تحت میں محصول میں تاخیر نہیں واقع ہوتی، اس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ اجرائے محصول کے لئے ملک کی طرف سے تحریک کا آغاز ہو، اور اس لئے حد سے بڑھا ہوا جو محصول لگایا گیا وہ اس حکومت کے تحت میں جائز ہی نہ ہوتا۔ میرے خیال میں آخری بحث پر زیادہ طولانی بحث کی حاجت نہیں کہ یہ بالکل یقینی ہے کہ کسی نامناسب محصول کی برائیاں وقت اور بے وقت برابر پارلیمنٹ کے کانوں تک پہنچتی رہینگی۔ جن چند اشخاص کو یہ محصول دینا پڑیگا انھیں یہ کامل یقین ہوگا کہ ان کی بات ضرور سنی جائیگی۔ امریکہ میں جس قسم کے محصول کا تجربہ کیا گیا ہے کہ ہر شئے پر محصول لگایا جائے اور ہر شئے کو دیکھا جائے کہ اس سے کیا آمدنی ہوتی ہے، یہ روش کسی ایسی حکومت کے تحت میں نہیں اختیار کیجا سکتی تھی جس میں رائے عامہ کا نازک و تیز احساس موجود ہو۔

ان مباحث پر اس قدر طول گفتگو کرنے کے لئے میں کسی قسم کی معذرت نہیں پیش کرنا چاہتا کیونکہ یہ بحث ہی بجائے خود نہایت اعلیٰ وارفع ہے۔ اول درجہ کی قوموں کا یہی کام ہے کہ وہ اپنے لئے صدارتی اور پارلیمنٹی حکومتوں میں سے ایک کو اختیار کریں کوئی سلطنت جس کی حکومت میں بحث و مباحثہ کو دخل نہ ہو وہ اول درجہ کی حکومت نہیں ہو سکتی اور حکومت کے موجودہ اقسام میں وہی مذکورہ بالا دو قسمیں ایسی ہیں جن میں بحث و مباحثہ کو دخل ہے۔ پس جو قوم اپنی حکومت کا انتخاب کرنا چاہتی ہے اسے انھیں دو میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑیگا، اور اسلئے کوئی امر اس سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتا کہ تجربہ کی شہادت اور واقعات کی بنا پر ان دونوں حکومتوں کا مقابلہ کرکے یہ فیصلہ کیا جائے کہ ان میں سے کونسی حکومت بہتر ہے۔

مسٹر مل کا قول کہ "تمام مہماتِ مسائل پر بہت کچھ کہنا باقی رہ جاتا ہے" انگریزی دستور سلطنت پر جس قدر صادق آتا ہے کسی اور مسئلہ پر اس قدر صادق نہیں آتا۔ دستور سلطنت کے تحریرات کا جو ذخیرہ جمع ہوگیا ہے وہ بہت ہی بڑا ذخیرہ ہے مگر جو مبصر زندہ حقیقت کو زیر نگاہ رکھے گا وہ نقش کاغذی کے ساتھ اُس کے تباین کو نظر حیرت سے دیکھے گا کیونکہ زندہ مجسمہ میں ایسے بہت سے امور نظر آئینگے جو کتابوں میں نہیں پائے جاتے، اور اسیطرح ادب کی بہت سی باریکیوں اور نزاکتوں کا عمل کے دشت پر خار میں پتہ نہ چلیگا۔

برطانی دستور سلطنت کے سایہ میں اس قسم کے ان میل خیالات کا نشو و نما پا جانا محض فطرت کے مطابق ہی نہیں بلکہ لابد تھا۔ زبان، قوموں کی مخزن روایات ہے، ہر نسل جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے اسے بیان کرتی ہے مگر الفاظ وہی استعمال کرتی ہے جو عہد سابق سے چلے آتے ہیں جب برطانی دستور سلطنت کے مانند کوئی عظیم الشان جسم واحد کئی نسلوں تک ظاہری یکسانی کے ساتھ قائم و برقرار رہے مگر اُس کے باطن میں تغیرات ہوتے رہیں تو ہر ایک نسل کو بہت سے

غیر موزوں الفاظ ورثہ میں ملجاتے ہیں۔ بہت سے ایسے مقولے زبان زد رہتے ہیں جو کسی وقت میں صحیح تھے مگر اب اُن کی صحت زائل ہوگئی ہے یا زائل ہوتی جاتی ہے۔ جس طرح کوئی شخص اپنی نوعمری میں کسی شئے کے مشاہدے سے ایک صحیح خیال قائم کرتا اور اسے غلط جملوں میں ظاہر کرتا ہے اور اسکے اہل خاندان اُس کے سن رشد پر پہنچنے پر بھی وہی غلط جملے زبان سے دہراتے رہتے ہیں، اسی طرح ایک تاریخی دستور سلطنت کے عین شباب کے زمانہ میں لوگ وہی فقرے بولتے رہتے ہیں جو اُن کے آبا و اجداد کے زمانہ میں صحیح تھے اور اُن آبا و اجداد نے انکو انھیں فقروں کی تعلیم دی ہے مگر اب وہ صحیح نہیں رہے ہیں بلکہ اگر مجھے اجازت ملے تو میں یہ کہونگا کہ ایک قدیمی و دائمی تغیر پذیر دستور سلطنت کی مثال ایک ایسے بڈھے شخص کی ہے جو بڑھاپے میں اسی وضع قطع کے کپڑوں کو ذوق شوق سے پہنتا ہے جو عنفوان شباب میں زیب دیتے تھے، آپ اُس میں ظاہراً جو کچھ دیکھتے ہیں وہ وہی ہے جو تھا، اور جو آپ نہیں دیکھتے ہیں وہ بالکل مبدل ہو چکا ہے۔

انگریزی دستور سلطنت کے دو تصریحات و توضیحات ایسے ہیں جنھوں نے بے انتہا اثر ڈالا ہے مگر وہ دونوں کی دونوں غلط راستہ پر لے جانیوالے ہیں۔ اول یہ کہ انگریزی نظم سلطنت کے اصول کے طور پر یہ قرار دیا جاتا ہے کہ اس میں تشریعی، عاملی و عدالتی اختیارات بالکل منقسم ہیں اُن میں سے ہر ایک اختیار کسی علٰحدہ شخص یا جماعت اشخاص کو تفویض ہے، اور وہ ایک دوسرے کے کام میں مطلقاً دخل نہیں دیسکتے۔ اس امر کے واضح کرنے میں بڑی لسّانی ولفّاظی صرف کی گئی ہے کہ انگریزی قوم نے اپنے معمولی شعور طبعی سے ازمنۂ وسطےٰ کے سے زمانہ میں جبکہ وہ خصوصیت کے ساتھ درشت خو اور تہذیب کی نزاکتوں سے معرا تھی سیاسی فرائض کی اس نازک تقسیم میں جان ڈالی اور اسے عمل میں لائی جس کا نقش و نگار فلسفیوں نے کاغذ پر بنایا تھا مگر کاغذ سے علٰحدہ (عملی صورت میں) اسے دیکھنے کی انھیں بہت کم امید تھی۔

دوسرے اس امر پر زور دیا جاتا ہے کہ برطانی دستور سلطنت کی خاص فضیلت یہ ہے کہ اُس کے تینوں اقتدارات میں ایک جچا تلا اتحاد قائم ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ حکمرانی کے اعلیٰ اقتدار میں شاہی، اعیانی، اور عمومی تینوں عنصروں کی شرکت ہے اور اس اقتدار حکمرانی کے عمل میں لانے کے لئے ان تینوں کی منظوری کی ضرورت ہے۔ اس نظرئے کی رو سے بادشاہ، امرا اور عوام کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ نہ صرف قالب ظاہری

کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ داخلی جوہر محرک بھی وہی ہیں یعنی یہی تینوں دستور سلطنت کی قوت فاعلہ ہیں۔ ایک بلند پایہ نظریہ جسے "نظریہ تحدید و توازن" کہتے ہیں، وہ سیاسی تحریرات کے ایک نہایت ہی وسیع حصہ پر حاوی ہوگیا ہے اور اُس کا بیشتر حصّہ انگلستان کے تجربہ سے جمع کیا گیا ہے یا اُن تجربات سے اُس کی تائید ہوتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ایک خاص نوع کی خامیاں اور خرابیاں شاہی میں پائی جاتی ہیں ایک دوسری نوع کی کچھ خرابیاں اعیانیت میں ہیں اور علیٰ ہذا کچھ عمومیت میں، مگر انگلستان نے یہ دکھادیا ہے کہ ایک ایسی حکومت بنائی جاسکتی ہے جس میں یہی مضر میلانات ایک دوسرے کے سدّراہ ہوکر توازن پیدا کردیتے اور اُن کی مضرت کو رفع کردیتے ہیں، یہ حکومت ایسی ہے جس میں ایک مجموعہ ایسا تیار کیا گیا ہے جو نہ صرف اپنے اجزائے ترکیبی کے نقائص باہمی کے باوجود عمل میں آگیا ہے بلکہ اُس کی ترتیب ہی خود اُنھیں نقائص سے ہوی ہے لہذا یہ یقین کیا جاتا ہے کہ انگریزی دستور سلطنت کے اہم خصوصیات ان ممالک میں ناقابل اجرا ہیں جہاں شاہی اور اعیانیت کے سامان مہیا نہ ہوں، اس دستور سلطنت کے لنسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ یورپ جدید کی اکثر و بیشتر سلطنتوں نے از منۂ وسطےٰ سے جو کچھ سیاسی عناصر ورثہ میں پائے ہیں اُن کا جو بہترین مصرف ذہن میں آسکتا ہے وہ یہی دستور سلطنت ہے۔ یہ بھی یقین کیا جاتا ہے کہ اس سامان سے انگریزی دستور سے بہتر و افضل کسی دستور کا بننا ممکن ہی نہیں ہے مگر اُس کے ساتھ ہی یہ بھی یقین کیا جاتا ہے کہ انگریزی دستور کے اجزائے اصلیہ اس مواد و سامان کے سوا اور کسی طرح نہیں بن سکتے۔ لیکن یہ اجزا و عناصر ایک ہی دور اور ایک ہی اقلیم کے واردات و حادثات ہیں، انسانی تاریخ میں اُن کا تعلق ایک یا دو صدیوں اور چند ملکوں سے ہے ممالک متحدہ امریکہ کی مجلس حل و عقد اگر یہ فیصلہ کردیتی اور اُس کی تمام ریاستیں اُس کی توثیق کردیتیں تو بھی یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہاں شاہی سلطنت ہوجاتی۔ ایک حقیقی شاہی کے لئے جس پر اسرار عظمت اور جس مذہبی عقیدت کی ضرورت ہے، وہ قلبی احساس ہیں جنھیں کوئی جماعت واضع قوانین کسی قوم میں پیدا نہیں کرسکتی۔ حکومت کے متعلق یہ نیم خاندانی احساس بالکل اسی طرح ورثہ میں ملا ہے جس طرح عام زندگی میں حقیقی خاندانی بسرانہ احساس ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔ اگر آپ کسی غیر شخص کو اپنا باپ بنا سکتے ہیں تو بادشاہت ہی از سر نو قایم کرسکتے ہیں۔ بادشاہت کو جس خاص احساس سے

تعلق ہے اُس کا ارادۃً پیدا کرنا ایسا ہی دشوار ہے جیسے باپ کے لئے مختص محبت
والفت کا پیدا کرنا دشوار ہے۔ اگر انگریزی دستورِ سلطنت کا علمی جز و صرف ازمنۂ وسطےٰ
کے مواد کے اجتماع ہی سے بن سکتا تو اُس کی دلچسپی نیم تاریخی ہوتی اور اسکی نقل کرنے کی
صلاحیت بہت ہی محدود ہوجاتی۔ انگریزی یا دوسرے تنظیمات جو صدیوں کی پیداوار
ہونے کے باعث مخلوط آبادیوں پر وسیع اقتدار رکھتے ہیں، اُن کے سمجھنے کی کوئی شخص اسوقت
تک ہمت نہیں کرسکتا جبتک کہ وہ انھیں دو صنفوں میں تقسیم نہ کرلے۔ اس قسم کے
دستوروں میں دو حصے ہیں (یہ ضرور ہے کہ خوردبین لگا کر ان کی تقسیم نہیں ہوسکتی کیونکہ
جلیل القدر معاملات کی جنسیت تقسیم کی نزاکتوں کی متحمل نہیں ہوتی) اُن میں سے
پہلے حصہ میں وہ امور داخل ہیں جو آبادی میں عزت و حرمت کے احساسات کو برانگیختہ کرتے
اور انھیں قائم رکھتے ہیں، اگر روا ہو تو میں اسے اجزائے معظمہ کہونگا، دوسرا حصہ اُن
اجزائے کارکن پر مشتمل ہے جنکے ذریعہ سے فی الواقع کام انجام پاتے اور حکمرانی ہوتی ہے
یہ دو اہم داخل مقاصد ایسے ہیں کہ بغرض کامیابی اُن کا حصول ہر ایک دستور سلطنت
کے لئے لازمی ہے اور ہر ایک قدیم اور مقبول و مطبوع دستور سلطنت نے اُن مقاصد کو ضرور
حیرت خیز طور پر حاصل کیا ہوگا۔ غرض یہ ہے کہ ہر ایک سیاسی دستور سلطنت کے لئے
ضروری ہے کہ وہ پہلے "اقتدار" حاصل کرے" اور پھر اُس اقتدار کو "کام میں لاوے"۔
اُسے پہلے بنی نوع انسان کی وفاداری و اعتماد حاصل کرنا چاہئے اور اُس کے بعد
اس وفاشعاری سے حکومت کا کام نکالنا چاہئے۔

بیشک بہت سے معمولی اشخاص ایسے ہیں جو حکومت کے "اجزائے معظمہ" کے
منکر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ صرف نتیجہ سے غرض اور کام چلانے کی ضرورت ہے (ان کے
نزدیک) دستور سلطنت سیاسی مقاصد کے لئے سیاسی ذرائع کا ایک مجموعہ ہے، اور اگر آپ
یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کسی دستور سلطنت کا کوئی حصہ جو کچھ کام نہیں کرتا یا ایسا کام کرتا ہے جسے
نسبتاً زیادہ سہل الحصول طریق پر انجام دیا جاسکتا ہے تو گویا آپ یہ تسلیم کرتے ہیں
کہ وہ حصہ کتنا ہی معزز و مقتدر کیوں نہو مگر حقیقت میں وہ بیکار ہے۔ دوسری طرف
وہ مناظر جو اس بے کیف فلسفہ پر اعتماد نہیں رکھتے انھوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے
بڑی نازک دلیلیں قائم کی ہیں کہ یہ "اجزائے معظمہ اصلی اوزار کے حقیقی پرزے

اور عملی فائدے کے عظیم الشان محور ہیں، اور اس طرح انھوں نے ایسی ملمع کاریاں کی ہیں کہ سادگی پسند طریقہ والوں نے اُن کی قلعی اچھی طرح کھولدی ہے، مگر دونوں طریقہ والے غلطی میں پڑے ہوئے ہیں۔ حکومت کے "اجزائے معظمہ" وہ ہیں جو اُس میں قوت پیدا کرتے اور اُس کی قوت متحرکہ کا باعث ہوتے ہیں۔ "اجزائے کارکن" صرف اُس قوت سے کام لیتے ہیں۔ حکومت کے لئے خوشنما اجزا کی ضرورت ہے کیونکہ انھیں پر حکومت کی حقیقی قوت کا انحصار ہے۔ وہ کوئی خاص کام ایسا نہیں کرسکتے جو ایک سادہ تر دستور سلطنت اُس سے بہتر طور پر انجام نہ دے سکتا ہو مگر وہ مبادی ہیں اور تمام کاموں کے شرائط مقدم وہی ہیں وہ معرکہ سر نہیں کرتے مگر فوج وہی مہیا کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اگر کسی ایک ہی حکومت کی تمام رعایا صرف اسی شئے کا خیال کرے جو اُنکے لئے مفید ہو، اور سب کے سب ایک ہی شئے کو مفید سمجھیں اور یہ بھی سمجھیں کہ وہ شئے ایک ہی طریقہ سے حاصل ہوسکتی ہے تو پھر دستور سلطنت کے محض کارکن اجزا کافی ہونگے اور موثر اضافہ کی ضرورت نہ رہیگی، مگر جس دنیا میں ہم رہتے ہیں اُس کی تنظیم و ترتیب اس سے بہت ہی بتائن ہے۔

سب سے عجیب و غریب حقیقت جو فطرت میں سب سے زیادہ مستقین ہے، وہ نسلِ انسانی کا غیر مساوی نشوونما ہے، اگر ہم پیچھے مڑ کر بنی نوع انسان کے ابتدائی زمانوں پر نظر ڈالیں اور بعید ترین زمانہ کا جیسا دھندلا تصور ہم قائم کرتے ہیں، ویسا ہی تخیل قائم کریں کہ خلیجوں کے آس پاس کے مواضع میں یا ہیبتناک سواحل پر کچھ پریشان حال قبائل آباد ہیں، اُن کے لئے معمولی سے معمولی مادی ضروریات کا مہیا کرنا بھی دشوار ہے، وہ اپنے پتھر کے اوزار سے آہستہ آہستہ بڑی محنت سے درخت کاٹ رہے ہیں، عظیم الجثہ خونخوار جانوروں کے مقابلہ کی اُن میں تاب و طاقت نہیں ہے، ان میں نہ کسی قسم کی ذہنی قابلیت ہے، نہ انھیں فرصت ہے نہ ان میں کسی قسم کی شاعرانہ بلند پروازی ہے بلکہ کوئی تخیل تک نہیں ہے، اخلاق سے وہ معرا ہیں، مذہب بس اتنا ہی ہے کہ انھوں نے ایک طرح کے سحر کو مذہب سمجھ رکھا ہے، اور پھر ہم اپنی اِس خیالی زندگی کا مقابلہ آجکل کے یورپ کی حقیقی زندگی سے

کریں، تو اس وسیع تباین سے ہم ششدر رہو جائینگے، ہمارے لئے یہ خیال کرنا ہی دشوار ہو جائے گا کہ ہم اسی نسل سے ہیں جو اس بعید ترین زمانہ میں تھی۔ سیاسی فلسفہ میں ایک خیال یہ پھیلا ہوا تھا کہ ایک قلیل مدت شاید دس پندرہ برس میں تمام بنی آدم بغیر کسی غیر معمولی تدبیر و عمل کے ایک سطح پر لائے جا سکتے ہیں، اس خیال کا دعوے زبان سے اس وسیع حد تک نہیں کیا جاتا جس عمیق حد تک دلوں کے اندر اس کا اثر جاگزیں تھا، یہ خیال سیاسی فلسفہ میں اندر ہی اندر پھیلا ہوا تھا گو بظاہر اُس کا اتنا اظہار نہیں ہوتا تھا، لیکن اب کہ نوع انسانی کی صبر آزما تاریخ نے ہمیں یہ بتادیا ہے کہ ہم نے کس نقطہ سے آغاز کیا، کیسی تدریجی محنت اور کیسے مفید مطلب حالات اور کیسی مترقب کامیابیوں کی بنا پر انسان کسی حد تک خود کو مہذب کے نام سے موسوم کرنے کے لائق ہوا یعنی جب ہم تاریخ کی وقت طلبی اور اُس کے نتائج کی آزادپسندی کو کما ینبغی سمجھتے ہیں، تو اسوقت اس طولانی و تدریجی ترقی کے مدارج متعلقہ کے بنسبت ہمارے تخیلات تیز ہو جاتے ہیں۔ انگلستان کی ایسی وسیع قوم میں ایک جم غفیر ایسا موجود ہے جو شاید ہی اس سے زیادہ مہذب ہو جیسے دو ہزار برس قبل اکثر لوگ ہوتے تھے۔ اُن سے بھی زیادہ کثیر تعداد لوگوں کی ہے جو بس ایسے ہیں جیسے ہزار برس پہلے کے بہترین اشخاص ہوتے تھے۔ طبقات اسفل اور طبقات اوسط کی جانچ جب اس معیار سے کی جاتی ہے جو "دس ہزار" تعلیم یافتوں کا معیار ہے تو وہ تنگدل، کودن اور بدشوق ثابت ہوتے ہیں۔ مجرد الفاظ کا انبار لگا دینا بیکار ہے، جنھیں اس میں شک ہو وہ اپنے باورچیخانوں میں جا کر دیکھ لیں کہ کوئی فاضل شخص ذہنی معاملات میں جس امر کو نہایت ہی بدیہی، نہایت ہی یقینی اور نہایت ہی واضح و بیّن سمجھتا ہو اس کا تجربہ اپنی خادمہ یا اپنے خدمتگار پر کر دیکھے اسے فوراً معلوم ہو جائیگا کہ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ ناقابل فہم اور پیچیدہ اور غلط معلوم ہوتا ہے، اور جب وہ ایسے امور کا بیان کرے جو خود اُس کے تخیلات کے حلقہ میں نہایت ہی معمولی اور بڑی احتیاط و ہوشمندی سے ظاہر کی ہوی ہدایت معلوم ہوتی ہو تو اُس کے یہ سامعین اسے دیوانہ یا بے عقل سمجھیں گے۔ بڑی قومیں بڑے پہاڑوں کے مانند ہیں اُن میں انسانی ترقی کی پہلی، دوسری اور تیسری سطحیں موجود ہیں، زیرین طبقات کے خصائص، اعلیٰ طبقات کی موجودہ زندگی کے بہ نسبت، پرانی زندگی سے زیادہ مشابہ ہیں،

اور جو فلسفہ مختلف حصص کے صریحی اختلافات کو برابر پیش نظر نہیں رکھتا اور موقع بے موقع ہمیشہ اس پر زور نہیں دیتا رہتا وہ ایک ایسا نظریہ بن جائے گا جو از ابتدا تا انتہا باطل ہوگا کیونکہ اس نے ایک واضح حقیقت کو ترک کر دیا ہے، وہ ایسا نظریہ ہوگا جو اصلاً گمراہ کر دیگا کیونکہ وہ لوگوں کو اُن چیزوں کا متوقع بنائے گا جن کا کہیں وجود نہیں ہے، اور جو پیش آنیوالا ہے اُس کے وہ پہلے سے متوقع نہ ہونگے۔

ان صریحی حقائق کو ہر شخص جانتا ہے مگر یہ نہیں ہے کہ ہر شخص نے ان کی سیاسی اہمیت کا سراغ بھی لگایا ہو۔ جب کسی سلطنت کی تکوین و تنظیم ہوتی ہے تو یہ صحیح نہیں ہے کہ ادنیٰ جماعتیں کارآمد جماعتوں میں بالکلیہ جذب کر دیجاتی ہیں بلکہ اُس کے برعکس وہ کسی ایسی کمزور بات کو پسند ہی نہیں کرتیں، کسی مقرر نے انسان کی سادہ ترین مادی ضرورتوں پر توجہ دلا کر کبھی کوئی اثر نہیں پیدا کیا ہے جبتک کہ وہ یہ بھی دعویٰ نہ کرے کہ یہ ضیق و تنگی کسی اور کے ظلم و جور سے پیدا ہوی ہے لیکن ہزاروں مقرروں نے، شان و شوکت، شہنشاہی اور قومیت کے مبہم سے خوابوں کا سماں دکھا کر بڑے سے بڑا اثر پیدا کر لیا ہے نسبتاً زیادہ اکھڑ قسم کے لوگ یعنی اکھڑپن کے کسی ایک خاص دور کے لوگ اپنی تمام متوقعہ اور تمام موجودہ چیزوں کو اس شے کے لئے جسے "تخیل" کہتے ہیں از خود نثار کر دینگے، اس "تخیل" سے مراد کوئی ایسی رغبت ہے جو واقعیت کی قاطع معلوم ہوتی ہو، اور جو معمولی زندگی کے بہ نسبت کسی بلند، عمیق تر اور وسیع تر مقصد کے ذریعہ سے انسان کو مدارج اعلیٰ پر پہنچا دینے کے درپے ہو، مگر اس قسم کے لوگ حکومت کے صاف و صریح اغراض میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، وہ اُس کی کچھ قدر نہیں کرتے، وہ مطلق یہ نہیں سوچتے کہ یہ اغراض کیونکر حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس لئے یہ نہایت ہی طبعی امر ہے کہ ہیئت حکومت کے سب سے زیادہ کارآمد اجزا لازماً وہی ہونگے جو اُس کے لئے سب سے زیادہ عظمت و احترام کے محرک ہوتے ہیں۔ حکومت کے جو عناصر سہل ترین طور پر اس عظمت و احترام کے محرک ہونگے وہ اس کے "باشکوہ اجزا" ہونگے یہ وہ اجزا ہونگے جو حواس پر اثر ڈالتے ہیں، جو عظیم ترین انسانی تخیلات کو آنکھوں سے دکھا دینے کے دعویدار ہیں اور جو بعض صورتوں میں انسان کی اصل و ابتدا سے کسی بہت بلند تر شے پر فخر کرتے ہیں۔ وہ شے جو اپنے دعاوی میں پراسرار،

اپنے طریق کار میں محسوس و مرئی آنکھوں کے سامنے درخشاں و تاباں ایک لمحہ کے لئے صاف نظر آنے والی اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جانے والی خفی و جلی، نظر فریب و دلچسپ، باعتبار ظاہر واضح الشان اور باعتبار نتائج مافوق المشاہدہ یہی شئے ہے کہ اس کی شکل جس طرح چاہے بدلے اور ہم جس طرح چاہیں اس کی تعریف و توصیف کریں، مگر یہی شئے ہے جو ہنوز عامۃ الناس کی سمجھ میں آتی ہے۔ پس اس حد تک دستور سلطنت کے "اجزائے منظمہ لازماً سب سے زیادہ کارآمد ہونے کے بجائے ظاہری مفروضات کے اعتبار سے بظن غالب سب سے کم کارآمد ہیں، کیونکہ اغلب یہ ہے کہ انھیں اسفل ترین طبقات کے حسب حال ہونا پڑیگا اور یہ وہ طبقے ہیں جو کارآمد کے متعلق بہت ہی کم پروا کرتے اور ان کی نسبت نہایت ہی بری رائے قائم کرتے ہیں۔

ایک اور دلیل بھی ہے جو انگلستان کے سے کسی قدیم دستور سلطنت کے معاملہ میں کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ نہایت ہی ذہین و فطین اشخاص بھی جن امور کے عادی ہو جاتے ہیں ان سے وہ ویسے ہی متاثر ہوتے ہیں جیسے خود اپنی مرضی سے متاثر ہوتے ہیں۔ انسان میں ارادی قوت فاعلہ بہت کم ہے اور اگر ایک طرح کی خواب نما عادت کی وجہ سے اس قوت کے صرف میں گویا کفایت نہ ہو جاتی تو اس کے نتائج کالعدم ہو جاتے۔ ہمکو روزانہ جو کچھ کرنا پڑتا ہے ان سب کو ہم خود اپنے ہی دماغ سے انجام نہیں دے سکتے۔ (اگر ہم ایسا کریں تو) ہم کوئی کام بھی تکمیل کو نہ پہنچا سکیں گے کیونکہ ہماری تمام قوتیں ادنی ادنی اصلاحوں کی جزوی کوشش میں منتشر ہو جائیں گی۔ ایک ہی معلومہ راستہ سے ایک شخص ایک طرف کو جائے گا اور دوسرا دوسری طرف کو، اس لئے جب کوئی نازک وقت ایسا پیش آئے گا جس میں اجتماع عام کی ضرورت ہوگی تو دو آدمی بھی اسقدر پاس پاس نہ ہونگے کہ وہ ساتھ ملکر کام کر سکیں۔ نوع انسانی کی پرانی سست رفتار عادت ہی وہ شئے ہے جو اکثر و بیشتر آدمیوں کے افعال کی رہبری کرتی ہے۔ اور وہی مستقل ڈھانچہ ہے جس میں ہر ایک نئے مصور کو اپنی بنائی ہوئی تصویر کو جمانا پڑتا ہے، اور انسانی فطرت و طینت کا یہ تمام روایتی حصہ سب سے زیادہ آسانی کے ساتھ اس شئے سے اثر پذیر اور معمول بہ ہوتا ہے جو نسلاً بعد نسلٍ ہوتی چلی آئی ہے۔ اگر دیگر حالات یکساں ہوں تو کل کے ادارات آج کے لئے بہترین ادارات ہیں وہ کام کے لئے سب سے زیادہ تیار، سب سے زیادہ بااثر، سب سے زیادہ اطاعت انگیز،

اور بظن غالب اس عزت و وقعت کو سب سے زیادہ قائم رکھنے والے ہوتے ہیں جو تنہا انھیں کو حاصل ہوتی ہے اور دوسرے ہر ایک ادارے کے لئے اس عزت و وقعت کا حاصل کرنا ابھی باقی ہے۔ نوع انسان کے سب سے زیادہ حاوی الاثر ادارات وہی ہیں جو سب سے زیادہ قدیم ہیں، باایں ہمہ دنیا اسقدر تغیر پذیر ہے اور اسکی ضرورتیں اسقدر روبہ تبدل ہیں کہ اس کے بہترین آلات میں بھی انکی ظاہری قوت کے قائم رہتے ہوئے انکی باطنی طاقت کے زائل ہو جانے کا اتنا امکان موجود ہے کہ ہمیں قدیم ترین ادارات سے یہ توقع نہ کرنا چاہئے کہ وہ اسوقت کی سب سے زیادہ کارکن تنظیم ثابت ہونگے۔ جو چیز قابل تعظیم ہے اُس سے ہمیں یہ توقع رکھنا چاہئے کہ وہ اثر پیدا کریگی کیونکہ اس میں خلقی عظمت موجود ہے مگر اس سے ہمیں یہ توقع نکرنا چاہئے کہ وہ اس اثر کو ایسی ہی خوبی سے استعمال بھی کرے گی جیسی وہ نئی بنی ہوی چیزیں اپنے اثر کو استعمال کر سکتی ہیں جو اس عالم جدید کے لئے (جس میں شعور نظری کے ساتھ جوش و قوت بھی موجود ہے) موزوں اور اُس کے حالات زندگی پر بالکل ٹھیک اترتی ہیں۔

انگریزی دستور سیاسی کے مختص وصف کا مختصر خاکہ یہ ہے کہ اُس کے اجزائے معظمہ بہت پیچیدہ اور کسی قدر پر شوکت ہیں وہ بہت ہی قدیم اور بہت کچھ قابل تعظیم ہیں۔ دوسرے اس کے اجزائے کارکن کم ازکم اسوقت جب کوئی مہتم بالشان یا نازک کام آپڑے) قطعاً سادے اور بہت ہی جدید الوضع ہیں۔ انگریزوں نے ایک دستور سلطنت ایسا بنایا بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ٹھوکر کھاکر اُس پر گر پڑے ہیں، جو باوجود اس کے کہ اُس میں ہر طرح کی اتفاقی خرابیاں موجود ہیں اور جو اپنی غرض وضعی سے خارج از بحث معاملات کے لئے دنیا کے تمام دساتیر میں بلحاظ اپنی ہیئت ترکیبی کے سب سے بدتر واقع ہوا ہے، پھر بھی اس میں دو خاص خوبیاں ہیں۔ ایک تو اُس کا سادہ کارکن جزو ہے جو ضرورت پڑنے اور وقت آجانے پر حکومت کے ہر ایک طریق سے جس کا اسوقت تک تجربہ ہوا ہے، زیادہ سادگی، زیادہ آسانی اور زیادہ خوبی کے ساتھ کام کر سکتا ہے۔ دوسری طرف اُس میں تاریخی، پیچیدہ، مقدس مہتم شاندار اجزا ہیں جو اسے بہت ہی قدیم زمانہ کے ورثہ میں ملے ہیں، یہ اجزا عامتہ الناس پر قابو حاصل کر لیتے، اور ایک غیر محسوس مگر ہمہ گیر

اثر سے رعایا کے خیالات و محسوسات کی رہبری کرتے ہیں۔ اس کا جوہر اصلی زمانۂ جدید کی سادگی کی قوت سے مضبوط ہے۔ اس کا بیرونی حصہ زیادہ پر شوکت زمانہ کی کسی گاتھی عمارت کی شانداری کے مانند متبرک و مقدس ہے۔ اس کا سادہ جوہر اصلیہ ضروری تغیرات کے ساتھ بہت سے بہایت ہی مختلف النوع ممالک کو منتقل کیا جا سکتا ہے مگر اُس کا متبرک بیرونی جزو (اور اکثر اشخاص اسے بس اتنا ہی سمجھتے ہیں) سختی کے ساتھ انھیں اقوام تک محدود ہے جن کی تاریخ انگریزوں کی تاریخ کے مماثل ہے اور جن کے سیاسی سازوسامان بھی انگریزوں ہی کے سے ہیں۔

انگریزی دستور سلطنت کے کارکن جزو کا راز ان الفاظ میں بیان ہو سکتا ہے کہ اس کے عاملانہ و تشریعی اختیارات میں گہرا اتحاد بلکہ تقریباً کامل امتزاج موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ روایتی نظریہ کے رو سے جس طرح تمام کتابوں میں مرقوم ہے، انگریزی دستور اسی میں مضمر ہے کہ اُس کے تشریعی و عاملانہ اقتدارات کلیتہً ایک دوسرے سے جدا ہیں مگر فی الحقیقت اُس کی خوبی اُن کے عجیب و غریب مقارنت باہمی پر ہے یہ اتصالی کڑی کابینہ ہے۔ اس نئے لفظ سے مراد انگلستان کی جماعت وضع قانون کی وہ ذیلی مجلس ہے جو جماعت عاملہ بننے کے لئے منتخب کی گئی ہے، جماعت وضع قانون کی بہت سی ذیلی مجلسیں ہیں مگر یہ مجلس ان سب میں بڑی ہے، وہ اپنی اس مجلس خاص کے لئے ان لوگوں کا انتخاب کرتی ہے جن پر اسے سب سے زیادہ اعتماد ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ انھیں براہ راست منتخب نہیں کرتی مگر ان کے بالواسطہ انتخاب میں اُسے قریب قریب اختیار مطلق حاصل ہے۔ اگرچہ ایک صدی قبل بادشاہ کو (ملک کی) حکمت عملی کے قرار دینے میں کوئی اختیار باقی نہیں رہا تھا مگر وزرا کے انتخاب میں اسے حقیقی دخل حاصل تھا۔ سر رابرٹ والپول اپنے طولانی دور حکمرانی میں نہ صرف پارلیمنٹ کے قابو میں رکھنے پر مجبور تھا بلکہ دربار شاہی کو ہموار رکھنا بھی اُس کے لئے ضروری تھا۔ اُس پر لازم تھا کہ وہ اس امر کی فکر رکھے کہ دربار میں کوئی ایسی سازش نہ ہونے پائے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے۔ اس زمانہ میں انگلستان کے مخصوص طرز عمل کا انتخاب تو قوم کرتی تھی مگر وزرا کا انتخاب بادشاہ کرتا تھا۔ یہ وزرا اسوقت کی طرح محض برائے نام ہی نہیں بلکہ فی الحقیقت ملکہ کے خدام تھے۔ اس جلیل القدر حق شاہی کے

اثرات باقیات اور اہم اثرات اب بھی موجود ہیں۔ یہ ولیم چہارم کے حق امتیازی کی نوازش تھی جس نے لارڈ ملبورن کو وِگ فریق کا سرگروہ بنادیا حالانکہ دعوائے ہمسری رکھنے والے اور متعدد افراد موجود تھے۔ پامرسٹن کے انتقال کے بعد بہت ہی اغلب ہے کہ ملکہ کو تین نہیں تو دو مدبروں میں منصفانہ انتخاب کا موقع ملجائے مگر محض نام کا وزیر اعظم معمولاً مجلس تشریعی کی طرف سے منتخب ہوتا ہے اور اکثر و بیشتر اغراض کے لئے حقیقی وزیر اعظم یعنی دارالعوام کا سرگروہ ہی اس عہدہ پر فائز ہوتا ہے تقریباً ہمیشہ ہی یہ ہوتا ہے کہ اس حاوی ایوان (دارالعوام) کے حاوی فریق کی رائے سے صاف طور پر ایک شخص اس فریق کا سرگروہ منتخب ہوجاتا ہے مگر فی الواقع وہ قوم پر حکمرانی کرنے کے لئے منتخب ہوتا ہے۔ انگلستان میں انگریزوں کا ایک منتخب شدہ حاکم اول بالکل اسی طرح ہوتا ہے جس طرح اہل امریکہ کا ایک منتخب شدہ حاکم اول امریکہ میں ہوتا ہے۔ ملکہ محض دستور سلطنت کے "جزو معظمہ" کی سرتاج ہے اور وزیر اعظم کارکن جزو کا سرخیل ہے۔ جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے "تاج منبع اعزاز" ہے مگر کاروبار کا سرچشمہ خزانہ ہے۔ بااین ہمہ انگریزوں کا حاکم اول، اہل امریکہ کے حاکم اول سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کا انتخاب براہ راست قوم کیطرف سے نہیں ہوتا بلکہ وہ قوم کے نمائندوں کی جانب سے منتخب ہوتا ہے وہ "دہرے انتخاب" کی ایک مثال ہے۔ جماعت تشریعی جو رسماً قانون بنانے کے لئے منتخب ہوتی ہے، اسے حقیقتاً خاص کام یہ انجام دینا پڑتا ہے کہ وہ ایک عاملانہ جماعت مرتب کرے اور اسے قائم رکھے۔

سرخیل وزارت جب اس طرح منتخب ہوجاتا ہے تو وہ اپنے رفقا کا انتخاب کرتا ہے مگر یہ انتخاب وہ ایک جادو بھرے حلقہ کے اندر ہی اندر کرتا ہے۔ پارلیمنٹ میں اکثر و بیشتر لوگوں کی حیثیت ان کے کابینہ میں شامل کئے جانے کی مانع ہوتی ہے مگر چند افراد کی حیثیت ایسی ہوتی ہے کہ ان کا شمول یقینی ہوتا ہے۔ ایک ایسی لازمی فہرست جس میں سے وہ انتخاب کرتا ہے اور ایک ایسی ناممکن فہرست جس میں سے انتخاب ہو ہی نہیں سکتا، ان دونوں فہرستوں کے درمیان میں ترتیب کابینہ کے متعلق وزیر اعظم کی آزادانہ رائے کو بہت زیادہ وسعت نہیں

حاصل ہوتی۔ کابینہ کے وزرا کے انتخاب کے بہ نسبت کابینہ کے عہدوں کی تقسیم پر اس کی رائے کا زیادہ اثر پڑتا ہے۔ پارلیمنٹ اور قوم بہت کچھ طے کر دیتی ہے کہ کن لوگوں کو مقدم جگہیں ملیں گی مگر وہ قطعی صحت کے ساتھ یہ نہیں قرار دیدیتیں کہ کس شخص کو کونسی جگہ ملنا چاہئے۔ فی الحقیقت وزیر اعظم کی اعلیٰ ترین سرپرستی کا بھی وسیع اختیار ہے اگرچہ اس اختیار کا نفاذ تنگ و سخت حدود کے اندر ہوتا ہے اور اگرچہ وہ اس سے بہت ہی کم ہے جتنا نظریات کی صورت میں معلوم ہوتا ہے یا دور سے دیکھنے والوں کو نظر آتا ہے۔

ایک لفظ میں یوں کہنا چاہئے کہ کابینہ ایک مجلس نگران ہے جسے قوم پر حکمرانی کرنے کے لئے جماعت واضع قوانین ایسے لوگوں میں سے منتخب کرتی ہے جن پر اسے اعتماد ہوتا اور جنھیں وہ جانتی ہے۔ وہ خاص طریقہ جس طرح انگریزی وزرا کا انتخاب ہوتا ہے، یہ فسانہ کہ وہ کسی سیاسی مفہوم میں ملکہ کے خادم ہیں، یہ قاعدہ کہ کابینہ کا انتخاب ارکان جماعت واضع قوانین تک محدود رہے، یہ سب ایسے حوادث ہیں جو کابینہ کی تعریف کے لئے غیر ضروری ہیں، یہ سب وہ تاریخی اتفاقات ہیں جو اس کی نوعیت اصلیہ سے جدا کئے جاسکتے ہیں۔ کابینہ کی خصوصیت یہ ہے کہ جماعت واضع قوانین کے ذریعہ سے ایسے لوگوں سے اس کا انتخاب ہونا چاہئے جو مجلس مذکور کے ہمنوا ہوں اور جن پر مجلس کو اعتماد ہو۔ یہ ایک طبعی امر ہے کہ ایسے اشخاص بالتخصیص مجلس ہی کے ارکان ہونگے، مگر ایسا ہونا کلیتہً ضروری نہیں ہے۔ ایک ایسا کابینہ جس میں ایسے لوگ شامل ہوں جو جماعت واضع قوانین کے رکن نہ ہوں وہ بدستور تمام کارآمد فرائض کو انجام دیسکتا ہے؛ درحقیقت امراجو زمانہ جدید کے کابینات کا ایک بڑا جزو ہوتے ہیں، وہ اب محض ایک تابع مجلس کے رکن ہوگئے ہیں۔ دار الامرا اب بھی بہت مفید فرائض انجام دیتا ہے مگر حاکمانہ اثر یعنی قوت فیصلہ اسی ایوان کی طرف منتقل ہوگئی ہے جسے قدیم محاورہ میں اب بھی ایوان زیریں کہا جاتا ہے، یہ اختیار اسی مجلس کے ہاتھ میں آگیا ہے جو اگرچہ ایک پر عظمت ادارے کی حیثیت سے فروتر مگر ایک کارکن ادارہ کے اعتبار سے بالاتر ہے۔ فی الحقیقت اس دور موجودہ میں دار الامرا کا ایک خاص فائدہ

یہ ہے کہ وہ وزرائے کابینہ کے لئے مخزن ومعدن کا کام دیتا ہے۔ جب تک کہ دارالعوام کی ہئیت ترکیبی میں اصلاح وترقی نہ ہو جائے یا جب تک کہ اس قاعدہ میں وسعت نہ دیجائے کہ وزرائے کابینہ کیلئے جماعت واضع قوانین کا رکن ہونا لازمی ہے اسوقت تک دارالامرا کے بغیر اعلیٰ وزرا کا کافی تعداد میں مہیا ہونا قطعاً دشوار ہو جائیگا مگر کابینہ کی ہئیت ترکیبی کی تفصیل اور اس کے انتخاب کے صحیح وقطعی طریقہ کی بحث اسوقت مقصود بالذات نہیں ہے۔ مقدم واہم مسئلہ کابینہ کی تعریف پر غور کرنا ہے۔ جب تک کہ ہم بقدر ضرورت نفس شئے کو نہ جان لیں اسوقت تک ہمیں ناقابل انفکاک زوائد کی سرگردانی میں نہ پڑنا چاہئے۔ کابینہ ایک مجلس جامع ہے گویا وہ ایک علامت اضافت ہے جو سلطنت کے قانون ساز جزو کو اس کے عاملانہ جزو سے مربوط کرتی ہے، وہ ایک رشتہ ہے جو دونوں کو ایک دوسرے سے باندھتا ہے۔ اس کی ابتداء ایک جزو سے ہوتی ہے اور اس کے فرائض کا تعلق دوسرے جزو سے ہے۔

کابینہ کے متعلق سب سے عجیب امر یہ ہے کہ اس کے حالات نہایت ہی کم معلوم ہیں۔ اسکے اجلاس نہ صرف اصولاً بلکہ حقیقتاً بھی خفیہ ہوتے ہیں۔ اسوقت کے عملدرآمد کے بموجب تمام معمولی حالات میں اسکی کارروائیوں کی کوئی سرکاری یادداشت نہیں لکھی جاتی۔ ذاتی طور پر بھی کسی یادداشت کا لکھنا نامناسب وناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ دارالعوام جس وقت متفحص ومتجسس اور شور وشر کی حالت میں ہو اسوقت بھی وہ اجلاس کابینہ کی کسی یادداشت کے پڑھنے کی شاید ہی اجازت دے۔ کوئی وزیر جو سیاسی دستور کے معمولات اساسیہ کی وقعت کرتا ہو، وہ اس قسم کی یادداشت پڑھنے کی جرات نہ کرے گا۔ وہ مجلس جو وضع قوانین کی قوت کو نفاذ قوانین کی قوت سے متحد کرتی ہے اور جو اس اتحاد کی بنا پر اپنے قیام وارتباط تک سلطنت میں سب سے زیادہ زبردست جماعت رہتی ہے، وہ ایک بالکل ہی خفیہ مجلس ہے، اس کی کوئی تحریری مستند توضیح کبھی پیش نہیں کی گئی ہے۔ اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ بسا اوقات کسی شرکت (کمپنی) کے (ناظموں) کی ایک بے ترتیب سی مجلس کے مانند ہوتی ہے جہاں لوگ بولتے

زیادہ اور سنتے کم ہیں لیکن کوئی اس سے بھی پورے طور سے واقف نہیں[۱]
کابینہ اگرچہ مجلس واضع قوانین کی ایک ذیلی مجلس ہے مگر اُسے ایسے اختیارات حاصل ہیں کہ کوئی مجلس کو
یہ ترغیب نہیں دیجا سکتی کہ وہ ایسے اختیارات کسی کمیٹی کو سپرد کردے جب تک کہ تاریخی
اتفاقات ایسے ہی پیش نہ آگئے ہوں اور انکا ایسا ہی خوشگوار تجربہ نہ ہوگیا ہو۔ یہ ایسی کمیٹی ہے۔
جو خود اس مجلس کو برطرف کر سکتی ہے جس نے اُسے مقرر کیا ہے، اس کمیٹی کو کسی مسودۂ قانون کے
معلّق کردینے میں حق امتناع حاصل ہے، یعنی اُسے مرافعہ کا استحقاق ہے۔ اگرچہ اُس کا تقرر ایک
پارلیمنٹ کیجانب سے ہوتا ہے لیکن وہ چاہے تو اپنا مرافعہ دوسری پارلیمنٹ میں پیش کر سکتی ہے۔
اصولاً یہ ضرور ہے کہ پارلیمنٹ کو برطرف کرنے کا اختیار صرف بادشاہ کو حاصل ہے اور
اس میں بھی بہت شکوک وشبہات ہیں کہ آیا تمامی حالات میں بادشاہ پر یہ لازم ہے یا نہیں
کہ کابینہ کے حسب دلخواہ وہ پارلیمنٹ کو منتشر کردے مگر اس قسم کے چھوٹے چھوٹے اور ظنی
مستثنیات سے قطع نظر کرکے (یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس کابینہ کو ایک دار العوام نے منتخب
کیا ہو اسے دوسرے دار العوام میں اپنا مرافعہ پیش کرنیکا حق حاصل ہے، جماعت واضع قوانین کی اس
خاص ذیلی مجلس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اس جماعت کے حاوی وغالب حصہ
کو منتشر کردے یعنی یہی مجلس نازک مواقع پر اعلیٰ مجلس واضع قوانین بن جاتی ہے پس انگلستان
کا اصول یہ نہیں ہے کہ جماعت عاملہ جماعت واضع قوانین کو جذب کرلے بلکہ یہ جماعت عامہ دونوں کا
مجموعہ مرکب ہے۔ کابینہ یا تو وضع قوانین اور نفاذ قوانین دونوں کام کرتا ہے اور اگر یہ نہیں ہے
تو وہ جماعت واضع قوانین کو منتشر کرسکتا ہے۔ وہ ایک پیدا کی ہوئی شئے ہے مگر وہ اپنے پیدا کرنیوالوں کو تباہ کردینے کی
قوت رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسی جماعت عاملہ ہے جو جماعت واضع قوانین کو فنا کرسکتی ہے، اور
پھر لطف یہ ہے کہ وہ اسی جماعت واضع قوانین کی نامزد کردہ ہے۔ وہ ایک پیکر
وہمی تھی، مگر اب وہ خود واضع کا نقش مٹا سکتی ہے، آغاز کے اعتبار سے

[۱] یہ بیان ہوا ہے کہ اس جلسۂ کابینہ کے خاتمہ پر جس نے اس امر کے تجویز کرنے پر اتفاق کرلیا تھا کہ غلہ پر ایک
مقررہ محصول لگایا جائے۔ لارڈ میلبورن نہایت اصرار سے کہنے لگے کہ "اب یہ بتائیے کہ غلہ کی قیمت
کم کرنی منظور ہے یا نہیں۔ اس سے کچھ بحث نہیں ہے کہ ہم اس بارے میں کیا کہیں لیکن اسکو سمجھ لیجئے کہ جو کچھ
ہم کہیں وہ ایک ہی بات ہو" کابینہ کے متعلق کسی قصہ کی یہ ایسی من وعن تصویر ہے جو میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی لیکن اسکی
صداقت کا میں ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ لارڈ میلبورن ایک ایسا شخص تھا جسکی نسبت لوگ بہت سے قصے گھڑ لیا کرتے تھے۔

وہ جماعت واضع قوانین کی زائیدہ ہے مگر اب اپنے فعل میں وہ اُس کی خادم ہے
جن لوگوں نے اس معاملہ پر زیادہ غور خوض نہیں کیا ہے ان کی نگاہ میں انگریزی دستور سلطنت کی کامیابی کے راز اور اسکی سربستہ حقیقت کے متعلق تشریعی و عاملانہ فرائض کا یہ امتزاج بے کیف و کم وقعت معلوم ہوگا مگر اس کی حقیقی اہمیت کا اندازہ ہم اسی وقت کرسکتے ہیں جب ہم اُس کے چند خاص موثرات پر نظر ڈالیں اور اس کے اس عظیم الشان حریف سے اس کا مختصر سا مقابلہ کریں جس کی اگر فکر نہ کی گئی تو اغلب ہے کہ دنیا کی ترقی میں وہ اس انگریزی طریق کو بہت پیچھے ڈال دیگا۔ وہ حریف صدارتی طریقہ ہے، اُس کا خاص وصف یہ ہے کہ صدر (رئیس) کا انتخاب قوم کی طرف سے ایک طریق پر ہوتا ہے اور دارالنائبین کا انتخاب دوسرے طریق پر۔ تشریعی و عاملانہ اختیارات کا ایک دوسرے سے آزاد رہنا، صدارتی حکومت کا ایسا ہی مخصوص وصف ہے، جیسے ان کا امتزاج واتحاد کابینی حکومت کا قطعی اصول ہے۔

اولاً ان دونوں طریقوں کا پر امن اوقات میں مقابلہ کیجئے۔ ایک مہذب و متمدن زمانہ کا اصل الاصول یہ ہے کہ نظم ونسق کو وضع قانون کی ضرورت برابر لاحق رہتی ہے۔ وضع قوانین میں ایک اہم و ضروری قسم اجرائے محصول سے تعلق رکھتی ہے۔ مہذب حکومت کے اخراجات برابر بدلتے رہتے ہیں اور حکومت اگر اپنے فرض کو (پوری طرح) انجام دیتی ہے تو اس خرچ کا بدلتا رہنا لازمی ہے۔ لامحالہ انگریزی حکومت کا موازنہ متفرقات تغیر پذیر مدات کا ایک معجون مرکب ہوتا ہے، تعلیم قیدخانوں کا انضباط، علم وفن اور سینکڑوں طرح کے ملکی صادرات وغیرہ کے لئے کسی سال زیادہ رقم کی ضرورت پڑتی ہے اور کسی سال کم کی۔ مدافعت کے اخراجات یعنی بری و بحری افواج کے موازنات میں حملے کے اندیشہ کی کمی و بیشی اور اِس خطرے کے روکنے کے لئے جس سامان کی ضرورت ہو اس کی ارزانی و گرانی کے لحاظ سے اور بھی زیادہ اختلاف ہوتا رہتا ہے۔ جن لوگوں کو کام کرنا پڑتا ہے اگر وہ وہی اشخاص نہ ہوں جن کو قانون بنانا ہوتا ہے تو ان دونوں جانب کے لوگوں میں خلاف پیدا ہو جائے گا۔ محصول عاید کرنے والوں کا محصول کے خواستگاروں سے تنازعہ پیش آنا یقینی ہے۔ جماعت عاملہ کو جن قوانین کی

ضرورت ہے اُن کے نہ مہیا ہونے سے وہ بے دست و پا ہو جاتی ہے اور جماعت واضع قوانین بغیر ذمہ داری کے کام کرنے سے تباہ ہو جاتی ہے۔ جماعت عاملہ اس نام کی سزاوار نہیں رہتی کیونکہ وہ جس امر کا فیصلہ کرتی ہے اسے عمل میں نہیں لا سکتی اور جماعت واضع قوانین آزادی کی وجہ سے خراب جاتی ہے، کیونکہ وہ ایسے فیصلے کرتی ہے جن کے نتائج اُسے نہیں بلکہ دوسروں کو برداشت کرنا پڑتے ہیں۔

امریکہ میں اس مشکل کا احساس اس حد تک ہوا کہ جماعت واضع قوانین و جماعت عاملہ میں گونہ ربط پیدا ہو گیا ہے۔ حکومت وفاقی کے معتمد خزانہ کو جب کسی محصول کے اجرا کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ کانگریس کی ذیلی مجلس مالی کے صدر سے مشورہ کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں کر سکتا کہ خود کانگریس میں چلا جائے اور جو کچھ چاہتا ہے اس کی تجویز پیش کرے۔ وہ صرف ایک خط لکھکر بھیج سکتا ہے، اگر وہ کوشش یہ کرتا ہے کہ ذیلی مجلس مالی کا صدر ایسے شخص کو بنائے جو اُس کے محصول کو پسند کرتا ہو۔ اس صدر کی وساطت سے وہ کوشش کرتا ہے کہ مجلس کو اس محصول کی سفارش کر دینے کے لئے ترغیب دے، اور پھر اس مجلس کے توسط سے وہ ایوان کو اس محصول کے قبول کر لینے پر راغب کرنے کی سعی کرتا ہے، مگر تعلقات باہمی کے اس قسم کے سلسلے سے مسلسل خلل پڑ جانے کا امکان لگا رہتا ہے۔ کسی موزوں موقع پر ایک محصول کے لئے تو یہ طریقہ کافی ہو سکتا ہے مگر مالی مشکلات کے وقتوں میں کسی پیچیدہ موازنہ کے مراحل طے کرنے کا متحمل ہونا دشوار ہے، ہم یہاں جنگ یا بغاوت کا وقت نہیں کہتے کیونکہ ہم اسوقت کابینی طریق اور صدارتی طریق کا پر امن زمانہ میں مقابلہ کر رہے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دو ہوشیار آدمی بالکلیہ کسی ایک موازنہ پر متفق ہو گئے ہوں۔ حکومت انگریزی کے موجودہ دستور کے موافق ایک ہندوستانی وزیر خزانہ، انگریزی مالیات کے متعلق کلکتہ میں گفتگو کرتا ہے اور ایک انگریزی وزیر خزانہ ہندوستانی مالیات کے متعلق انگلستان میں گفتگو کرتا ہے، اگر اعداد ہمیشہ ایک ہی نہیں ہوتے اور حکمت عملی کے متعلق رائیں شاذ و نادر ایک ہوتی ہیں۔ ایک نہایت ہی پر غیظ و غضب مباحثہ سے دنیا لطف اندوز ہو چکی ہے اور غالباً بہت سے مباحثے جو دلچسپی میں اس سے کم ہونگے

ہند و انگلستان کے مراسلات کے طومار بے پایاں میں مخفی پڑے ہونگے۔

مگر جماعت واضع قوانین کی ذیلی مجلس مالی کے صدر اور جماعت عاملانہ کے وزیر مالیات کے درمیان اس نوع کے کچھ نہ کچھ تعلقات ضرور ہونا چاہئیں[۱] ان میں نزاع باہمی کا ہونا یقینی ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ نتیجہ سے کسی کو بھی اطمینان نہ ہوگا، اور جب محصولوں سے وہ آمدنی نہ ہوگی جس کی توقع کی گئی تھی تو پھر اس کا ذمہ دار کسے گروانا جائے گا۔ نہایت ہی اغلب ہے کہ معتمد خزانہ صدر کو اس امر پر آمادہ نہیں کر سکتا کہ وہ ذمہ داری اٹھائے۔ صدر اپنی جگہ پر مجلس کو راغب نہیں کر سکتا اور مجلس اپنی باری میں کانگریس کو آمادہ نہیں کر سکتی پس جب مداخل کم ہو جائینگے تو سزا کسے دیجائیگی یعنی کس کی تخفیف عمل میں آئیگی۔ جماعت واضع قوانین کے سوا اور کوئی نہیں ہے، مگر یہ جماعت ایک ایسا مجموعہ مرکب ہے کہ اسے سزا دینا دشوار ہے اور پھر سزا دینے والی بھی خود وہی مجلس ہے۔ کسی مہذب و متمدن زمانہ میں نظم و نسق ملکی کا صرف مالی ہی حصہ ایسا نہیں ہے جس کو سہل الحصول وضع قانون کی تائید و رفاقت کی مسلسل ضرورت رہا کرتی ہے بلکہ تمام ہی نظم و نسق کو یہ ضرورت لاحق رہتی ہے۔ انگلستان میں کسی اہم موقع پر کابینہ اپنے استعفے کی دھمکی اور خود دار العوام کی برطرفی کی تہدید سے اس مجلس کو قانون سازی کے لئے مجبور کر سکتا ہے مگر ایک صدارتی سلطنت میں ان دونوں میں سے کسی طریقہ سے بھی کام نہیں لیا جا سکتا یہاں جماعت واضع قوانین کو حکومت عاملہ برطرف نہیں کر سکتی اور وہ خود مستعفی ہونے کی فکر نہیں کرتی کیونکہ اسے اپنا جانشین نہیں مہیا کرنا پڑتا۔ اسلئے جب کوئی اختلاف رائے پیدا ہو جاتا ہے تو جماعت واضع قوانین کو مجبور ہو کر جماعت عاملہ سے جنگ کرنا پڑتی ہے اور جماعت عاملہ کو جماعت واضع قوانین سے جنگ کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے، اور بلحن غالب ہر ایک جماعت اپنے اختتام میعاد تک یوں ہی رد و کد کرتی رہتی ہے[۲]۔ بیشک ایک صورت حالات ایسی ہے جہاں یہ بیان اگرچہ کم و بیش صحیح ہوتا ہے

---

[۱] یہ امر قابل لحاظ ہے کہ حکومت عہدیہ کے قلیل ہی زمانہ قیام میں یہ خرابیاں بہت ہی بین طور پر ظاہر ہو گئی تھیں۔ رچمنڈ کی کانگریس کے واقعات میں تقریباً آخری اتفاق اسکے اور جیفرسن ڈیوسن کے باہمی پر غیظ مالی مراسلات تھے۔

[۲] یہ جملہ مسٹر لنکن کے قتل کے بعد ہی اسوقت لکھا گیا تھا جب ہر شخص یہ کہتا تھا کہ مسٹر جانسن جنوبی ریاستوں کے سخت مخالف ہونگے اگر جس طرح یہ جملہ لکھا گیا میں اسی طرح اسے رہنے دیتا ہوں۔

پھر بھی پوری طرح ٹھیک نہیں اترتا، وہ صورت یہ ہے کہ کوئی امر مابہ النزاع پیدا ہی نہ ہو۔ امریکہ میں بغاوت کے قبل دوسری ریاستوں سے بعد بعید اور ملک کے حسب خواہ اقتصادی حالت کی وجہ سے بہت کم قابل لحاظ امور ایسے تھے جن پر بحث و تکرار کی ضرورت پڑتی تھی لیکن اگر اس حکومت کا تجربہ آخری تیس برس کے انگریزی وضع قوانین کے بموجب ہوتا تو جن دو طاقتوں کا دائمی مقابلہ باہمی بہترین حکومت کے لئے لازمی ہے اُن کے مخالف بدگر افعال کا اظہار بہت واضح و بیّن طور پر ہو جاتا یہی بدترین خرابی نہیں ہے، کابینی حکومت قوم کو تعلیم دیتی ہے، صدارتی حکومت قوم کو تعلیم نہیں دیتی اور یہ ممکن ہے کہ اسے خراب کر دے۔ کہا جاتا ہے کہ انگلستان نے "ملکہ معظمہ کے فریق مخالف" کا فقرہ ایجاد کیا ہے یعنی یہی پہلی حکومت تھی جس نے نظم و نسق کی نکتہ چینی کو بھی خود نظم و نسق ہی کی طرح دستور سلطنت کا ایک جزو بنا دیا۔ فریق مخالف کی یہ نکتہ چینی کابینی حکومت کا ایک نتیجہ ہے۔ بحث و مباحثہ کا عظیم الشان منظر، عام ترتیب اور سیاسی معرکہ آرائی کی نازک تکلیف باعث متفقہ ہے۔ اس مجلس میں کسی سربرآوردہ مدبر کی کوئی تقریر کسی عظیم سیاسی اتحاد کا کوئی فریقانہ تحرک، قوم کو برانگیختہ کرنے، اسے جوش دلانے اور اسکو تعلیم دینے کے لئے بہترین ذریعہ ہے جو ابتک دریافت ہو سکا ہے۔ کابینی طریقہ میں اس قسم کے مباحث کا ہونا یقینی ہے کیونکہ یہی مباحث وہ وسائل بنجاتے ہیں جن کے ذریعہ سے مدبرین آئندہ کے لئے اپنی شہرت قایم کرتے اور موجود الوقت حکومتوں میں اپنے کو مستحکم رکھتے ہیں۔ جو لوگ تقریر کے شائق ہوتے ہیں انھیں یہ طریقہ آگے بڑھاتا ہے اور انھیں تقریر کا موقع دیتا ہے۔ کابینی حکومتوں کے فیصلے ان بیم ازامید و بیم رایوں کے بعد ہوتے ہیں جو پرلطف و پاکیزہ مباحث کے بعد عمل میں آتے ہیں۔ ہر ایک بات جو کہنے کے قابل ہوتی ہے اور ہر ایک بات جسے کہنا چاہئے یقین ہے کہ وہ سب باتیں ضرور بالضرور کہی جائینگی۔ پاک باطن اشخاص یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا فرض ہے کہ دوسروں کو ترغیب دیں، خود غرض اشخاص یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں جا و بیجا دخل درمعقولات کرنا ضروری ہے۔ قوم مجبور ہے کہ جس امر سے اسے سب سے زیادہ تعلق ہے اس کے دونوں جانب بلکہ تمام جوانب کے دلائل سنے، اور قوم ان دلائل کا سننا صرف پسند ہی نہیں کرتی ہے بلکہ وہ اس کی شایق ہوتی ہے۔ انسانی طبایع اس سے

متنفر ہیں کہ طول طویل بحثیں ہوں اور نتیجہ کچھ نہ نکلے بڑی بڑی تقریریں ہوں اور اس کے ساتھ کوئی تحریک نہ ہو، خیالی باتوں میں بال کی کھال نکالی جائے اور ظاہری چیزیں جہاں تھیں وہیں رہیں، مگر عظیم الشان نتائج کی فکر تمام لوگوں کو ہوتی ہے اور حکومت کا تغیر انھیں نتائج میں سے ہے۔ اس میں شاخ در شاخ تعلقات ہیں، اُس کا اثر نظم معاشرت میں سرایت کئے ہوئے ہے، اس سے کتنوں کے پیمانۂ امید چھلک اٹھتے ہیں اور کتنوں کی امیدیں نقش برآب ہو جاتی ہیں۔ یہ اُن نمایاں واقعات میں سے ایک واقعہ کا دن ہوتا ہے جو اپنی عظمت و وسعت اور اپنی تحیّر افزائی کی وجہ سے انسان پر بعض اوقات ضرورت سے زیادہ اثر ڈالتا ہے اور جن مباحث کا انجام اسطرح ہست و نیست کرنے والا ہو، یا اُن میں اُس کا امکان موجود ہو، ان کا (بہ طیب خاطر) سنا جانا یقینی ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ قوم کے دل پر اس کا گہرا اثر پڑے گا۔ صدارتی ملکوں میں سب سے بڑی اور سب سے بہتر سلطنت، ممالک متحدہ امریکہ کی ہے مگر وہاں کے سیاحوں نے بھی اس امر کو محسوس کیا ہے کہ "قوم کو خصوصیت کے ساتھ سیاسیات کا ذوق نہیں ہے یعنی اس میں کوئی رائے عامہ ایسی مکمل اور ایسی پاکیزہ نہیں ہے جیسی مکمل اور جیسی پاکیزہ رائے عامہ انگریزوں میں ہے۔ بہت سے جلد باز اہل قلم نے اس نقص کا ملزم "دائمی قوم" یعنی انگریزی امریکانی خصائص کو قرار دیا ہے لیکن انگریزی قوم کے لئے سیاسیات پر توجہ کرنے کا اگر کوئی محرک نہ ہوتا تو یہ یقینی ہے کہ وہ بھی سیاسیات کی طرف ملتفت نہ ہوتی۔ فی الحال ان کی یہ توجہ کاروباری حیثیت رکھتی ہے۔ جب کوئی فیصلہ کن نازک موقع آجاتا ہے تو قوم تشفی و اعانت کرتی ہے اور قوم ہی کی اعانت سے یہ بیڑہ پار ہو جاتا ہے۔ موجود الوقت حکومت کے برطرف ہو جانے یا برقرار رہنے کا تصفیہ پارلیمنٹ کے مباحث اور پارلیمنٹ کے اظہار رائے سے ہوتا ہے، مگر ایوان پارلیمنٹ کے دروازوں سے باہر کی رائے یعنی قوم پر چھائے ہوئے باطنی میلان طبیعت کا بہت بڑا اثر اس اظہار رائے پر پڑتا ہے۔ قوم اس امر کو محسوس کرتی ہے کہ اس کا فیصلہ اہمیت رکھتا ہے اور وہ (صحیح) فیصلہ کے لئے سعی کرتی ہے۔ وہ اس تصفیہ میں کامیاب رہتی ہے اور یہ کامیابی اسوجہ سے ہوتی ہے کہ پارلیمنٹ کے مباحثہ اور قیل و قال سے واقعات و دلائل اُس کے پیش نظر ہو جاتے ہیں، مگر

ایک صدارتی حکومت کے تحت میں زمانہ انتخاب کے سوا اور کسی وقت میں قوم کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ رائے دہی کا صحیح وقت اس کے سامنے نہیں ہوتا اس کا اقتدار رخصت ہو چکا ہوتا ہے اور اسے اس وقت تک انتظار کرنا پڑتا ہے کہ اس کا اقتدار مطلق پھر واپس آئے۔ اس میں رائے قایم کرنے کا ولولہ ایسا نہیں ہوتا جیسا کہ اس قوم میں ہوتا ہے جو کابینی حکومت کے تحت میں ہوتی ہے، نہ اسے اس قسم کی قوم کے مانند تعلیم حاصل ہوتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جماعت واضع قوانین میں مباحثے ہوتے ہیں مگر یہ سب تمہیدی نغمے ہیں اصل تماشا تو ہوتا ہی نہیں۔ یہاں کسی انجام کا کوئی امکان نہیں ہے، آپ حکومت کو خارج نہیں کر سکتے۔ اقتدار و حکومت کا عطا کرنا جماعت واضع قوانین کی فہرست انعامات میں شامل نہیں ہے اور کوئی شخص اس جماعت کی پروا نہیں کرتا۔ منصب و اقتدار کے مرکز اعظم یعنی حکومت عاملہ میں کسی طرح جنبش تک نہیں ہوتی، آپ کسی حال میں بھی اس میں تغیر نہیں کر سکتے۔ وہ آلہ تعلیم جس نے انگریزوں کی رائے عامہ کو تربیت دی ہے، جو انگریزوں کے عزائم کا موجب ہوا ہے اور جس نے ان کی رایوں کو مدون کیا ہے، یہاں اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ کسی صدارتی ملک کو نہ یہ ضرورت پڑتی کہ وہ روزانہ دقیق رائیں قایم کیا کرے اور نہ اس قسم کی رائے کے قائم کرنے میں اسے روزانہ مدد ملتی ہے۔

یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اخبارات کے مباحث، دستور سلطنت کی ان خامیوں کی تلافی کردینگے، خاص کر ایسی قوم جو مطالعہ کی عادی ہو، وہ اپنی حکومت کے اعمال و افعال کو ایسی ہی غایر نظر سے دیکھے گی اور اس کے متعلق اس کی رائیں ایسی ہی یکساں ایسی ہی قرین صحت اور ایسی پختہ ہوں گی جیسے کسی کابینی نظم سلطنت کے ماتحت قوم کی ہونگی مگر جو دشواری جماعت مقننہ کے سد راہ ہوتی ہے وہی مطابع کے لئے بھی سنگ راہ ثابت ہوتی ہے۔ اخبارات کچھ کر نہیں سکتے، وہ نظم و نسق کو بدل نہیں سکتے۔ جماعت عاملہ چند سال کے لئے منتخب ہوئی تھی اور اتنے سال تک اس کا برقرار رہنا ضروری ہے۔ لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ اہل امریکہ کی ایسی علم پرور قوم جو روئے زمین کی تمام قوموں سے زیادہ پڑھنے کی عادی ہے، اور جو اسقدر کثیر اخبارات کا مطالعہ کرتی ہے اس میں ایسے ناقص اخبارات شایع ہوتے ہوں، اور اخبارات ایسے اچھے ہوں

جیسے انگلستان کے اخبارات ہوتے ہیں' وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کے لئے کوئی محرک ایسا اچھا نہیں ہے جیسا انگریزی اخباروں کے لئے ہے۔ ہم جس زمانہ کو سیاسیات کا "منازک زمانہ" کہتے ہیں' یعنی جب نظم ونسق ملکی کی قسمت غیر متعین ہوتی ہے' اس کا انحصار چند ایسی رایوں پر جو ابھی دی نہیں گئیں' یا الغیر پذیر و متذبذب رائے عامہ پر ہوتا ہے' ایسے وقت میں باوقار اخبارات کے پرزور مضامین خاص الخاص اہمیت حاصل کر لیتے ہیں۔ ٹائمز نے بہت سی وزارتیں بنائی اور بگاڑی ہیں جیسا کہ کچھ زمانہ قبل ہو چکا ہے جب بہت دنوں تک منقسم پارلیمینٹ اور ایسی حکومتیں قائم رہیں جنکو وہ قطعی غلبہ رائے'' حاصل نہیں تھا اور جن کا انحصار ذہنی قوت پر تھا' ایسے وقتوں میں انگریزوں کی رائے کے سب سے زیادہ با اثر اخبار کی تائید نے بڑے کام انجام دئے ہیں۔ واشنگٹن کا اگر کوئی اخبار مسٹر لنکن کو خارج کر سکتا تو واشنگٹن کے اخبارات اعلیٰ مضامین و نفیس دلائل سے مزین ہو جاتے مگر واشنگٹن کے اخبارات کسی رئیس جمہوریہ کو اس کی میعاد معین کے اندر اس کی جگہ سے ہٹانے سے ایسے ہی قاصر ہیں جیسے ٹائمز میر بلدہ (لارڈ میر) کو ایک برس کے اندر اس کے عہدے سے ہٹانے سے مجبور ہے۔ کوئی شخص کانگریس کے لاحاصل مباحث کی پرواہ نہیں کرتا نہ کوئی شخص وہ طول وطویل مضامین پڑھتا ہے جن کا کوئی اثر واقعات پر نہیں پڑتا۔ اہل امریکہ خبروں کے عنوان کو دیکھ لیتے اور مضامین اخبار پر ایک سرسری نظر ڈال لیتے ہیں۔ وہ قیل وقال میں نہیں پڑتے۔ وہ کسی ایسی بحث میں پڑنے کا خیال ہی نہیں کرتے جس کا ماحصل کچھ نہ ہو۔

اس کہنے کے بعد کہ صدارتی حکومتوں میں جماعت مقننہ اور جماعت عاملہ کے افتراق سے جماعت واضع قوانین کے اقتدار میں کمی پیدا ہو جاتی ہے' یہ کہنا اجتماع ضدین معلوم ہوگا کہ اس سے اقتدار عاملانہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے مگر یہ اجتماع ضدین نہیں ہے یہ افتراق حکومت کی تمام مجموعی قوت یعنی کل اعلیٰ اقتدار کو کمزور کر دیتا ہے۔ حکومت عاملانہ کا کمزور ہو جانا بہت ہی صاف و واضح ہے۔ انگلستان میں ایک زبردست کابینہ ایسے تمام کاموں میں جن سے اُن کے نظم ونسق میں آسانی پیدا ہوتی ہو جماعت مقننہ کا اتحاد و اتفاق حاصل کر سکتا ہے بلکہ کہنا یہ چاہئے کہ وہ خود ہی مجلس وضع قوانین ہے' مگر رئیس جمہوریہ کے لئے پارلیمنٹ کی طرف سے دقتوں کا

پیش آنا ممکن بلکہ اغلب ہے۔ ہر ایک مجلس مقننہ کے ارکان کا میلان بالطبع یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے کو نمایاں کریں۔ وہ اپنا حوصلہ پورا کرنا چاہتے ہیں خواہ وہ حوصلہ قابل تعریف ہو یا قابل مذمت، بہبود عامہ کے لئے وہ جن کارروائیوں کو بہترین کارروائی سمجھتے ہیں انھیں آگے بڑھانا چاہتے ہیں، وہ مہمات امور میں اپنی مرضی کے محسوس کئے جانے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ یہ تمام خیالات مل ملا کر اس طرف منجر ہوتے ہیں کہ وہ حکومت عاملانہ کی مخالفت کریں۔ وہ اگر اعانت کرتے بھی ہیں تو دوسروں کے اغراض انکے مدنظر ہوتے ہیں، اور اگر وہ شکست دیتے ہیں تو وہ فوراً اپنی رایوں کو آگے بڑھاتے ہیں، وہ اگر انہزام کے باعث ہوتے ہیں تو سب سے پیش پیش ہوتے ہیں، اگر موید بنتے ہیں تو محد و معاون بن جاتے ہیں۔ عہدیت جنوبی کی بغاوت کے قبل امریکی جماعت عاملہ کی کمزوری تمام نقادان فن کا موضوع خاص بنی ہوئی تھی فی الحقیقت جب ناراضی عامہ کا ڈر جماعت واضع قوانین کے روکنے اور دبانے کے لئے موجود نہیں ہوتا تو کانگریس اور کانگریس کی ذیلی مجالس جماعت عاملہ کے راستہ میں دقتیں حائل کرتی رہتی ہیں۔

صدارتی طریق سے صرف اتنا ہی نہیں ہوتا کہ اقتدار تشریعی کی شکل میں اقتدار عاملانہ کا ایک حریف مقابل پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح اُسے کمزور کر دیتا ہے، بلکہ وہ جماعت عاملہ کے باطنی و حقیقی وصف میں خلل ڈال کر بھی اسکے ضعف کا باعث ہوتا ہے۔ کابینہ کا انتخاب جماعت مقننہ کی طرف سے ہوتا ہے اور جب یہ مجلس موزوں اشخاص پر مشتمل ہوتی ہے تو جماعت عاملہ کے انتخاب کا یہ طریقہ بہترین طریقہ ہوتا ہے۔ یہ ثانوی انتخاب کا ایک طریقہ ہے اور جن حالات کے تحت میں انتخاب ثانوی انتخاب اولین کی بہ نسبت قابل ترجیح ہو سکتا ہے وہ صرف یہی صورت ہے غرض جو ملک سیاسی زندگی سے جو شہرت اور عوامی ادارات کے چلانے کا عادی ہو، ایسے انتخاب آرا ملک میں قائم مقاموں کے انتخاب کے لئے قائم مقاموں کو منتخب کرنا محض لغو سمجھا جاتا ہے، اور امریکہ کے انتخابی حلقے ایسے ہی ہیں۔ مقصود تو یہ تھا کہ نائبین جب جمع ہوں تو وہ حقیقتاً اپنی صوابدید سے کام لیں اور اپنی آزادانہ رائے سے رئیس جمہوریہ کا انتخاب کریں مگر اولین انتخاب کنندے بہت زیادہ دلچسپی کا

اظہار کرتے ہیں، وہ کسی نائب کا انتخاب صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ مسٹر لنکن یا مسٹر بریکنرج کے لئے رائے دے اور نائب گویا صرف ایک نوشتہ لے لیتا ہے اور اسی کو ظرف رائے دہی میں ڈال دیتا ہے۔ وہ کبھی اپنی صوابدید سے کام نہیں لیتا بلکہ اس کا خیال تک نہیں کرتا۔ وہ بس ایک پیامبر یا ایک ہرکارہ ہے۔ اصل فیصلہ ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو اس نائب کا انتخاب کرتے ہیں اور وہ اس کا انتخاب اس لئے کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ کیا کرے گا۔

یہ صحیح ہے کہ برطانوی دارالعوام بھی اس قسم کے اثرات کے زیر اثر ہے غالباً اکثر و بیشتر ارکان کا انتخاب خالص وجوہات قانون سازی کے بجائے زیادہ تر اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص وزارت کے لئے رائے دینگے مگر دارالعوام کے فرائض نہایت اہم و مسلسل ہیں اور یہی خاص الخاص فرق ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ کے انتخابی حلقہ کی طرح یہ اپنے حکمران کو منتخب کر کے خود منتشر نہیں ہو جاتا بلکہ وہ ہمیشہ کاموں پر نظر رکھتا، قانون بناتا، وزارتوں کا عزل و نصب کرتا رہتا ہے۔ پس یہ فی الواقع ایک انتخاب کنندہ جماعت ہے۔ ادھر کے چند سال کے اندر جتنی پارلیمنٹوں کا انتخاب ہوا، ان میں ۱۸۵۷ء کی پارلیمنٹ سب سے زیادہ ایک خاص وزیر اعظم کی تائید کے لئے منتخب ہوئی تھی، اس پارلیمنٹ کی نسبت اہل امریکہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ "پامرسٹن کے ٹکٹ" پر منتخب ہوئی تھی مگر اسے عالم وجود میں آئے ہوئے دو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ اس نے لارڈ پامرسٹن کو معزول کر دیا۔ اس کا انتخاب اگرچہ ایک خاص وزارت کے مقصد سے ہوا تھا مگر حقیقت میں اس نے اس وزارت کو تباہ کر دیا۔

ایک اعلیٰ پارلیمنٹ ایک اوّل درجہ کی انتخابی جماعت بھی ہے۔ اگر وہ ملک کے لئے قانون بنانے کی اہل ہے تو اس کے اکثر افراد کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ وہ اس ملک کے عام ذہنی معیار کی نمائندگی کریں۔ اس کے مختلف ارکان کے واسطے ضروری ہے کہ اس قوم میں جسقدر مختلف النوع مخصوص اغراض، مخصوص رائیں، اور مخصوص خیالات پائے جاتے ہوں، ان سب کی نمائندگی کریں۔ ہر ایک مخصوص فرقہ کے لئے ایک نہ ایک وکیل کا ہونا ضروری ہے اور

ایک وسیع جماعت ایسی ہونا چاہئے جو کسی فرقہ سے تعلق نہ رکھے۔ یہ جماعت ہمنوا اور انصاف دوست ہو یعنی خود قوم کے مماثل ہو۔ جب ایسی جماعت کا بروے کار آنا ممکن ہو تو وہ حکام عاملہ کے انتخاب کے لئے بہترین جماعت متصور ہوگی۔ وہ سیاسی مستعدی و آمادگی سے بھری ہوتی ہے، وہ سیاسی زندگی سے قربت رکھتی ہے، اس کے سامنے جو معاملات پیش ہوتے ہیں اُسے ان کی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں اسقدر جودت و ذہانت ہوتی ہے جو زیر بحث سوسائٹی میں پائی جاسکتی ہے۔ واشنگٹن و ہملٹن قوم کے جن برگزیدہ اشخاص کا ایک حلقہ انتخاب مہیا کرنے کے درپے تھے وہ یہی ہے۔

اُس کے فوائد کو کماحقہ سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُس کے بدل پر نظر کیجائے جس جماعت انتخابی کا مقابلہ کرنا ہے وہ خود قوم ہے، اور یہ جماعت اصولاً و عملاً نہایت شاذ و نادر مستثنیات کے علاوہ ایک ناقص جماعت ہے۔ مسٹر لنکن اپنے دوسرے انتخاب کے موقع پر اس حالت میں منتخب ہوے تھے جب تمام وفاقی ریاستیں بدل و جان ایک ہی مقصد پر ہم آہنگ ہوگئی تھیں، اس موقع پر ایک واقعی انتخاب کنندہ قوم نے برضا و رغبت دوبارہ اس کا انتخاب کیا تھا۔ جس مقصد میں ہر شخص غرق تھا، وہ اُس کی ذات میں مرتکز ہوگیا تھا مگر رئیس جمہوریہ کا بس یہی ایک انتخاب ہے، جس کی نسبت اتنا بھی کہا جاسکتا ہے تقریباً اور تمام صورتوں میں رئیس جمہوریہ کا انتخاب بڑکوں اور گرم ڈھولوں کی ایک ایسی پیچیدہ کل کے ذریعہ سے ہوتا ہے جس کا پوری طرح سمجھنا دشوار ہے اور لوگ اس سے اسقدر مانوس ہیں کہ اُس کی تشریح و توضیح کی ضرورت بھی نہیں ہے رئیس جمہوریہ قوم کا برگزیدہ شخص نہیں بلکہ سیاسی عنان گیروں کا برگزیدہ شخص ہوتا ہے۔ یے شور و شر اوقات میں نہایت وسیع حلقہ انتخاب کو انتظام انتخاب کا تختۂ مشق بنانا ضروری اور جائز ہے اکوئی شخص یہ نہیں جان سکتا کہ وہ جب تک کسی بڑے نظم و اجتماع کا شریک ہوکر رائے نہ دے اسوقت تک اس کا رائے دینا ہی بیکار ہے، لیکن اگر وہ شریک کار کی طرح سے رائے دیتا ہے تو پھر وہ اس انجمن کے کارکنوں کے حق میں اپنے فرض انتخابی سے

دست بردار ہوجاتا ہے۔ قوم اگر خود اپنے لئے بھی انتخاب کرے تب بھی وہ ایک حد تک غیر ماہر جماعت ہوگی لیکن جس حال میں کہ وہ خود اپنے لئے انتخاب نہ کرے بلکہ خفیہ شورہ انگیز جیسا چاہیں ویسا کریں اس حالت میں تو وہ اس عظیم الجثہ کاہل آدمی کے مانند ہوگی جو بودے دل اور شریر طبیعت کا شخص ہو۔ یہ قوم بہت آہستہ آہستہ اور دشواری کے ساتھ حرکت کرتی ہے مگر اس کی حرکت ایک بڑے ارادے کے زیر اثر ہوتی ہے اسکا مقصود تھوڑا ہوتا ہے مگر اس تھوڑے میں بھی برائی بد نظر ہوتی ہے۔

اور جس طرح پارلیمنٹ کی بہ نسبت قوم میں انتخاب کی اہلیت کم ہے اسیطرح یہ بھی ہے کہ اسے بدتر آدمیوں میں سے انتخاب کرنا پڑتا ہے یعنی اٹھارھویں صدی کے امریکی واضعان قانون پر بڑا الزام یہ لگایا گیا ہے کہ انھوں نے رئیس جمہوریہ کے وزرا کو مجلس قانونی کے کارکن ہونے کی اجازت نہیں دی مگر جو مقصد خاص ان کے پیش نظر تھا اسکو انھوں نے صاف طور پر دیکھا اور دانشمندی سے فیصلہ کیا ان کی خواہش یہ تھی کہ "قانون ساز شاخ" "عاملانہ شاخ" سے قطعاً ممیز رہے ان کا یقین تھا کہ ایک اچھے دستور سلطنت کیلئے اس قسم کی علیحدگی لازمی و ضروری ہے۔ ان کا یقین تھا کہ اس قسم کی تفریق انگریزی دستور سیاسی میں موجود ہے اور ان کے عاقل ترین اشخاص اس دستور کو بہترین نظام سلطنت سمجھتے تھے، اور اس قسم کی تفریق کو اصلاً و واقعاً قائم رکھنے کے لئے جماعت مقننہ سے رئیس جمہوریہ کے وزرا کا خارج رکھنا ضروری تھا۔ اگر وہ خارج نہ رکھے جاتے تو وہی حکومت عاملہ بن جاتے اور خود رئیس جمہوریہ کو مات کردیتے قانون ساز ایوان پر حرص طمع غالب ہوتی ہے۔ اس سے جو کچھ ہوسکتا ہے اسے وہ اپنے ہی تحت میں لانا چاہتا ہے اور کسی شئے کو اپنے ہاتھ سے بہت کم نکلنے دیتا ہے۔ اس کے ارکان کے جذبات اس پر حکمران ہوتے ہیں۔ قانون سازی کا ملکہ جو سب سے زیادہ حاوی و محیط ہوتا ہے، وہی ان کا آلہ ہوتا ہے۔ اس سے اگر ہوسکے تو وہ نظم و نسق ملک کو بھی اپنے ہاتھ میں لیلے۔ خود اپنے مقاصد کے تجربہ رکھنے کی وجہ سے ممالک متحدہ امریکہ کے بانیوں نے وزرا کو کانگریس سے خارج رکھنے میں دانائی سے کام لیا۔

لیکن یہ اخراج اگرچہ صدارتی طریق حکومت کے لئے ضروری ہے مگر محض اسوجہ سے اس کی برائی میں کمی نہیں آسکتی۔ اس سے زندگی عامہ کی تذلیل لازم آتی ہے جبتک کہ جماعت وضع قوانین کے ارکان کو یہ یقین نہ ہو کہ وہ محض تقریر کرنے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں جب تک کہ کام کرنے کی امید سے ان کے دل گرم نہ ہوں اور مواقع ذمہ داری کے احساس سے ان کے خیال میں پاکیزگی نہ پیدا ہو گی ہو اسوقت تک کوئی اول درجہ کا شخص اس جگہ پر آنا پسند نکرے گا اور اگر آجائے گا تو کچھ زیادہ کرے گا نہیں۔ ایک بزم مباحثہ جو جماعت عامہ سے وابستہ ہو اس سے تعلق رکھنا کوئی ایسا مقصد نہیں ہو سکتا جس سے اولوالعزمی پیدا ہو بلکہ یہ حیثیت ایسی ہے جس سے کاہلی کی ہمت بڑھتی ہے۔ (اور صدارتی دستور کے تحت میں کسی کانگریس کی حالت کی توضیح کے لئے یہ کوئی ناموزوں جملہ نہیں ہے) جس پارلیمنٹ کے ارکان عہدے سے محروم ہوں وہ اس پارلیمنٹ کے مساوی کیا اس کے مثل بھی نہیں ہو سکتی جس کے ارکان عہدوں سے محروم نہ ہوں۔ صدارتی حکومت اپنی نوعیت کے اعتبار سے سیاسی زندگی کو دو ٹکڑوں میں منقسم کر دیتی ہے ایک عاملانہ ٹکڑا ہوتا ہے اور دوسرا قانون سازا۔ اور اس تقسیم سے وہ کسی ٹکڑے کو بھی اس قابل نہیں رکھتی کہ کوئی اس کی فکر کرے اور اسے اپنی زندگی کا مستقل مقصد بنا کر کابینی حکومت کی طرح اس میں جان و دل سے منہمک ہو جائے۔ صدارتی طریق میں قوم جس قسم کے مدبروں میں سے انتخاب کرتی ہے وہ ان سے بہت کم رتبہ ہوتے ہیں جن کا انتخاب وہ کابینی طریق میں کرتی ہے اس کے ساتھ ہی ذریعہ انتخاب میں بھی نیک و بد کی تمیز نسبتاً بہت ہی کم مرعی ہوتی ہے۔

یہ تمام اختلافات نازک اوقات میں زیادہ اہم ہو جاتے ہیں کیونکہ حکومت کی اہمیت خود زیادہ ہو جاتی ہے۔ جسوقت چھوٹے چھوٹے کام انجام دینے ہوں اسکی نسبت اسوقت جبکہ بڑے کام انجام دینے ہوں یعنی اسوقت کے مقابلہ میں جب کرنے کے کام کم ہوں، اسوقت جب کام زیادہ ہوں، ایک قائم شدہ رائے عامہ، ایک موثر قابل، و منضبط جماعت واضع قوانین ایک عمدہ منتخب شدہ جماعت عاملہ، ایک پارلیمنٹ اور ایک ایسا نظم و نسق جو ایک دوسرے کا سدّ راہ نہیں بلکہ ایک دوسرے کا

ممد و معاون ہو، بہت زیادہ اہمیت حاصل کر لیتے ہیں لیکن اس کے علاوہ ایک پارلیمنٹی یا کابینی دستور سلطنت کو نہایت خطرناک اوقات میں، اور بھی بہت سی مخصوص قوتیں حاصل ہوتی ہیں۔ اس میں وہ شئے موجود ہوتی ہے جسے ہم محفوظ قوت کہتے ہیں اور جو انتہائی ضروریات کے لئے موزوں و درکار ہوتی ہے۔

حکومت عامہ کا اصول یہ ہے کہ اعلیٰ طاقت، یعنی مسائل سیاسیہ کی قوت فیصلہ قوم کے اندر رہوتی ہے، البتہ یہ ضروری یا عام بات نہیں ہے کہ یہ قوت کل قوم یا اس کی تعداد کثیر میں ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ یہ قوت اخیار قوم یعنی چند چھٹے ہوئے اور چنے ہوئے لوگوں میں ہو۔ یہی حال انگلستان کا ہے اور یہی حال تمام آزاد ممالک کا ہے۔ دفعتہً کسی مشکل کے پیش آجانے کی صورت میں، کابینی دستور کے تحت میں قوم اس موقع کے لئے کوئی حکمران منتخب کر سکتی ہے۔ یہ بالکل ممکن بلکہ اغلب ہے کہ وہ شخص اس موقع سے قبل حکمران نہ رہا ہو۔ اہم نازک موقع کے لئے جن اعلیٰ صفات، حکیمانہ عزم، سریع العمل قوت، پرشوق طینت کی ضرورت ہے وہ عام اوقات میں صرف یہی نہیں کہ درکار نہیں بلکہ اور وقت کا باعث ہوتے ہیں۔ روزمرہ کی سیاسیات میں ایک لارڈ لورپول، ایک چیتھم سے بہتر اور ایک لوئی فلپ، ایک نپولین سے بدرجہا فائق ہے۔ دنیا کی ترکیب ایسی واقع ہوئی ہے کہ دفعتہً کسی شدید طوفان کے برپا ہو جانے سے اکثر معلم کشتی کو بدلنا پڑتا ہے یعنی پرسکون وقت کے معلم کے بجائے طوفانی وقت کا معلم مقرر کرنا پڑتا ہے۔ انگلستان میں دستور سلطنت کے حد پختگی پر پہونچنے کے بعد سے اسقدر کم حادثات پیش آئے ہیں کہ انگریز اس مخفی خوبی کی قدر و قیمت کو بہت کم سمجھتے ہیں، کسی انقلاب پر اثر قائم رکھنے کے لئے انگریزوں کو کسی کا دو ٹر یعنی کسی ایسے مبعوث شخص کی ضرورت نہیں پڑی ہے جو کسی بڑی توقع کے لئے تمام لوگوں سے زیادہ موزوں ہو اور فطری قانونی طریقہ سے حکمرانی کے درجہ پر پہنچا ہو۔ لیکن انگلستان میں بھی ایک ایسے موقع پر جو کسی بڑے فوری خطرے سے بہت ہی مماثل تھا (یعنی جنگ کریمیا کے مشکلات کے اثنا میں) انگریزوں کو بھی اس لابدی فطری قوت سے کام لینے کی ضرورت پڑ چکی ہے۔ انگریزوں نے ابرڈین کے

کابینہ کو برطرف کر دیا، حالانکہ قانون اصلاح کے بعد سے یہ سب سے قابل ترین کابینہ تھا، وہ اس ایک مشکل کو چھوڑ کر جس سے اسے دو چار ہونا پڑا تھا اور ہر طرح کے مشکلات کے لئے نہ صرف موزوں بلکہ نہایت موزوں تھا، اس میں پرسکون معاملہ فہمی کی بہت زیادہ قابلیت موجود تھی، صرف "عنصر مبنی عنصر" کی کمی تھی۔ پس انگریزوں نے ایک ایسے مدبر کا انتخاب کیا جس میں اسوقت کے حسب ضرورت قابلیت موجود تھی اور وہ جب یہ سمجھ لیتا تھا کہ انگلستان کی مستحکم قوت اُسکی پشت پر ہے تو پھر وہ بے پس و پیش آگے قدم بڑھا دیتا اور بے روک ٹوک ضرب لگا دیتا تھا۔ انگریز اسوقت بالکل صحیح کہتے تھے کہ ہم نے ٹوگز (زاہد بے آزار) کو نکال دیا اور اسکے بجائے ایک شست زن کو مقرر کر دیا ہے۔

مگر ایک صدارتی حکومت میں آپ یہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ حکومت امریکہ خود کو ایک اعلیٰ قوم کی حکومت کہتی ہے مگر کسی سریع الوقوع نازک وقت میں جبکہ با اقتدار طاقت کی سب سے زیادہ حاجت ہوتی ہے آپ کو اس اعلیٰ قوم کا کہیں پتہ بھی نہیں لگتا۔ آپ کے پاس ایک کانگریس ہے جو ایک معینہ زمانہ کے لئے منتخب ہو چکی ہے اور شاید معینہ اقساط میں خارج بھی ہوتی رہتی ہے، اس میں نہ سرعت پیدا کی جا سکتی ہے اور نہ تعویق، آپ کے پاس ایک رئیس جمہوریہ ہے جو ایک معینہ زمانہ کے لئے منتخب ہوا ہے اور اس زمانہ تک وہ ہٹ نہیں سکتا۔ تمام انتظامات معینہ اوقات کے لئے ہیں۔ اس میں کوئی لچکدار عنصر نہیں ہے، جو کچھ ہے سب معمت المخصوص اور معین الوقت ہے۔ کچھ بھی ہو جائے مگر آپ کسی گھنٹے میں نہ تعجیل کر سکتے ہیں نہ تاخیر۔ آپ نے پہلے ہی سے اپنی حکومت کے متعلق حکم لگا دیا ہے۔ وہ آپ کی ضرورت کے موافق ہو یا نہ ہو، کام اچھا کرے یا برا، وہ آپ کے حسب منشا ہو یا خلاف منشا "قانوناً" آپ کو اس کا برقرار رکھنا لازمی ہے۔ پیچیدہ خارجی تعلقات رکھنے والے ممالک میں بیشتر ایسا واقع ہوگا کہ ہر ایک جنگ میں پہلے اور نہایت ہی نازک سال کا انتظام ایک امن پسند وزیر اعظم کو کرنا پڑے گا اور صلح کے اولین و نازک ترین اوقات کا انتظام کسی جنگجو وزیر اعظم کے ہاتھوں انجام پائے گا۔ دونوں صورتوں میں دوران تقاء پر لامحالہ وہ شخص حکمران ہوگا جس کا انتخاب اس کام کے لئے نہیں ہوا تھا جو اسے کرنا پڑا ہے۔ بلکہ اس کام کے لئے

ہوا تھا جس سے وہ بدلنے والا تھا، یعنی اس کا انتخاب اس روش کے لئے ہوا تھا جو اسے ترک کرنا تھی، نہ کہ اس روش کے لئے جس کا اسے انتظام کرنا پڑا۔

امریکی خانہ جنگی کی تمام تاریخ فی الواقع انھیں خیالات کی ایک مسلسل و مبسوط تفسیر ہے، یہ ایسی تاریخ ہے جس سے بہت اچھی طرح یہ امر روشن ہو جاتا ہے کہ جسوقت میں حکومت کی اہمیت بہت ہی بڑھجاتی ہے خاص اسیوقت میں صدارتی حکومت کے عملدرآمد کی کیا حالت ہوتی ہے۔ یہ تو واقعی کمال ہے کہ صدارتی حکومت کے خلاف میں اس عجیب و غریب نقص کو پیش کیا جائے جسکی وجہ سے نائب رئیس جانسن رئیس جمہوریہ ہوگیا، یعنی ایک شخص جو ایک بے عمل عہدے کے لئے منتخب کیا گیا تھا وہ اس منصب پر فائز ہوگیا ہے جو الحال سیاسی دنیا میں سب سے زیادہ اہم انتظامی منصب ہے یہ نقص اگرچہ واضعان نظام سلطنت اور اس کے عملدرآمد کے توقعات کے متعلق سب سے زیادہ نمایاں نقص ہے مگر وہ صدارتی حکومت کی اس خاص حالت کا ایک واقعہ ہے اور خود اس حکومت کا کوئی لازمی جزو نہیں ہے[1]۔ مگر مسٹر لنکن کے پہلے انتخاب پر اس قسم کا کوئی اعتراض نہیں وارد ہوتا۔ کسی اہم موقع پر اس قسم کی حکومت کے طبعی عملدرآمد کی یہ ایک مختص و نمایاں مثال ہے، وہ عملدرآمد کیا تھا؟ اسے بالاختصار ایک "مقدار غیر معلوم" کی حکومت کہہ سکتے ہیں۔ امریکہ میں شاید ہی کسی کے ذہن میں یہ ملحوظ رہا ہو کہ مسٹر لنکن کس قسم کے شخص ہیں یا کوئی قطعی خیال اس امر کا رہا ہو کہ وہ کیا کرینگے۔ کابینی حکومت کے طریقہ میں سربرآوردہ مدبرین کے محض نام ہی ہر شخص کی زبان پر نہیں ہوتے بلکہ ان کا ایک صحیح تصور بھی ہر شخص کے ذہن میں ہوتا ہے۔ انگلستان کے لوگوں کے دلوں میں یہ تصور قائم ہے کہ مسٹر گلیڈسٹون، یا لارڈ پامرسٹن کس قسم کے آدمی ہیں، یہ خیال غالباً ہر اعتبار سے صحیح نہیں ہوتا مگر پھر بھی وہ بہت کچھ

[1] دستور کے بنانیوالوں کو توقع یہ تھی حلقۂ انتخاب کی جانب سے نائب رئیس کا انتخاب ایسا ہوگا کہ وہ (رئیس کے بعد) ملک کا قابل ترین شخص ہوگا مگر چونکہ نائب رئیس ایک بے عمل شخص ہوتا ہے اسلئے ایک دوسرے درجہ کا شخص جو عنان گیروں کے حسب مرضی ہوتا ہے داخل کردیا جاتا، رئیس جمہوریہ کے قائم مقام ہونیکا اتفاق اسقدر بعید الوقوع ہے کہ اس کا خیال بھی ذہن میں نہیں آتا۔

ایک واضح ومتین تصور ہوتا ہے۔ انگریزوں کے ذہن میں یہ خیال ہی نہیں آتا کہ وہ اس حالت میں پڑے ہوں کہ ان کے ملک کا ظاہری اقتدار حکمرانی کسی غیر معروف شخص کے ہاتھ میں ہو کسی نازک موقع پر جسکے حدود وسعت کا کچھ علم نہ ہو ایک غیر متعارف آدمی سے کام لینا، انگریزوں کے خیال میں بالکل ہی مضحکہ خیز امر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حسن اتفاق سے مسٹر لنکن اگر اعلیٰ قابلیت کے شخص نہیں تھے تو نہایت درجہ کے موزوں شخص ضرور تھے۔ یہ پیوریٹنی طبیعت کا گہرا اثر تھا جو مصیبت کے وقت میں نمایاں ہو گیا اور نہایت ہی دلکش معلوم ہوا مگر کسی شرط (لاٹری) میں کامیاب ہو جانا شرطوں کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ لنکن منتخب ہو گیا، اور اسے جو کچھ بننا تھا بن گیا مگر سوال یہ ہے کہ لنکن کے سے حالات کے شخص کے کامیاب ہونے میں کیا امور حائل تھے بہر حال صدارتی حکومت میں اس قسم کا اتفاق پیش آجانا ایک امر طبعی ہے۔ رئیس جمہوریہ کا انتخاب ایسی کارروائیوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے جو کسی مشہور شخص کے منتخب ہونے کے مانع ہیں، بجز اسکے کہ خاص حالات ایسے جمع ہو جائیں اور عام رائے مشتعل و خودسر ہو جائے۔ پس نتیجہ یہ ہے اگر رئیس کے انتخاب کے بعد ہی جلد کوئی نازک وقت آپڑے تو اسکی حکومت لامحالہ "مقدار غیر معلوم" کی حکومت ہوگی، اس نازک موقع کی نگرانی ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہوگی جسے انگلستان کا بہت بڑا ظرافت نگار "مدبر غیر مسمی" کہیگا۔ پرامن وقتوں میں بھی ایک صدر کی حکومت بربنائے وجوہات مذکورہ بالا، کابینہ کی حکومت سے کمتر درجہ پر ہوگی، لیکن پرامن زمانہ کی دشواری، ہنگامہ خیز زمانہ کی دشواری کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتی، کسی صدارتی حکومت کے منضبط و روزمرہ کی کارروائی کی خامیاں کسی فوری دشواری کے وقت کی خامیوں کے مقابلہ میں بہت ہی خفیف ہیں، کمی بیشی اور ردوبدل کی گنجائش کا فقدان، کسی کے مختار کل ہو جانے کا عدم امکان، انقلاب کیلئے وسائل محفوظ کا قطعی فقدان، یہ سب اسی قسم کی دشواریاں ہیں اس تضاد باہمی سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کابینی حکومتوں کا مخصوص وصف یعنی اختیار قانون سازی کے ساتھ اختیار عاملانہ کا امتزاج کیوں اس درجہ اہم ہے۔ آگے چل کر میں یہ دکھاؤنگا کہ انگلستان میں یہ حالت کس شکل میں اور کن لواحق کے ساتھ قائم ہے۔

باب (۲)

شاہی

ظاہری اثرات کے اعتبار سے ملکہ کے برقرار رہنے کے فوائد حد شمار سے خارج ہیں، ان کے بغیر انگلستان میں موجودہ انگریزی حکومت خاسر وخایب اور زمانۂ ماضی کی بات ہوجائیگی۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جب وہ یہ پڑھتے ہیں کہ ملکہ نے ونڈزر کی ڈھالواں زمین پر ٹہل قدمی کی یا شہزادہ ولیعہد بہادر ڈربی کی گھوڑدوڑ میں گئے، تو ان کے دلوں میں یہ خیال گزرتا ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر ضرورت سے زائد توجہ کیجاتی ہے، مگر اس خیال میں وہ یہ سر غلط ہیں اور اس امر کا پتہ چلانا لطف سے خالی نہیں ہے کہ ایک گوشہ نشین بیوہ اور ایک بے شغل نوجوان کے اعمال وافعال کیوں ایسی شان حاصل کرلیتے ہیں۔

شاہی حکومت کے ایک مضبوط حکومت ہونے کی بہترین دلیل یہ ہے کہ وہ ایک قابل ادراک حکومت ہے۔ بنی نوع انسان کا سواد اعظم اسے سمجھتا ہے اور دنیا میں شاید ہی کہیں اس کے سوا کسی اور طرز حکومت کو وہ سمجھتے ہوں۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ لوگ اپنے تصورات وتفکرات کے زیر حکم ہوتے ہیں مگر یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ انکے تصورات کی کمزوری ہی ان پر حکمرانی کا موجب ہوتی ہے کسی دستور سلطنت کی نوعیت مجلس مقننہ کی کارروائی سیاسی فریقوں کے داؤ پیچ، بادیانہ رائے غیر مرئی تکوین، یہ سب پیچیدہ واقعات ہیں، ان کا جاننا دشوار اور ان میں غلطی کرجانا آسان ہے مگر عزم واحد کا فعل ایک رائے واحد کا حکم ناطق یہ آسان تصورات ہیں۔ ہر شخص انکا پتہ چلاسکتا ہے اور کوئی شخص اسے کبھی بھول نہیں سکتا۔ جب آپ بنی نوع انسان کے سواد اعظم کے سامنے یہ سوال پیش کریں کہ وہ تم کسی ایک بادشاہ کی حکمرانی چاہتے ہو یا کسی دستور سلطنت کی،، تو اس دریافت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ آیا تم پر اسطرح کی حکمرانی ہو جسے تم سمجھ سکو یا اسطرح کی حکمرانی ہو جسے تم سمجھ نہ سکو،، یہ سوال فرانسیسی قوم کے سامنے پیش ہوا تھا ان سے یہ پوچھا گیا تھا کہ وہ تم لوئی نپولین کی حکمرانی چاہتے

ہو یا کسی جمعیت کی" قوم نے یہ جواب دیا کہ "ہم اس ایک شخص کی حکمرانی چاہتے ہیں جس کا تصور ہمارے ذہن میں آسکے، ہم بہت سے ایسے لوگوں کی حکمرانی نہیں چاہتے جن کا تصور ہمارے ذہن میں نہ آسکے"۔

دونوں حکومتوں کی نوعیت کو پوری طرح ذہن نشین کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس ملک پر نظر ڈالی جائے جس میں نسبتاً تھوڑے زمانہ کے اندر اندر دونوں قسم کی حکومتیں یکے بعد دیگرے قائم ہو چکی ہیں۔

مسٹر گروٹ کہتے ہیں کہ "یونانی افسانے ہر موقع پر جو سیاسی حالت ہماری پیش نظر کرتے ہیں انھیں دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ ان کے اہم خصوصیات اس حالت سے کس درجہ مختلف ہیں جو بیلوپونیزی جنگ کے زمانہ میں، بلا استثناء ہر جگہ یونانیوں میں رائج تھی زمانہ تاریخ کی عدیدیت (Oligarchy) اور عمومیت دونوں ایک طرح کے قائم شدہ طریقہ حکومت کی ضرورت پر متفق ہو گئے تھے جس میں مختص فرائض، عارضی عمال اور (سینات، اکلیزیا یا دونوں حیثیتوں میں) ذی اوصاف اہل شہر کے حصہ کثیر کے سامنے (کسی نہ کسی صورت میں) آخری ذمہ داری، یہ تینوں عناصر شامل تھے۔ یہ ضروری ہے کہ اہل شہر کے اوصاف وقابلیت، مجلس عام کی صفات وخوبی اور حصول اختیار کے جواز وغیرہ کے متعلق مختلف حکومتوں کے درمیان متعدد واہم امتیازات قائم تھے اور اکثر ایسا بھی ہوتا کہ کسی خاص شہر میں ان مسائل کا تصفیہ جسطرح ہوا ہو اس سے وہاں کے لوگ دل برداشتہ ہوں، لیکن ہر ایک ایسی حکومت کے لئے جو جائز کہلانے کی مستحق ہو یا اس قابل ہو کہ یونانیوں کے دل میں اس کی اخلاقی ذمہ داری پیدا ہوتی ہو، اس کے لئے ہر شخص کے دل میں اس کے رواج کے ضمنی قاعدہ یا طریقہ کے خیال کا ہونا جسے اس زمانہ میں کم وبیش دستور سلطنت کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں، لابدی تھا۔ اس دستور کے تحت میں جو عمال حکومت اور اقتدار کا کام انجام دیتے تھے، ہو سکتا تھا کہ وہ کم وبیش اس کام کے اہل اور ہر دلعزیز ہوں مگر ان کے متعلق یونانیوں کا ذاتی احساس بالعموم عام طریقہ کی الفت ونفرت کے احساس میں گم ہو جاتا تھا؛ اگر کوئی زوردار شخص اپنی جبارت وچالاکی سے اس نظام سلطنت کو شکست کر دے اور اپنی مرضی وخواہش سے خود مستقل حکمران بنجائے تو وہ اگر عمدگی سے بھی حکومت کرے تو بھی وہ لوگوں کے دلوں میں اپنے لئے ادائے فرض کا کوئی احساس

نہیں پیدا کر سکتا تھا، اس کا حصول اقتدار ابتدا ہی سے ناجائز تھا اور اس کی جان تک کا لے لینا ممنوع نہیں بلکہ قابل تعریف تھا، حالانکہ دوسری حالتوں میں اس قسم کی خونریزی پر اخلاقاً ملامت کیجاتی۔ زبانوں پر اس کا ذکر بھی صرف مطلق العنان کے نام سے آسکتا تھا جس سے اس پر یہ داغ لگتا تھا کہ وہ خوف و نفرت کا محل اجتماع ہے۔

اگر ہم تاریخی زمانے کے یونان سے پیچھے ہٹکر زمانہ افسانہ کے یونان پر نظر ڈالیں تو ہمیں ایک ایسی تصویر نظر آئیگی جو اس سے بالکل مختلف ہوگی جس کا نقشہ اوپر کھینچا گیا ہے۔ ہمیں یہاں صاف طور پر ایک ایسی حکومت نظر آتی ہے جس میں نظم و ترتیب کا کہیں پتا نہیں ہے اور کچھ ہے بھی تو محض برائے نام، اور محکوم کے سامنے ذمہ دار ہونے کا خیال تو اور بھی کم ہے مگر اس حکومت میں قوم کی اطاعت پذیری کا پر چشمہ خاص یہ ہے کہ ان میں اپنے سرداروں کی تعظیم و تکریم کا احساس موجزن ہے ہم سب سے اول و اقدم بادشاہ کو دیکھتے ہیں، اس سے گھٹکر ماتحت بادشاہوں اور سرداروں کی محدود تعداد ہوتی ہے انکے بعد آزاد اشخاص، کاشتکاروں، صناعوں، ڈاکوؤں وغیرہ کا ایک جم غفیر ہوتا ہے۔ سب سے ادنی درجہ میں اجیر مزدور اور زر خرید غلام ہوتے ہیں۔ بادشاہ کو دوسرے سرداروں کے بہ نسبت کوئی ایسا بڑا امتیاز نہیں حاصل ہوتا، ہر ایک سردار کے لئے "بازی لیوس" (Basi leus) کا لقب استعمال ہوتا ہے، اور یہی لقب بادشاہ کے لئے بھی ہے بادشاہ کی فوقیت اس کے بزرگوں سے اسے میراث میں ملی ہے اور ایک عام قاعدے کے طور پر وراثتاً اس کے بڑے بیٹے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ یہ فوقیت ایک اختیار کے طور پر اس خاندان کو زیوس دیوتا کے لطف و کرم سے عطا ہوئی ہے۔ جنگ کے وقت بادشاہ ہی لشکر کا قائد ہوتا ہے، اس کی ذاتی شجاعت سب سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے اور وہی تمام فوجی نقل و حرکت کی رہبری کرتا ہے، حالت امن میں وہ ضرر رسیدوں اور مظلوموں کا عام محافظ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ان عبادتوں اور قربانیوں کا پروہت بھی وہی ہوتا ہے جن کا مقصود تمام قوم کے دیوتاؤں کی عنایت حاصل کرنا ہوتا ہے، اس کے بلند مرتبہ کے لازمہ کے طور پر ایک کافی و دافی علاقہ اس کے لئے مخصوص کر دیا جاتا ہے اور ایک حد تک اس کے کھیتوں اور مویشیوں کا ماحصل نیم مہذب مگر فراخ دست مہماں نوازی کے لئے وقف طیب سمجھا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں، اس کے عناد سے بچنے، اس کی عنایت کے

حاصل کرنے اور اس کے مطالبات سے چشم پوشی کئے جانے کے لئے اسے بکثرت ہدایا ملتے رہتے ہیں، اور جب دشمن سے مال غنیمت ہاتھ آتا ہے تو عام تقسیم سے قبل ہی اس کے لئے ایک بڑا حصہ محفوظ کر دیا جاتا ہے، جس میں غالباً اسیروں میں سے سب سے زیادہ ماہ جبین عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔

یونان کے "عہد رزمیہ" میں وہاں بادشاہ کی حیثیت وہ تھی جو مذکور ہوئی اگر ہم اعلیٰ وادنی دونوں قسم کے اعلام کنندوں اور پوجاریوں کو خارج کر دیں تو پھر بادشاہ کی ذات ہی ایک ایسی ذات رہجاتی ہے جسے ہم کسی حد تک شخصی اختیار سے ملبوس دیکھتے ہیں۔ وہی وہ شخص ہے جو عاملانہ فرائض کو (جن کی تعداد نظم معاشرت کی ضروریات کے لحاظ سے اس زمانہ میں بہت ہی کم ہوتی تھی) خود انجام دیتا ہے یا ان کے انجام کو پہنچانے کی ہدایت کرتا ہے۔ اس تصور کا خاص ونمایاں رنگ اسی کا شخصی تفوق ہے، یہ تفوق نہ صرف نتیجہ ہے اس ربانی عنایت کا جو اس کی ذات خاص اور اس کی نسل پر مبذول ہوئی ہے بلکہ دیوتاؤں کی نسل سے ہونے کا وصف بھی اس کا موید ہے۔ قوم اس کی آواز پر کان دھرتی اسکے تجاویز کو جان و دل سے قبول کرتی اور اس کے احکام کی اطاعت کرتی ہے۔ نہ صرف اس کی مخالفت کرنا بلکہ اس کے افعال پر نکتہ چینی کرنا بھی بالعموم مذموم سمجھا جاتا ہے اور درحقیقت اس قسم کی نکتہ چینی کی کوئی شنوائی بھی اسوقت تک نہیں ہوتی جبتک کہ وہ نکتہ چینی ماتحت حکمرانوں میں سے کسی کی جانب سے نہ پیش ہو!!

انگلستان کی بادشاہی کا وصف خاص یہ ہے کہ نیم مہذب زمانہ میں دیوتا صفت بادشاہ جن خیالات کی بنا پر حکومت کرتے تھے ان خیالات کو اس بادشاہی میں قائم و برقرار رکھا ہے اور بعد کے زیادہ شائستہ زمانہ میں یونان کے دساتیر سلطنت جن خیالات کی بنا پر حکمرانی کرتے تھے، ان کا بھی اضافہ کر لیا ہے۔ اہل ایتھنز بلکہ باغلب وجوہ یونانیوں کی ہر ایک سیاسی آبادی کے مقابلہ میں انگریزوں کی قوم ایک زیادہ مخلوط قوم ہے۔ انگریزوں کی ترقی زیادہ ناہموار طور پر ہوئی ہے۔ قدیم زمانہ میں غلاموں کا ایک جداگانہ طبقہ تھا اور ان پر انھیں قوانین اور انھیں خیالات کے بموجب حکمرانی نہیں ہوتی تھی جن کے بموجب دوسرے اشخاص پر حکمرانی ہوتی تھی۔ کسی دستور سلطنت کے بنانے میں انکا خیال کرنا کچھ ضروری نہیں تھا، نہ کسی دستور سلطنت کو مکمل بنانے کے لئے ان کی اصلاح کرنی

ضروری تھی۔ یونان کے مقنن کو اس کی حاجت نہیں تھی کہ وہ اپنے دستور سلطنت میں سمرسٹ شائر کے مزدوروں کے ایسے آدمیوں اور سٹر گروٹ کے ایسے آدمیوں کو مجتمع کرے۔ اسے کسی ایسی قوم کے معاملات طے کرنا نہیں تھے جس میں قدیم ترین زمانہ کی بربریت ازمنہ مابعد کے تمدن کی مسلمہ بنیاد کے طور پر قائم ہو لیکن انگریزوں کو اس قسم کے معاملات طے کرنا ہیں۔ انگریزوں کے ہاں ایسے غلام نہیں ہیں جنہیں خاص تخویف اور جداگانہ قانون سے دبا کر رکھا جائے مگر ساتھ ہی انگریزوں میں قوم کے تمام طبقات ایسے بھی نہیں ہیں جو دستور سلطنت کو پوری طرح سمجھ سکیں اور وہ غیر متشخص قوانین سے ادنیٰ وابستگی کے احساس کی بھی قابلیت نہیں رکھتے۔ یہ ضرور ہے کہ اکثر بیشتر اشخاص مبہم طور پر یہ جانتے ہیں کہ ملکہ کے علاوہ کچھ اور ادارات بھی ہیں اور کچھ قواعد ایسے ہیں جن کے بموجب ملکہ حکمرانی کرتی ہیں لیکن ایک نہایت وسیع تعداد ایسی ہے جو تمام دوسرے ادارات کی بہ نسبت اپنے دلوں میں ملکہ کے خیال کو جاگزیں رکھنا زیادہ پسند کرتی ہے اور اس لئے ملکہ ایک بے بہا شے ہے۔ جمہوریت میں حکومت کے متعلق صرف دقت طلب خیالات ہوتے ہیں لیکن آئینی بادشاہی میں ایک سہل الفہم خیال بھی ہوتا ہے اس میں کثیر التعداد خالی الذہن اشخاص کے لئے ایک قابل الفہم عنصر ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی چند متجسس طبیعتوں کے لئے پر پیچ قوانین وخیالات بھی موجود ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں کسی خاندان کا صاحب تخت وتاج ہونا ایک دلپذیر خیال بھی ہے۔ اس سے منصب شاہی کے فخر ومباہات معمولی طبقہ کے لوگوں کی سطح تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔ کوئی احساس انگریزوں کے اس جوش سے زیادہ طفلانہ نہیں ہوسکتا جو شہزادہ ولیعہد کے عقد کے وقت ظاہر ہوا۔ خالص کاروباری نظریہ سے جو شے یقیناً ایک معمولی سی بات تھی اسے انھوں نے ایک اہم سیاسی واقعہ کا رنگ دیدیا۔ اگر انسان کی عام فطرت جیسی ہے اور جیسی اس کے ہونے کی توقع ہے اس کے لحاظ سے کوئی احساس اس سے زیادہ حسب حال نہیں ہوسکتا تھا۔ نسل انسانی کے کم ازکم نصف حصہ یعنی عورتوں کو ایک وزارت کے بہ نسبت ایک عقد کا پچاس گونہ زیادہ خیال ہوتا ہے۔ چند زاہدان خشک کو چھوڑ کر اور تمام ہی لوگ ایسے ہیں جو یہ پسند کرتے ہیں کہ پر صعوبت دنیا کے بے کیف مناظر پر ایک لحہ کے لئے کسی دلپذیر تازگی وجدت کا ایک عکس پڑ جائے۔ کسی شہزادے کا عقد عالمگیر واقعہ کا

ایک شاندار مظہر ہے اور اس حیثیت سے یہ نوع انسان کو باہم مضبوطی کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے۔ ہم دربار کی گشتی پر ہنستے ہیں، مگر یہ خیال کیجئے کہ کتنے لوگ اس "گشتی" کو پڑھتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ نہیں ہے کہ اس میں کیا ہوتا ہے بلکہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ کن لوگوں کو یہ مخاطب کرتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مسٹر لنکن کے نام ملکہ کے خط سے اہل امریکا اس سے بہت زیادہ خوش ہوئے جتنا حکومت کے کسی اور کام سے خوش ہوئے ہوں پریشاں کن اور صبر شکن کاروباری معاملات کے اندر جن معاملوں میں پریشانی و اضطراب پیدا ہوسکتا ہو وہاں یہ سلسلہ قابل الفہم احساس کا ایک بدیہی عمل تھا۔ شاہی خاندان اس قسم کے دلچسپ و خوشگوار واقعات کے باعمل اضافہ سے سیاسیات کو شیریں بنادیتا ہے۔ وہ حکومت کے کاروبار میں بے تعلق واقعات کو داخل کر دیتا ہے گروہ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو لوگوں کے دلوں سے کلام کرتے اور ان کے خیالات کو متوجہ کر لیتے ہیں۔

قصہ کوتاہ، شاہی وہ حکومت ہے جس میں قوم کی توجہ ایک شخص واحد پر مرکوز ہو جاتی ہے جس سے دلچسپ افعال صادر ہوتے رہتے ہیں اور جمہوریت وہ حکومت ہے جس میں یہ توجہ بہت لوگوں میں منقسم ہو جاتی ہے جو سب کے سب غیر دلچسپ کام کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا جب تک انسان کا دل قوی اور اس کی قوت استدلال کمزور ہے اسوقت تک شاہی کو استحکام حاصل رہیگا کیونکہ وہ عام وسعت یافتہ احساس پر موثر ہوتی ہے اور جمہوریتیں کمزور رہیں گی کیونکہ وہ قوت استدلال پر اثر ڈالتی ہیں۔

ثانیاً یہ کہ انگلستان کی بادشاہی انگریزی حکومت کو مذہب کی قوت کی طرح بھی تقویت پہنچاتی ہے۔ یہ کہنا آسان نہیں ہے کہ ایسا کیوں ہوا ہر ایک تربیت یافتہ عالم مذہب یہ کہیگا کہ جو شخص کسی جمہوری سلطنت میں پیدا ہوا ہو اس پر اس جمہوریت کی اطاعت ایسی ہی لازم ہے جیسے اس شخص پر اپنے بادشاہ کی اطاعت واجب ہے جو کسی شاہی سلطنت میں پیدا ہوا ہو، مگر انگریزی قوم کے سواد اعظم کا خیال ایسا نہیں ہے۔ وہ وفاشعاری کے حلف سے اتفاق رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ملکہ کی اطاعت ان پر واجب ہے اور بغیر ملکہ کے صرف قانون کی اطاعت کرنے کا خیال انھیں ایک پریشان سا خیال معلوم ہوتا ہے۔ ازمنۂ سابقہ میں انگریزی دستور نامکمل تھا اسوقت حکومت کے صرف ایک حصہ کے متعلق یہ خیال تقدیس مضرت رساں تھا۔ تمام حصص اپنے لئے جدوجہد کر رہے تھے اور یہ ضروری تھا کہ ہر ایک کو پوری نشوونما حاصل ہو

مگر توہم پرستی نے یہ حکم لگایا کہ ایک حصہ تو جسقدر چاہے نشو و نما حاصل کرے اور کوئی دوسرا حصہ اس کی اجازت کے بغیر بڑھنے نہ پاوے۔ تمام شاہ پرست فریق نے یہ کہدیا کہ بادشاہ جو کچھ چاہے کرے مگر انکا فرض ہے کہ وہ بادشاہ کی اطاعت کریں۔ بادشاہ کی "بے چون وچرا اطاعت" ہونا چاہئے تھی۔ اور بادشاہ کے سوا کسی اور کو نہ ہبا طلب اطاعت کا حق حاصل نہیں تھا۔ بادشاہ "خدا کا نصب کردہ" تھا اور کسی دوسرے کو یہ منصب مطلقاً نصیب نہیں ہوا تھا، پارلیمنٹ قوانین، مطابع، سب انسانی ادارات تھے مگر شاہی ایک ربانی تنظیم تھی، دستور سلطنت کے ایک حصہ کو ناواجب فوقیت دیدی گئی تھی اور اس سے کل حصص کی ترقی رک گئی تھی۔

"انقلاب" کے بعد یہ مضرت رساں احساس بہت کمزور ہوگیا، بادشاہوں کے سلسلہ کو مجوب الارث اولاً بہت ہی قطعی ہوا، اگر کسی کو کوئی غیبی حق حاصل تھا تو یہ صاف عیاں ہے کہ وہ حق جیمز دوم کو حاصل تھا۔ اگر انگریزوں کے فرائض میں یہ امر داخل تھا کہ کسی ایک شخص کی اطاعت کریں خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ کرے تو وہ شخص جیمز دوم ہی تھا۔ اگر فطری موروثی حق کسی بادشاہ میں موجود تھا تو وہ خاندان اسٹوارٹ کا بادشاہ تھا جسے تاج و تخت موروثی حق کی بنا پر ملا تھا، نہ کہ انقلاب کے بنائے ہوئے اس بادشاہ میں جسے تاج و تخت پارلیمنٹ کی رائے سے حاصل ہوا تھا۔ ولیم سوم کے تمام دوران حکمرانی میں عام طور پر زبانوں پر یہ جاری تھا کہ ایک بادشاہ ہے جسے انسان نے بنایا ہے اور ایک دوسرا بادشاہ ہے جسے خدا نے بنایا ہے۔ جو بادشاہ حکمرانی کر رہا تھا ان سے کسی طرح بھی وہ مقدس وفاداری میسر نہیں تھی جس پر وہ (اپنی حکومت کی بنا) قائم کرسکے۔ وہ اگرچہ واقعتہً حکمران تھا مگر نظریۂ تقدس کے بموجب فرانس میں بھی ایک بادشاہ تھا جسے تخت انگلستان کا حق حاصل تھا، انگریزی قوم کے لئے جبلی سمجھ صاف اور جن کا تخیل سست ہے یہ امر نہایت دشوار تھا کہ وہ ایک غیر ملک میں رہنے والے سرگرداں شخص کے لئے کوئی زبردست احساس تعظیم و تکریم قائم رکھ سکیں، وہ ایک فرانسیسی بادشاہ کے زیر سایہ رہتا تھا، جو کام وہ کرتا تھا وہ بالعموم غیر دانشمندانہ ہوتا تھا اور جس کام کو وہ ترک کر دیتا تھا وہ اکثر عاقلانہ ہوتا تھا۔ جوں ہی ملکہ این کے دور حکومت کا آغاز ہوا معاً خیالات میں ایک تغیر رونما ہوگیا۔ تقدس شاہی کا قدیم خیال اس کی ذات سے وابستہ ہونے لگا۔ بیشک ایسے مشکلات درپیش تھے جو اکثروں کو شش و پنج میں ڈال دیتے، مگر کوئی انگریز جس نے کوئی بات دل پر رکھ لی ہو اُسے آسانی سے دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔ ملکہ این کا بھائی زندہ تھا،

اس کا باپ زندہ تھا اور وراثت کے ہر ایک قاعدے کے بموجب انکا حق اس سے فائق تھا، مگر بہت سے لوگوں نے دونوں کے حقوق کو نظر انداز کردیا۔ وہ کہتے تھے کہ جیمز دوم فرار ہوگیا اور اس لئے اس نے انخلاع کردیا ہے حالانکہ اس نے راہ فرار اسیوجہ سے اختیار کی تھی کہ اسپر چاروں طرف سے تشدد ہونے لگا تھا اور اسے لوگ خوف دلا رہے تھے اور پھر کوئی دن نہیں گزرتا تھا کہ وہ اپنی رعایا کی وفاداری کا دعویٰ انکر تا رہا ہو۔ "مدعی سلطنت" کی نسبت کہا جاتا تھا کہ وہ جیمز کی جائز اولاد نہیں ہے حالانکہ اس کی ولادت اسی شہادت سے ثابت تھی جسے ہر ایک عدالت قبول کرلیتی۔ انگریزی قوم کسی مقدس بادشاہ کے وجود سے "خالی" ہوگئی تھی اور اس لئے اس نے کسی ایسے نئے بادشاہ کے بنانے کے لئے نہایت سخت کوشش کی لیکن واقعات ان کی حد قوت سے زیادہ سخت وصعب تھے، وہ اس امر پر آمادہ اور اس کے خواستگار تھے کہ ملکہ این کو ایک نئے شاہی خاندان کا مورث اعلیٰ (بانی) بنا دیں، وہ اس کے باپ کے حقوق اور اس کے بھائی کے حقوق کو نظر انداز کردینے کے لئے تیار تھے، مگر وہ اس امر واقعہ سے چشم پوشی نہیں کرسکتے تھے کہ اس نازک وقت میں ملکہ کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ کسی وقت میں اس کے تیرہ بچے تھے مگر وہ سب اس کی زندگی ہی میں نذر اجل ہوچکے تھے اور اس لئے یہ ضروری تھا کہ خاندان اسٹوارٹ کیطرف رجوع کیا جائے یا پارلیمنٹ کے منظور شدہ قانون کی رو سے کوئی نیا بادشاہ بنایا جائے؛

"قانون انتظام جانشینی" کے بموجب، جسے وھگوں نے منظور کرایا تھا، ہانوور کی شہزادی سوفیا کے اخلاف وارث تاج قرار پاگئے۔ یہ شہزادی جیمز اول کی ایک بیٹی کی چھوٹی لڑکی تھی۔ اس سے مقدم جیمز دوم، اس کا بیٹا، چارلس اول کی ایک بیٹی کی اولاد اور خود اس کی ماں کے بڑے لڑکے سب موجود تھے، مگر وھگوں نے ان سب کو نظر انداز کردیا کیونکہ وہ کیتھولک تھے اور شہزادی سوفیا کو منتخب کیا جس میں، اگر کوئی وصف تھا تو بس یہی کہ وہ پروٹسٹینٹ تھی۔ بلاشبہ یہ انتخاب ایک مدبرانہ انتخاب تھا مگر یہ انتخاب زیادہ مقبول عام نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ کہنا کہ انگریزی قوم کا یہ فرض تھا کہ وہ خاندان ہانوور کی اطاعت کرے بجز اس کے اور ہر طرح پر غیر ممکن تھا کہ اس اصول کو تسلیم کرلیا جائے کہ قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خود اپنے حکمران کا انتخاب کرے اور شاہی کو اس کے پرجلال تقدس کی بلند و یگانہ منزلت سے پست کرکے دوسرے کارگزار ادارات کے درجہ پر پہنچا دیا جائے۔ اگر بادشاہ ایک ایسا کارگزار سرکاری عامل ہے جسے تبدیل کیا جاسکتا اور اس کی جگہ پر دوسرا شخص نصب کیا جاسکتا ہے تو پھر آپ اسے پراسرار ہیبت و حیرت کے ساتھ نہ دیکھینگے

اور اگر اس کی پرستاری آپ پر واجب ہے تو آپ ہرگز اسے بدل نہیں سکتے۔ یہی وجہ تھی کہ جارج اول اور جارج دوم کے تمام زمانۂ حکمرانی میں تاج کی تائید میں مذہبی وفاداری کا احساس کلیۃً مفقود ہوگیا تھا۔ بادشاہ کے اختیارات خاص کی تائید کے لئے کوئی زبردست جماعت موجود نہ تھی۔ ٹوری جو بالطبع اس کی تائید کرتے وہ اس بادشاہ کو جو فی الواقع حکمراں تھا، ناپسند کرتے تھے اور وھگ اپنے عقیدے کے بموجب بادشاہ کے منصب ہی کو نامطبوع سمجھتے تھے جارج سوم کی تخت نشینی کے وقت تک تاج کے سب سے زبردست مخالف اس کے فطری دوست یعنی دیہات کے شرفا اور مجلس زرعی اضلاع کے نمایندے تھے، حالانکہ وفاداری اگر کہیں ہے تو سب سے زیادہ انھیں اضلاع میں ہے۔ لیکن جارج سوم کی تخت نشینی کے بعد عام خیال اسی نقطہ پر آگیا جو ملکہ این کے وقت میں تھا۔ انگریز اس نوجوان شہزادے کو بادشاہوں کے ایک مقدس سلسلہ کے آغاز کے لئے اسی طرح قبول کرنے پر آمادہ تھے جیسے وہ اس بڈھی بیگم کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوے تھے جو اس کی جدۂ ثالثہ کے بھائی کی پوتی تھی۔ یہی حال اسوقت ہے۔ اگر آپ ملکہ کی رعایا سے دریافت کریں تو ان میں بیشمار افراد یہ نہ کہیں گے کہ ملکہ پارلیمنٹی استحقاق اور این کے ساتویں سال جلوس کے چھٹے قانون (۶، این باب ۷) کے موافق حکمراں ہے بلکہ وہ کہینگے کہ ملکہ "خدا کی عنایت" سے حکمراں ہے۔ ان کا یقین ہے کہ اس کی اطاعت کا ایک غیبی فرض ان پر عاید ہوتا ہے۔ جب ملکہ کا خاندان صاحب تخت و تاج ہوا ہے، اسوقت یعنی بادشاہت کے ناقابل انفکاک حق کا دعوی کرنا ایک طرح کی غداری تھی کیونکہ ایسا کرنا اس کہنے کے برابر تھا کہ ایک دوسرے خاندان کا حق ان کے خاندان سے برتر ہے مگر اب واقعات انسانی کی حیرت انگیز رفتار میں پڑکر وہی احساس ملکہ کے لئے سب سے زیادہ قابل اعتماد تائید بن گیا ہے۔

لیکن یہ خیال کرنا بڑی غلطی ہوگی کہ جارج سوم کے تخت نشین ہوتے ہی موروثی وفاداری کا طبعی احساس ایسا ہی کارآمد بن گیا جیسا اسوقت ہے۔ اس احساس میں زور آنے لگا تھا مگر ہنوز یہ احساس کچھ ایسا کارآمد نہیں ہوا تھا۔ اس احساس سے جسطرح اتنا وسیع نفع ہوا ہے اسی طرح اتنا کثیر نقصان بھی ہوا ہے کہ یہ امر پوری طرح سے معرض بحث میں آسکتا ہے کہ بحیثیت مجموعی یہ احساس مفید تھا یا مضر۔ اپنی زندگی کے بیشتر حصہ میں جارج سوم ایک طرح کا "مقدس سنگ راہ" تھا۔ وہ جو کچھ کرتا تھا اس میں تمام دوسرے لوگوں کے کاموں کی بہ نسبت ایک طرح کا تقدس ہوتا تھا اور یہ تکلیف دہ صورت برابر واقع ہوتی رہی کہ وہ بالعموم غلطی پر ہوتا تھا۔ اس کی نیت ایسی ہی نیک ہوتی تھی جیسی کسی دوسرے شخص کی ہوسکتی ہے اور وہ اپنے ملک کے کام پر اسی طرح توجہ کرتا جس طرح کوئی محرر

جیسے روٹیوں کا سہارا ہو اپنے دفتر کے کام پر توجہ کرے مگر وہ دل کا چھوٹا تھا، اس کی تعلیم محدود تھی، اور اس کا زمانہ ایک تغیر پذیر زمانہ تھا، لہذا وہ ہمیشہ ان کاموں میں رخنہ ڈالتا رہتا تھا جو ہونا چاہئے تھے اور ان کاموں کو طول دیتا رہتا تھا جو نہ ہونا چاہئے تھے۔ اس نے اپنی وزارتوں میں سے نصف وزارتوں پر حملہ کیا اور اس کا یہ فعل اگرچہ مذموم تھا مگر تقدس کو لئے ہوئے تھا، اور جب فرانسیسی انقلاب نے تمام دنیا میں دہشت طاری کر دی اور عمومیت کو "ناپاک" ثابت کر دیا تو انگلستان کی تقویٰ پسندی نے جارج سوم کو اپنا قبلہ وفا بنا لیا اور اسے اس سے گونہ طاقت حاصل ہو گئی۔ بادشاہی اب اپنے مذہبی شرف قبول کی وجہ سے انگریزوں کے تمام انتظام کی توثیق کرتی ہے لیکن جارج سوم کے زمانہ میں وہ خود اپنی توثیق سے زیادہ اور بہت ہی کم کچھ کر سکتی تھی۔ اسوقت بادشاہی بیشمار خلقت کی طفلانہ اطاعت کو حاصل کر کے تمام دستور سلطنت کو بے انتہا تقویت پہنچا رہی ہے۔ اس زمانہ میں وہ سب سے الگ تھی" اس نے کل تقدس کو اپنے ہی اندر جذب کر رکھا تھا، اور نظم سلطنت کے تمام باقی حصہ کو محض افادیت کے درشت معیار پر پورے اترنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔

بادشاہی کی وجہ سے اس خوبی کے ساتھ تمام انگریزی سلطنت کو یہ تقدس کیونکر حاصل ہوتا ہے اس کی خاص الخاص وجہ کو اس امر عجیب میں تلاش کرنا چاہئے جس پر اہل امریکا اور بہت سے افادی مسکرا دینگے۔ "یانکی" (اہل امریکا) اسے "مدزائد" کہتے اور اس منفرد و تابناک عنصر پر ہنستے ہیں۔ وہ نپولین کے اس قول کو پیش کرتے ہیں کہ وہ "بیٹھے بیٹھے موٹا ہونا نہیں چاہتا"۔ نپولین نے یہ الفاظ اسوقت کہے تھے جب اس نے سی۔ ایس کے مرتبہ دستور سلطنت میں والی اعظم ہونے سے انکار کر دیا تھا، والی اعظم کا عہدہ آئینی بادشاہی سے ماخوذ تھا اور بقول تی ایر اس کی نقل بہت خوبی سے کی گئی تھی، مگر اس قسم کے اعتراضات بالکل غلط ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابے سی یس کے دستور سلطنت میں یہ امر قریب بہ محال تھا کہ جن قوموں میں قدیم سے شاہی قائم تھی ان کے آئینی بادشاہ کے منصب کے مانند کوئی ایسی نئی تنظیم تجویز کیجاتی جسے نہ کسی قسم کا موروثی تقدس حاصل ہو اور نہ اسے کسی مذہب نے متبرک بنا دیا ہو۔ اس قسم کی تنظیم سے یہ توقع تو بہت مستبعد ہے کہ وہ اتنا متبرک ہو کہ اپنے آس پاس کی چیزوں پر عظمت و جلال کا سایہ ڈال دے، وہ اپنے حادث النوقوع اور مصنوعی ہونے کی وجہ سے خود اپنے لئے بھی عظمت و جلال نہیں پیدا کر سکتا۔ اس امر محال میں اگر کوئی صورت اضافہ کی تھی تو وہ یہی تھی کہ ایسے بمصرف اور ملمع کار تقدس کے منصب کو نپولین کے سے شخص کے سامنے پیش کیا گیا جو تمام فرانس میں سب سے زیادہ مستعد شخص تھا

اور جس میں کام کرنے کی سب سے زیادہ قابلیت موجود تھی۔ اس قابلیت میں تقدس کا شائبہ بیشک نہیں تھا مگر یہ قابلیت کام کے لئے قطعاً وحتماً موزوں تھی لیکن سی۔ ایس کی اسی لغزش سے حقیقی شاہی کی خوبیوں پر سب سے عمدہ روشنی پڑتی ہے، بادشاہ (جب اپنے منصب کو) رحمت خدا کی طرف محمول کر سکتا ہے تو پھر بہترین صورت یہ ہے کہ اسے ہاتھ نہ لگایا جائے۔ یہ صاف واضح ہو جانا چاہئے کہ وہ غلطی نہیں کرتا۔ اسے حقیقی کارروائیوں سے بہت زیادہ قریب نہ ہونا چاہئے۔ اسے سب سے الگ اور منفرد رہنا چاہئے۔ انگلستان کی شاہی کے فرائض چونکہ زیادہ تر نظروں سے پوشیدہ ہیں اس لئے اس سے یہ شرط پوری ہو جاتی ہے۔ یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ احکام نافذ کرتا ہے مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ جد وجہد کرتا ہے۔ وہ بالعموم سر ستور کی طرح پنہاں رہتا ہے اور کبھی کبھی اظہار نمائش کے طور پر جلوہ نما ہوتا ہے مگر کسی صورت میں بھی اس کی جانب سے جہد مفرط کا اظہار نہیں ہوتا۔ قوم مختلف فریقوں میں منقسم ہے مگر تاج کو کسی فریق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حکومت کے کاروبار سے اس کا بظاہر علیحدہ رہنا ہی وہ سبب ہے جو اسے عداوت وخباثت دونوں سے دور اور اسکی اس پر اسرار حالت کو محفوظ رکھتا ہے جو اسے اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ متخاصم فریقوں کی محبت والفت کا جامع ہو جائے اور جن لوگوں کو ابھی تک ایسی مکمل تعلیم حاصل نہیں ہوئی ہے کہ انھیں کسی ظاہری علامت کی ضرورت نہ رہے ان کے لئے وہ اتفاق باہمی کے مرکز کا کام دے۔

ثالثاً۔ ملکہ انگریزی نظم معاشرت کی سرتاج ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو وزیر اعظم ملک میں اول شخص ہو جائے گا۔ وزیر اعظم اور اس کی بیگم غیر ممالک کے سفراور وقتاً فوقتاً غیر ممالک کے بادشاہوں کی مہمانداری کرینگے اور ملک میں سب سے اعلیٰ ضیافتیں انھیں کو دینا پڑیں گی۔ وہ اور اسکی بیگم اظہار نمائش کی زندگی کے سرگروہ ہونگے اور اقوام ممالک غیر کی نظروں میں وہی انگلستان کی نمائندگی کرینگے۔

یہ بہت آسان ہے کہ کسی ایسی دنیا کا تصور قائم کیا جائے جس میں یہ تغیر زیادہ خرابی کا باعث نہ ہو۔ ایک ایسا ملک جس میں لوگوں کو زندگی کی ظاہری نمائش کی پروا نہ ہو، جہاں لوگوں کی ذہانت وفطانت میں حشمت وجاہ کو دخل نہ ہو اور ان کی نظر محض معاملات کے نتائج حاصلہ پر رہتی ہو اس ملک میں یہ ایک معمولی سی بات ہوگی کہ آیا لارڈ اور لیڈی ڈاربی غیر ممالک کے سفرا کو باریاب کرتے ہیں یا لارڈ اور لیڈی پامرسٹن، یہ چنداں خیال کرنے کی بات نہ ہوگی۔ آیا

یہ اشخاص سب سے زیادہ نفیس ضیافتیں دیتے ہیں یا نہیں اس کی اہمیت صرف انھیں لوگوں تک محدود ہوگی جو ان ضیافتوں میں شریک ہوتے ہوں۔ فلسفیوں کی ایک غیر متاثر قوم اس کا مطلق خیال نہیں کرتی کہ زندگی کے لواحق ظاہری کا سرانجام کس طرح ہوتا ہے۔ جب تک آپ کو اشیائے نمائش کی فکر نہ ہو اسوقت تک آپکو اس کی پروا نہیں ہوتی ہے کہ نمائش کرنے والا کون ہے۔

لیکن غالباً دنیا کی تمام قوموں میں انگریزوں کی قوم میں خالص فلسفی قوم بننے کا ذوق سب سے کم ہے۔ انگریزوں کے لئے یہ ایک بہت ہی مہتم بالشان معاملہ ہوگا کہ وہ اپنی دنیا کے ظاہری سرگروہ کو ہر چوتھے پانچویں برس بدل دیا کریں۔ انگریز اب بلند ترین حوصلہ مندی کے لئے ممتاز نہیں ہے ہیں مگر ان میں پست ترقسم کا حوصلہ اور رشک وحسد بہت کچھ موجود ہے۔ دارالعوام میں بکثرت ایسے لوگ بھرے ہوتے ہیں جو بقول عام صرف ''معاشری اغراض'' کے لئے دارالعوام میں داخل ہوتے ہیں ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کے اہل خاندان ایسی ضیافتوں اور بزموں میں شریک ہوسکیں جنکی شرکت کسی اور طرح پر ناممکن ہے ایک صاحب فکر نے اسے بے حقیقت شان ونمود سے تعبیر کیا ہے اگر ہزارہا اشخاص ارکان پارلیمنٹ کو اسی بے حقیقت نام ونمود کے لئے نظر رشک سے دیکھتے ہیں اگر اس نظر افروز زندگی کا اعلیٰ ترین منصب مقابلہ عام کے لئے کھول دیا جائے تو یہ پست قسم کا رشک وحسد خطرناک حد تک بڑھجائے گا۔ سیاسیات ایک ایسا انعام پیش کردیگی جو بنی نوع انسان کے لئے ضرورت سے زیادہ خیرہ کن ثابت ہوگا۔ پر فطرت ذلیل اشخاص اس کے لئے کوشش کرینگے اور بد عقل ذلیل اشخاص اس پر حسد کرینگے۔ جس شے کو خالصۃً پبلک زندگی کہتے ہیں اسوقت بھی اس میں ایک خطرناک امتیاز پیدا ہوگیا ہے۔ اخبارات روزانہ اور علی الدوام ایک خاص نمایاں ہستی کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس کے عادات واطوار پر رائے زنی کرتے، اس کے جزئیات امور کو شمار کرتے، اس کے مافی الضمیر کی تنقیح کرتے اور اس کی آیندہ روش کے متعلق پیشینگوئی کرتے ہیں۔ دنیائے ادب، دنیائے حکمت دنیائے فلسفہ نہ صرف عظمت ووقعت کے لحاظ سے دنیائے سیاسیات کے مقابلہ میں ہیچ ہیں بلکہ سیاسیات کے سامنے انھیں اس نام سے موسوم کرنا ہی مشکل ہے۔ اخبارات ان کا کچھ ذکر نہیں کرتے اور ذکر کر بھی نہیں سکتے'' اور جو حال اخباروں کا ہے وہی حال ان کے پڑھنے والوں کا ہے۔ وہ یہ یقین کرنے لگتے ہیں کہ جن لوگوں کے تذکرے برابر اخبارات میں ہوتے رہتے ہیں، وہ دوسرے لوگوں کے بہ نسبت زیادہ ہوشیار، زیادہ قابل، ورنہ زیادہ بلند رتبہ تو ضرور ہوتے ہیں اور

یہ یقینی اثر ہے کسی شے کے (علی الدوام) پیش نظر رہنے کا جسے کوئی روک نہیں سکتا۔ ہمنے ایک شخص کو یہ کہتے سنا ہے کہ وہ میں نے بیس برس تک کتابیں لکھیں اور میں کچھ بھی نہ ہوا۔ میں پارلیمنٹ میں داخل ہوگیا اور قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ پر نشست کروں میں کچھ کا کچھ ہوگیا!! انگریز بد برین ہی وہ اشخاص ہیں جو عام انگریزوں کے دلوں میں بسے رہتے ہیں وہی اس منظر کے ایکٹر ہیں اور قدر شناس تماشائیوں کے لئے یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ ان کا پسندیدہ سانگ یا خود ان لوگوں سے بڑھکر نہیں ہے۔ اس موجودہ زمانہ اور اس ملک میں بہت خطرناک ہوگا کہ اس قوت میں جو پہلے ہی سے اندیشہ ناک حد تک ترقی کر چکی ہے، ذرا بھی اضافہ مزید کیا جائے۔ اگر یہ صورت پیدا ہو جائے کہ اعلیٰ ترین معاشری منصب کے لئے دارالعوام میں لگا ہوا کرے تو پھر دارالعوام میں معاشری حوصلہ مندوں کی تعداد حد شمار سے خارج ہو جائیگی اور ان کے اشتیاق بے پایاں کی کوئی حد نہ رہے گی۔

اسباب وعلل کے بہت ہی خاص طور پر جمع ہو جانے نے اس وصف کو انگریزی نظم معاشرت کی ایک نہایت ہی نمایاں خصوصیت بنادیا ہے۔ ازمنۂ وسطی اپنے بعد تمام یورپ میں ایسے نظمہائے معاشری چھوڑ گئے ہیں جنکے سرتاج شاہی دربار تھے۔ حکومت ہی کو تمام نظم معاشرت، تمام تعلقات باہمی اور تمام زندگی کا سرگروہ بنا دیا تھا۔ ہر شے بادشاہ کی اطاعت کا اظہار کرتی اور ہر شے بادشاہ ہی کے اردگرد ترتیب پاتی تھی یہاں سے یہ قرار پاتا تھا کہ بادشاہ کے بعد قریب تر جو شے ہے وہ سب سے بڑھی ہوئی ہے اور بعید ترین شے سب سے کمتر ہے۔ یہ خیال کہ حکومت کا سرتاج "نظم معاشرت کا سرتاج ہے" انسان کے تصورات میں اسدرجہ راسخ ہوگیا ہے کہ صرف چند فلسفی ہی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک تاریخی واتفاقی امر ہے۔ گو اس میں شبہہ نہیں کہ جب اس معاملہ کی تحقیق کیجاتی ہے، تو یہ نتیجہ قطعی بلکہ بدیہی معلوم ہوتا ہے۔

اولاً یہ کہ نظم معاشرت کو بہ حیثیت نظم معاشرت کے بالطبع کسی سرگروہ کی مطلق ضرورت نہیں ہے اگر اس معاملہ کو خود نظم معاشرت پر معلق کر دیا جائے تو اس کی ہیئت ترکیبی شاہی کے بجائے اعیانی ہوگی۔ جس مفہوم میں ہم اسوقت نظم معاشرت کا ذکر کر رہے ہیں وہ تفریح طبع اور مکالمات باہمی کے لئے لوگوں کا ایک اتحاد ہے۔ شادی بیاہ کا سلسلہ جس طرح پر ہوتا ہے وہ نظم معاشرت کے اندر ایک وقوعہ کے طور پر وجود پذیر ہوتا رہتا ہے مگر نظم معاشرت کا عام واہم تعلق مکالمات اور لطف اندوزی ہی ہے۔ اس میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جسکے لئے

ایک واحد اعلیٰ سرگروہ کی ضرورت لاحق ہو۔ یہ ایک ایسا مشغلہ ہے جس میں لازماً کسی ایک شخص کو سب پر تسلط نہیں حاصل ہوتا۔ نظم معاشرت فطرتاً "دس ہزار بلند رتبہ" اشخاص مہیا کر دیتی ہے شخصوں اور خاندانوں کی ایک خاص تعداد جنہیں مساوی درجہ کی تعلیم و تربیت، ایک سے قوے اور ایک سے خیالات ہوتے ہیں وہ سب ایک سطح پر آجاتے ہیں اور یہ سطح ایک بلند سطح ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنی جرأت، اپنی تعلیم و تہذیب اور اپنے "علم مجلس" کی وجہ سے اپنے کو دوسروں سے بلند کر لیتے ہیں وہ "اول و اقدم خاندان" بن جاتے ہیں اور دوسرے تمام خاندان ان سے فروتر ہو جاتے ہیں۔ گروہ آپس میں زیادہ تر ایک ہی سطح پر رہنے کی طرف مائل رہتے ہیں؛ وہ سب کے سب یا ان میں سے متعدد اشخاص کسی ایک شخص کو سب سے فائق تسلیم نہیں کرتے۔ یونان و اطالیہ میں جس نظم معاشرت نے ترقی کی ہے اور جو اب امریکہ یا استعماری امصار و دیار میں ترقی کر رہی ہے وہ یہی نظم معاشرت ہے نظم معاشرت کیلئے ایک "سرتاج" کا خیال ایک لازمی خیال ہونا تو کجا بہت سے دوروں میں، اس کا ایک قابل الفہم خیال ہونا بھی خالی از دقت نہیں تھا۔ آپ اس خیال کو سقراط کے ذہن نشین نہیں کر سکتے تھے۔ وہ آپ سے یہ کہتا کہ "اگر آپ مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ میرے ہمجنسوں میں سے کوئی ایک شخص حاکم اعلیٰ ہے مجھے اس کی اطاعت واجب ہے تو میں آپ کی اس بات کو سمجھتا ہوں اور آپ بجا کہتے ہیں یا یہ کہ کوئی شخص پجاری ہے اور وہ دیوتاؤں کے سامنے نذر و نیاز پیش کرتا ہے جسے میں یا کوئی اور شخص جو پجاری نہ ہو انجام نہیں دیسکتا، تو میں بدستور آپکی بات کو سمجھتا اور آپ سے اتفاق کرتا ہوں، لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ کسی ایک شہری میں کوئی خفیہ کشش ایسی ہے جس سے اس کے الفاظ میرے الفاظ کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہو جاتے ہیں اور اس کا مکان میرے مکان سے افضل ہو جاتا ہے، تو میں اس خیال میں آپ کا ساتھ نہیں دیسکتا اور اگر آپ اپنے منشا کی تشریح کریں تو میرے لئے باعث مسرت ہوگا۔" ولو فرضنا نظم معاشرت کے سرگروہ کا تصور ایک طبعی تصور ہو بھی تو بھی اس سے بالیقین یہ لازم نہیں آتا کہ ملکی حکومت کا سرگروہ بھی وہی شخص ہو۔ نظم معاشرت کو فی نفسہ ملکی دستور سلطنت سے اس سے زیادہ واسطہ نہیں ہے جتنا اسے کلیسا کے نظم سے ہے۔ تفریح طبع کے لئے مردوں اور عورتوں کے کسی اجتماع و انتظام سے ہو بہو مطابق ہونا اس سے زیادہ ضروری نہیں ہے کہ یہ اجتماع و انتظام ان کے مذہبی اغراض کے اجتماع و انتظام سے مطابق ہو۔ اسے فی نفسہ سلطنت سے اس سے زیادہ سروکار

نہیں ہے جتنا اسے کلیسا سے سروکار ہے، وہ قوے جو کسی شخص کے ایک بڑے حکمراں بننے کے لئے موزوں ہوں وہ نظم معاشرت کے قوے نہیں ہیں۔ بعض بڑے بڑے حکمراں کرامول کی طرح ناقابل فہم یا نپولین کی طرح شتاب کار یا سر رابرٹ والپول کی طرح درشت خو و تند مزاج ہو گزرے ہیں۔ دیوان خانوں کی خوش طبعی اور ہر خرفات اور دفتر کے سنجیدہ معاملات میں اتنا ہی بعد المشرقین ہے جتنا انسان کے کسی دو شغلوں میں ہونا ممکن ہے۔ دونوں کے ایک کرنے میں کسی قسم کا تقاضائے فطری نہیں معلوم ہوتا اس کا انجام ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ آپ نظم معاشرت کا سر گروہ ایسے شخص کو بنا دینگے جو باغلب وجوہ اپنی مجلسی خوبیوں کی وجہ سے ممتاز نہ ہوگا بلکہ اپنے مجلسی نقائص کی وجہ سے انگشت نما ہوگا۔ ان خیالات کی بہترین تفسیر "شاہی انگلستان کی تاریخ" ہے اس امر کی طرف کافی خیال نہیں منعطف ہوا ہے کہ انگریزوں کے نظم معاشرت میں ٹھیک اس طرح تغیر واقع ہوا ہے جس طرح انکے دستور سلطنت میں تغیر ہوا ہے۔ "بادشاہی" کے زیر سایہ جمہوریت قائم ہو گئی ہے۔ چارلس دوم واقعۃً نظم معاشرت کا سر گروہ تھا، اس کے وقت میں وہائٹ ہال بہترین مکالمات، بہترین وضع قطع اور اپنے وقت کے عشق و محبت کے سب سے زیادہ عجیب و غریب معاملات کا مرکز تھا اس سے نظم معاشرت کو بلند اخلاق کا کوئی حصہ نصیب نہیں ہوا مگر اس نے نا متناہی دلپذیریوں کی ایک مثال قائم کر دی تھی۔ اس نے لندن کے اعلیٰ طبقہ کے تمام خوش طبع عنصر کو اپنے اندر کھینچ لیا تھا۔ دربار ہی وہ نقطۂ اتصال تھا جو ہر ایک پر استعجاب شے کا مرکز بن گیا تھا۔ وہائٹ ہال ایک بے نظیر بزمگاہ تھا جس میں نہایت ہی پرفن و طرار عورتوں کا ایک گروہ بھی شامل کر لیا گیا تھا لیکن ہم جانتے ہیں کہ اب سب کچھ بدل گیا ہے۔ محل بکنگھم کو بزمگاہ سے اتنی ہی عدم مناسبت ہے جتنی اور کسی جگہ کو ہو سکتی ہے۔ دربار ایک علحدہ شے ہے جو لندن کی بقیہ دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہے اور جیسے لندن کے زیادہ مسرت آفرین حصہ سے بہت خفیف سا تعلق ہے پہلے دونوں جارج انگریزی زبان سے نابلد اور انگلستان کے نظم معاشرت کی ہدایت و رہبری کے بالکل ناموزوں تھے۔ ان دونوں کو دو ایک بد اطوار جرمانی عورتیں تمام لندن سے زیادہ محبوب و مرغوب تھیں جارج سوم میں معاشری خرابیاں نہیں تھیں مگر اسے معاشرتی مسرتوں کا بھی ذوق نہیں تھا۔ وہ اپنے اہل و عیال میں رہنے والا اور کام کرنے والا شخص تھا اور اسے پورے دن اچھی طرح کام کرنے کے بعد بکری کی ران اور بھوڑے سے شلجم بہتر سے بہتر خوش طبعی اور دلچسپ سے دلچسپ باتوں کے بہ نسبت زیادہ مرغوب خاطر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لندن کی سوسائٹی (London Society) اگرچہ ظاہر بہت

دربار کے زیر اثر رہی مگر واقعہ اس نے اپنی طبعی و عدیدی ہیئت اختیار کر لی۔ یہ وہی وہ دس ہزار والا اعلی الطبقہ ہو گئی ہے۔ اس میں اب فی الحقیقت شاہیت کا رنگ اس سے زیادہ نہیں ہے جتنا نیویارک کی سوسائٹی میں ہے۔ جلیل القدر بیگمات اب سوسائٹی کو اپنے رنگ ڈھنگ پر چلاتی ہیں اور اس معاملہ میں وہ خاص درباری دنیا کا کچھ ایسا لحاظ نہیں کرتیں۔ بزمگاہوں کی مخصوص مردانہ دنیا اور ان کے گرد و پیش کو اپنی روزانہ کی زندگی میں محل بکنگھم سے اس سے زیادہ غرض نہیں ہے جتنی غرض انہیں محل ٹوٹی لرنی سے ہے۔ بجا آوری آداب اور حضوری دربار کی باضابطہ رسمیں اب بھی قائم رکھی گئی ہیں "لیوی" اور "ڈرائنگ روم" کے نام اب بھی اس زمانہ کی یاد دلاتے ہیں جبکہ بادشاہ کی خوابگاہ اور ملکہ کا وہ خلوتخانہ "لندن کی زندگی کے مرکز بنے ہوئے تھے مگر اب انھیں معاشری خط و انبساط میں کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ دربار اب ایک طرح کی رسم ہیں جنھیں اس زمانہ میں جو سفید پوش شخص چاہے شریک ہو سکتا ہے۔ دربار کی "محفل رقص" میں لطف و مسرت کے امکان کا گمان کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے مگر یہ محفلیں بھی لندن کی جولانی کی بیشمار محفلوں میں غائب ہو جاتی ہیں۔ دقیق النظر مبصر بہت دنوں سے اس حالت کو دیکھ رہے تھے مگر اب عقد التاج کے انتقال سے یہ حقیقت ہر شخص پر صاف کھل گئی۔ اسوقت سے دربار میں لطف و مسرت کا دور برابر معطل سا رہا ہے بلکہ ایک وقت میں تو بالکل فنا ہو گیا تھا تاہم ہر کام حسب دستور انجام پاتا رہتا تھا چند اشخاص جن کے لڑکیاں نہیں تھیں اور روپیہ بھی انکے پاس کم تھا انھوں نے ضیافتوں وغیرہ کے کم کرنے کے لئے اسے ایک عذر بنا لیا اور اگر زیادہ نادار ہوئے تو بیرونجات ہی میں قیام کرنے لگے مگر (اس کے سوا اور طرح پر) بہ حیثیت مجموعی یہ فرق نظر نہیں آتا تھا۔ ملکہ محل تو جاتی رہی تھی مگر جتھا بدستور قائم تھا۔

خوش فکر و باریک بین مبصروں نے تھوڑے زمانہ سے انگریزی شاہی پر یہ اعتراض وارد کر دیا ہے کہ وہ کافی طور پر شاندار نہیں ہے۔ انھوں نے اس کا مقابلہ فرانسیسی دربار سے کیا ہے جو شان و نمائش میں انگریزی دربار سے بہتر ہے، جو ہر جگہ ایسی سطح پر رہتا ہے کہ اس پر نظر پڑے بغیر چارہ کار نہیں ہے اور جو بلا روک فرانس کی ہر شے سے بے حد و نہایت شاندار ہے۔ انھوں نے یہ کہا ہے کہ "قدیم زمانہ میں انگریزی دربار قوم کا بہت زیادہ روپیہ لیتا تھا اور اسے بری طرح خرچ کرتا تھا لیکن اب کہ اس پر یہ اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ وہ روپیہ کو اچھی طرح صرف کرے گا، تو وہ قوم سے کافی روپیہ نہیں لیتا۔" دربار کے مطلقاً ہونے کے متعلق بھی دلائل موجود ہیں، اور دربار کو شاندار بنانے کے لئے بھی دلائل موجود ہیں مگر ایک تبدل سے دربار کے قائم رکھنے کے متعلق کوئی دلیل نہیں ہے

جب آپ شان وشکوہ سے آنکھوں کو خیرہ کردینا چاہتے ہوں تو اس غرض کے لئے دس لاکھ خرچ کردینا اس سے بہتر ہے کہ آپ اظہار شان وشکوہ کی کوشش میں ساڑھے سات لاکھ خرچ کریں اور پھر بھی شان وشکوہ نہ پیدا ہو"۔ اس نظریہ میں کچھ نہ کچھ اصلیت کا امکان ضرور ہے، ممکن ہے کہ اصلیت یہ ہو کہ انگلستان کے دربار میں اس درجہ نمائش وآرائش نہیں ہے جس کے دیکھنے کی ہمیں آرزو ہو مگر انگریزی دربار اور فرانسیسی دربار کا کبھی بھی باہم مقابلہ نہیں کرنا چاہئے۔ شہنشاہ فرانس ملکۂ انگلستان کے بہ نسبت ایک دوسرے ہی خیال کی نمایندگی کرتا ہے۔ وہ سلطنت کا تاج نہیں ہے بلکہ وہ خود سلطنت ہے۔ اس کی حکومت کا نظریہ ہے کہ فرانس میں ہر شخص برابر ہے اور شہنشاہ کی ذات میں اصول مساوات مجسم ہو کر ظاہر ہوا ہے۔ شہنشاہ کو آپ جسقدر بڑھائینگے اسی قدر دوسروں کو گھٹائینگے اور اس طرح ان میں اور زیادہ مساوات پیدا کرینگے۔ شہنشاہ کو اس وجہ سے بلند کیا جاتا ہے کہ دوسرے پست ہو جائیں، لیکن انگریزی شاہی کا اصول اس سے بالکل ہی مغائر ہے اگر وہ عام اکھاڑے میں اتر آئے تو جس طرح سیاسیات میں اس کا خاص نفع باطل ہو جائے گا اسی طرح اگر وہ اپنی تشہیر کرنے لگے تو سوسائٹی کے لئے وہ بغایت باعث مضرت ثابت ہوگی۔ لندن میں خود اپنے طور پر آرائش وزیبائش کا سامان پہلے ہی بہت کچھ موجود ہے انگریزوں کو اس کی ہمت افزائی کرنے اور اسے اور تیز کرنے کی خواہش نہیں ہے بلکہ اسے کم کرنے اور فرو کرنے کی خواہش ہے انگریزی دربار تو محض ایک مساوی ومقابلہ کن اعیانی سوسائٹی کا سرگروہ ہے۔ اس کی شان وشوکت سے دوسرے لوگ دب نہیں گئے ہیں بلکہ ان میں ابھرنے کا اور اشتیاق پیدا ہوگا۔ اس کا فائدہ اسی وقت تک ہے جبتک یہ دوسروں کو اول واقدم جگہ سے خارج کئے ہوئے ہے اور خود اس جگہ میں ماموں وگوشہ گیر ہیں لیکن اگر وہ انگریزوں کی نمائش دولت کی متعدد بہ شالوں میں ایک نئی مثال کا اضافہ کرے یعنی مصارف میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کا جو مقابلہ جاری ہے اسمیں اگر شاہی اپنے بلند مرتبہ کی بھی شہ دیدے تو وہ باعث مضرت ہو جائیگی۔

رائے عامہ یہ کہ انگریز بادشاہ کو اپنے اخلاقیات کا مقتدے سمجھنے لگے ہیں۔ ملکہ وکٹوریا اور جارج سوم کے اوصاف نیک کا بہت ہی گہرا اثر عوام کے دلوں میں پیدا ہو گیا ہے انگریز یہ یقین کرنے لگے ہیں کہ نیک کردار بادشاہ کا ہونا ایک طبعی امر ہے اور جس طرح ذاتی اوصاف حمیدہ جب بادشاہ میں پائے جاتے ہیں تو نہایت ہی نمایاں ہو جاتے ہیں اسی طرح یہ توقع بھی رکھنا چاہئے کہ یہ اوصاف بادشاہ میں ضرور پائے جائینگے۔ مگر ایک ذرا سے تجربہ اور اس سے

بھی کم غور و فکر سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ منصب شاہی ذاتی خوبیوں سے متصف نہیں ہو سکتا۔ جارج اول
جارج دوم اور ولیم چہارم ان میں سے کوئی بھی خانگی خوبیوں کا نمونہ نہیں تھا اور جارج چہارم
تو خانگی نقائص کا مجسمہ تھا۔ صاف امر یہ ہے کہ جتنی جگہیں ایسی ہیں جن میں بے راہ روی کا میلان
اغلب ہے اور اس میلان کی تحریک و اشتعال کا سامان بھی موجود ہے ان تمام جگہوں میں
ایک دستوری بادشاہ کے منصب میں تقریباً سب سے زیادہ ترغیبات و تحریصات موجود ہیں
اور موزوں مشاغل اس میں تقریباً سب سے کم ہیں۔ تمام دنیا اور دنیا کی تمام شان و شکوہ دنیا
میں جو چیزیں سب سے زیادہ دلفریب اور جو چیزیں سب سے زیادہ ترغیب دہ ہیں وہ
ہمہ وقت شہزادہ ولیعہد کے قدموں پر نثار کیجاتی رہتی ہیں اور مستعد نثار ہوتی رہیں گی یہ امر قرین عقل نہیں ہے
کہ جب انسانی زندگی کے کمزور ترین اوقات میں ترغیبات و تحریصات نہایت ہی ہمت آزما صورت
میں پیش آتی رہی ہوں تو پھر وہاں بہترین نیکو کرداری کی توقع کیجا سکے۔ ایک دستوری بادشاہ
کے مشاغل سنجیدہ، باضابطہ اور اہم تو ہوتے ہیں مگر وہ ولولہ انگیز ہرگز نہیں ہوتے۔ ان میں
کوئی بات ایسی نہیں ہوتی کہ اشتیاق سے خون جوش میں آجائے، اعلیٰ تخیلات میں حرکت پیدا
ہو جائے، اور متوحش خیالات دفع ہو جائیں۔ جارج سوم کے ایسے اشخاص جنھیں کاروباری
مشاغل سے بہت ہی بڑا ذوق ہو، ان کے لئے دستوری بادشاہی کے بندھے ہوئے فرائض
بے شبہ تسکین دہ، پاکیزہ اثر رکھتے ہیں، وہ جب خلل دماغی کی کشاکش میں مبتلا تھا اور جسے اس نے
برسوں تک بڑی کامیابی سے نباہا، اس پر اگر ایک پر از محنت مشغلہ کا تسکین دہ اثر نہ پڑتا تو
غالباً یہ دورہ اور بھی زیادہ ہو جاتا۔ مگر کتنے شہزادے ایسے ہیں جن کی طبیعت حقیقی کام
کی طرف اس شد و مد سے مائل رہی ہو۔ یہ ولولہ و جوش دوسری جگہوں میں کسقدر غیر معروف
ہے شہزادوں کے حالات گرد و پیش ایسے جذبہ کے نشو و نما پاتے کے کسقدر ناموزوں ہیں
علی العموم ان کے عادتی میلانات کے روکنے کے لئے اس جذبہ پر کس قدر کم بھروسا کیا
جا سکتا ہے یہ سب ظاہر ہے آئینی بادشاہت کے تخت پر متمکن ہو کر سنجیدہ و باخبر اشخاص کے
کسی ایسے ملک میں جہاں دستوری بادشاہی کا رواج ہو ایسا شخص تخت پر بیٹھے جو سنجیدہ اور باخبر ہو
تو اس کے لئے یہ ممکن ہے کہ ان میں خانگی خوبیاں بھی موجود رہیں مگر ایسے بادشاہ بھی
کبھی کبھی ناکامیاب ہو جاتے ہیں، اور یہ توقع کرنا کہ زیادہ شوقین طبیعت کے لوگوں میں
عام طور پر یہ خوبیاں ہونگی یہ اس کے برابر ہے کہ کانٹوں سے انگور اور جھاڑیوں سے انجیر کی

توقع کیجائے۔ آخری امر یہ ہے کہ دستوری بادشاہت کا ایک فرض ہے جس پر میں نے اپنے آخری خطبہ میں بہت تفصیل کے ساتھ زور دیا تھا اور وہ فرض اگرچہ اسب فرضوں سے بہت ہی بڑھا ہوا ہے مگر میں اب اپنے سابقہ بیان پر مزید اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا؛ وہ فرض یہ ہے کہ دستوری بادشاہی پس پردہ رہکر کام کرتی ہے۔ اس سے یہ موقع ملتا ہے کہ اصلی حکام بدل جائیں اور بیفکر لوگوں کو اس کی خبر بھی نہ ہو۔ انگلستان کے عامۃ الناس منتخب شدہ جماعت عاملہ کے لئے موزوں نہیں ہیں، اگر وہ یہ جان لیں کہ وہ اس سے کسقدر قریب پہونچ گئے ہیں تو انھیں حیرت ہوگی بلکہ وہ کچھ ڈر سے جائینگے۔

تقلیبی زمانوں میں دستوری شاہی کے اندر کچھ اسی قسم کی قدر و قیمت موجود ہے کسی سابق کی مطلق العنان بادشاہی کے بجائے کسی کابینی حکومت کے برپا ہو جانے میں سب سے بڑی مدد اس سے ملی ہے کہ ایک ایسا بادشاہ تخت نشین ہوا جو اس قسم کی حکومت کا طرفدار تھا، اور جس نے اس کے قائم رکھنے کا اقرار کیا تھا۔ کابینی حکومت جب نئی ہو تو پریشانی کے زمانہ میں وہ کمزور ہوتی ہے۔ وزیر اعظم کا اقتدار (پوری طرح) قائم نہیں ہوتا ہے حالانکہ وہ ہی وہ سردار ہے جس پر ہر ایک امر کا انحصار ہے، اگر ذمہ داری کسی پر عائد ہوتی ہے تو اسی پر عائد ہوتی ہے اگر کوئی شخص قوت سے کام لے سکتا ہے تو وہ وہی ہے۔ حکومت کی نوعیت کی وجہ سے وہ اپنی جگہ پر کسی قدر عدم تیقن کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ جو قوم اس قسم کی حکومت کی پوری طرح عادی ہو اس میں یہ عہدہ دار دلیر ہوگا۔ وہ اگر پارلیمنٹ پر نہیں تو اس قوم پر بھروسا کرے گا جو اسے سمجھتی اور اس کی قدر کرتی ہے، اگر جب یہ حکومت نئی نئی قائم ہو تو اس قسم کے وزیر کے لئے دلیر ہونے کی جیسی ضرورت ہے ویسا دلیر ہونا دشوار ہے۔ اس کی قوت کا انحصار انسانی تعقل پر ضرورت سے زیادہ اور انسانی شعور پر ضرورت سے کم ہوتا ہے۔ ایسے زمانے میں ایک موروثی بادشاہ کی روایتی قوت بے انتہا کارآمد ہوتی ہے۔ اگر ولیم سوم کے ایسے فرمانروا کی قابلیت شامل حال نہ ہوتی تو ۱۶۸۸ء کے بعد کے اولین برسوں میں انگلستان کے جہاز کا ساحل مقصود تک پہنچنا غیر ممکن تھا۔ وکٹر امانوئل کی اعانت کے بغیر غیر ممکن تھا کہ اطالیہ آزادی حاصل کر لیتی اور اسے برقرار رکھتی، وکٹر سے زیادہ نہ کاوور کا کام ضروری تھا اور نہ گاریبالڈی کا مگر ایک دستوری بادشاہ کی حیثیت سے لوئی فلپ کا اپنی محفوظ طاقت کے استعمال سے باز رہنا سب سے پر از سبق آموز ثبوت اس امر کا ہے کہ یہ طاقت کسقدر وسیع ہے۔ ۱۸۴۸ء میں گیزو اسبحہ

کمزور تھا کہ اس کے عہدے کی میعاد غیر متیقن تھی، لوئی فلپ کو چاہئیے تھا کہ وہ اس میعاد کو متیقن کر دیتا، اس کے بعد تربیت یافتہ لوگوں کو پارلیمنٹی حقوق عطا کئے جا سکتے تھے مگر عوام الناس کے ساتھ کوئی رعایت نہ ہونا چاہئیے تھی گیزو کے حسب خواہش کے مطابق پیرس کے عامتہ الناس کو زیر کر لینا چاہئیے تھا۔ لوئی فلپ اگر ایک آزاد حکومت کی بنیاد ڈالنے کے لئے موزوں ہوتا تو جس وقت اس کے وزرا اس کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے اسوقت وہ انھیں تقویت دیتا، خواہ بعد کو جب امن قائم ہو جاتا وہ انھیں علیحدہ ہی کیوں نہ کر دیتا اور ان کی حکمت عملی کو معرض بحث میں لے آتا مگر وہ ان محتاط آدمیوں سے تھا جن پر یہ حکم لگ جاتا ہے "کہ وہ بڑھاپے میں ناکامیاب ہونگے۔ وہ اگرچہ بہت وسیع تجربہ اور بڑی اعلیٰ قابلیت کا شخص تھا مگر ایک خفیف سی وقتی قوت کی کمی کی وجہ سے (جو ایسے نازک وقت میں ایک معمولی آدمی سے بھی ظاہر ہوتی) اسے ناکام ہونا اور تاج و تخت سے ہاتھ دھونا پڑا۔

یہی وہ خاص طریقے ہیں جن میں منصب شاہی اپنی متبرک ہیئت کے ذریعہ سے بنی نوع انسان پر اثر انداز ہوتا ہے اور انگریزوں کے تمدن کی موجودہ حالت میں اس کی قدر و قیمت کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بادشاہ کے واقعی کام یعنی وہ کام جنھیں ملکہ فی الواقع انجام دیتی ہے، ان کی بحث میں اپنے دوسرے مضمون میں کروں گا۔

شاہی

(سلسلۂ سابق)

دارالعوام نے بہت سے امور کے متعلق تحقیق وتفتیش کی ہے مگر اس نے کبھی کوئی کمیٹی "ملکہ (کی تفتیش حالات) کے متعلق نہیں مقرر کی۔ کوئی مستند سرکاری کتاب ایسی نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ کیا کرتی ہیں۔ اس قسم کی تحقیقات وقوع میں آ ہی نہیں سکتی لیکن اگر ایسا ہو سکے تو غالباً اس سے ملکہ کو بہت سے پریشان کن مقررہ کاموں اور بہت سے تکلیف دہ غیر ضروری صرف اوقات سے نجات ملجائے گی۔

انگریزی دستور سلطنت کے مشہور عام نظریہ میں ذات شاہی کے متعلق دو غلطیاں داخل ہو گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس نظریہ میں اسے "سلطنت کا ایک طبقہ" سمجھا جاتا ہے یعنی وہ دارالامرا اور دارالعوام کے پہلو بہ پہلو ایک جداگانہ مساوی درجہ کی طاقت ہے، کم از کم اس نظریہ کی قدیم ترین صورت میں تو یہ خیال ضروری موجود ہے۔ کسی وقت میں بادشاہ کی یہی حالت تھی اور وہ اسکے سوا اور بہت کچھ تھا مگر اب ایسا نہیں رہا ہے۔ ممکن تھا کہ بادشاہ یا ملکہ اپنے اختیار کا نفاذ صرف ایک تشریعی حق امحا کے ذریعہ سے کر سکتا۔ یعنی وہ اس قابل ہوتا کہ وہ مسودات قانونی کو مسترد کر سکے اگر اس صورت میں مسترد نہ کر سکے جس صورت میں دارالعوام انھیں مسترد کرتا ہے تو کم از کم اس صورت میں کر سکے جس صورت میں دارالامرا انھیں مسترد کرتا ہے۔ مگر ملکہ کو کوئی ایسا حق امحا حاصل نہیں ہے۔ اگر دونوں ایوان باتفاق خود ملکہ کی موت کا حکم اس کے پاس بھیجیں تو اس پر بھی اسے دستخط کرنا پڑینگے۔ ملکہ کی ذات کے ساتھ تشریعی اختیار کا وابستہ کرنا ایک قصۂ پارینہ ہے۔ مدت ہوئی کہ اس قسم کا اختیار مفقود ہو چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ قدیم نظریہ کا یہ دعوی ہے کہ ملکہ قانون کا نفاذ کرتی ہے۔ امریکی دستور سلطنت بڑے ہی غور و خوض کے بعد تیار ہوا تھا اور وہاں کے

مباحث کے بیشتر حصہ سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ انگریزی دستور سلطنت کا انصرام و انتظام بادشاہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کے ایک غیر موروثی بدل یعنی رئیس جمہوریہ کی اشد ضرورت ہے۔ بحر اوقیانوس کے اس جانب رہنے اور مسلمہ اصول سے گمراہ ہو جانے کے باعث وفاقی دستور کے دقیق النظر واضعین نے اسقدر دیدہ ریزی و مغز کاوی کے بعد بھی یہ نہ سمجھا کہ برطانی دستور سلطنت کا خاص کارکن وزیر اعظم ہے اور بادشاہ اس کل میں صرف پہیئے کا ایک دندانہ ہے۔ بیشک اس زمانہ کی تاریخ میں امریکی واضعان قانون کے لئے بہت کچھ عذر موجود ہے۔ انگریزی دستور سلطنت سے متعلق ان کا تصور اس زمانہ سے ماخوذ ہے جب ان کو اس سے سابقہ پڑا تھا اس زمانہ میں لارڈ نارتھ کی برائے نام حکومت کی تہہ میں جارج سوم ہی حکومت کرتا تھا۔ لارڈ نارتھ نہ صرف اسکا مقرر کردہ بلکہ اس کا ایک گماشتہ تھا۔ وزیر ایک ایسی جنگ کو چلا رہا تھا جسے وہ نامناسب سمجھتا اور جس سے وہ خود متنفر تھا۔ یہ صرف اس وجہ سے تھا کہ اس جنگ کو بادشاہ مناسب سمجھتا اور پسند کرتا تھا۔ پس لامحالہ امریکی مجلس عارضی نے یہ یقین کر لیا تھا کہ بادشاہ جس نے انھیں مبتلائے آلام بنایا ہے وہی اصلی کارکن ہے۔ وزیر جس سے انھیں تکلیف نہیں پہنچی ہے وہ اصلی کارکن نہیں ہے۔

اگر ہم علمی نظریہ کو چھوڑ دیں اور انگریزوں کے قدیم زمانہ کے واقعی قانون کو دیکھیں تو یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ بادشاہ کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا چند برس پہلے ملکہ نے بہت ہی عاقلانہ کوشش کی تھی کہ مادام الحیات امرا کا تقرر ہو جائے اور دارالامرا نے بڑے ہی ناعاقلانہ طور پر ملکہ کے اس حق کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان امرا نے کہا کہ ملکہ کے اختیار کا عدم وجود برابر ہے، انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ کسی وقت ملکہ کو یہ اختیار تھا مگر اب مدت کے عدم استعمال سے وہ اختیار فنا ہو چکا ہے۔ اگر کوئی شخص کومن کے "مجموعۂ قوانین" یا اسی قبیل کی کسی کتاب کے صفحات پر سرسری نظر ڈالے تو "امتیاز شاہی" کے عنوان کے تحت میں یہ دیکھے گا کہ ملکہ کو صدہا ایسے اختیارات حاصل ہیں جو واقعیت و عدم استعمال کے درمیان معلق پڑے ہیں، اور اگر ملکہ انھیں عمل میں لانے کی کوشش کرے تو ایک طول طویل اور بہت ہی دلچسپ قانونی مبحث اٹھ کھڑی ہو۔ کسی اچھے قانوندان کو چاہئے کہ یہ تحقیق تمام ایک کتاب لکھے جس میں یہ بتائے کہ ان اختیارات میں سے کون سے اختیارات واقعی قابل العمل ہیں اور کون سے اختیارات متروک ہو چکے ہیں۔ ملکہ جو کچھ کرتی ہے اس کے متعلق جس طرح کوئی مستند و واضح اطلاع حاصل نہیں ہے اسی طرح یہ بھی صاف ظاہر نہیں ہے کہ وہ کیا کر سکتی ہے۔

آزاد ادارات سے محض سطحی نظریہ میں یہ امر بلا شک وشبہ ایک نقص ہے ایک عمومی حکومت میں ہر ایک اختیار معلوم ومعین ہونا چاہئے۔ اس قسم کی حکومت کا تمام تر تصور یہی ہے کہ سیاسی قوم یعنی حکمران قوم جس طرح مناسب سمجھتی ہے اس طرح حکومت کرتی ہے۔ نظم ونسق کے ہر ایک صیغہ کے تمام افعال اس کی تنقیح وتفتیش کے زیر اثر ہیں، اگر یہ افعال اچھے معلوم ہوتے ہیں تو قوم انھیں الگ سے دیکھتی رہتی ہے اور اگر وہ اچھے نہیں معلوم ہوتے تو کسی نہ کسی نہج سے ان میں مداخلت کرتی ہے، لیکن اگر قوم کو لاعلمی کی حالت میں رکھا جائے تو وہ کوئی صحیح رائے نہیں قائم کر سکتی۔ مخفی امتیاز شاہی اجتماع ضدین ہے، اور شاید سب سے بڑھا ہوا اجتماع ضدین ہے لیکن انگریزی شاہی اسوقت جیسی کچھ ہے اس سے استفادہ کے لئے یہ اخفا ہی اصل شے ہے۔ سب سے مقدم امر یہ ہے کہ انگریزی شاہی کے لئے عظمت ووقعت لازمی ہے، اور اگر آپ ہر وقت اس کے عقب میں لگے رہینگے تو پھر آپ اسکی وقعت نکر سکینگے۔ جب ملکہ کی (تفتیش معاملات) کے متعلق کوئی منتخب مجلس نشست کرے گی تو پھر شاہی کی سحر آفرین کشش کہاں رہجائیگی۔ اس کی رازداری ہی اس کی جان ہے، اس طلسم پر دن کی روشنی نہ ڈالنا چاہئے، نہ ملکہ کو سیاسیات کی جنگ میں پھنسانا چاہئے ورنہ پھر تمام سیاسی جنگ آور اس کی عظمت ووقعت نکرینگے اس صورت میں تو اس کا بھی شمار مثل دوسرے جنگ آوروں کے ہونے لگیگا۔ مجرد نظریہ کے مطابق اس خفیہ طاقت کا وجود انگریزوں کی دستوری نظم سلطنت میں ایک نقص ہے، لیکن انگریزوں کے ایسے تمدن میں جہاں علوم وکارگزار اختیارات کے ساتھ ہی ساتھ مقدس اور اس لئے نامعلوم اختیارات کی بھی ضرورت ہے وہاں یہ نقص لازمۂ تمدن ہے۔

اگر ہم اس مخفی طاقت کے کام کرنے کا اندازہ ان لوگوں کی شہادتوں سے کرنا چاہیں جنکو گزشتہ وموجودہ زمانہ میں اس طاقت سے واسطہ پڑا ہے تو ہمکو ایک عجیب وغریب فرق معلوم ہوگا جارج سوم اور ملکۂ وکٹوریہ دونوں کے درباری شاہی اثر کی وسعت وعظمت پر متفق اللسان ہیں، دونوں کے نزدیک یہ ایک مسلمہ وخفیہ اصول ہے کہ بظاہر جسقدر معلوم ہوتا ہے بادشاہ اس سے زیادہ کام انجام دیتا ہے، مگر اس کام کی صفت کے متعلق راویوں میں وسیع تبائن موجود ہے۔ مسٹر فاکس کو اس امر میں مطلق تامل نہوا کہ اس نے جارج سوم کے پوشیدہ اثر کو کسی "شیطان دوزخ" کی غیر مفید قدرت سے تشبیہ دی اس زمانہ میں تاج کی کارروائیاں لبرل مدبرین کے لئے خوف وہیبت کا باعث بنی ہوئی تھیں، مگر اب بہترین لبرل مدبر یہ کہتے ہیں کہ وہ ہمیں یہ بات نہیں معلوم ہوئی

مگر جب تاریخ لکھی جائے گی تو ہماری اولاد کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم ملکہ اور شہزادہ البرٹ کے کس درجہ زیر بار احسان ہیں"۔ دستور سلطنت کی رازداری جسے انگریزوں کے نہایت ہی باضابطہ نہایت ہی صاحب فکر اور تعلیم یافتہ مدبر نفرت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے اسی کو اب وہ محبت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم اس تغیر کی وجہ بیان کرنے کی کوشش کریں ہمیں چاہئے کہ ملکہ کے فرائض کے ایک حصہ کو بحث سے خارج کر دیں کیونکہ وہ حصہ ہی ایسا ہے اس سے میری مراد رسمی حصہ سے ہے۔ ملکہ کو ایسی بیشمار دستاویزوں پر دستخط کرنا پڑتے ہیں جن میں حکومت کی کسی حکمت عملی کے متعلق کوئی بات نہیں ہوتی جن کا مقصد نہایت ہی معمولی ہوتا ہے اور جن پر ایک محرر بھی دستخط کر سکتا ہے۔ جارج سوم کی عادت تھی کہ وہ دستاویزوں پر دستخط کرنے کے قبل ان کا ایک بڑا حصہ پڑھا کرتا تھا تا آنکہ لارڈ تھرلو نے اس سے کہا کہ "ان کا دیکھنا اس کے لئے بالکل عبث ہے کیونکہ وہ انھیں سمجھ نہیں سکتا"۔ مگر ان میں بدترین صورت فوج کے اعلیٰ عہدوں کا مسئلہ ہے، تین ہی برس ہوئے کہ اس کے متعلق ایک قانون منظور ہوا ہے، اس سے قبل تک ملکہ تمام اعلیٰ فوجی عہدوں کے لئے دستخط کیا کرتی تھی اور اب بھی تمام نئے عہدوں کے پر کرنے کے کاغذات پر وہ دستخط کرتی ہے۔ اس کا لازمی و طبعی نتیجہ یہ ہے کہ اس قسم کے فرامین ہزاروں کی تعداد میں التوا میں پڑے رہتے تھے اور کسی حد تک اب بھی پڑے ہوئے ہیں بہت سے ایسے لوگوں کا حال معلوم ہوا ہے جنھیں ملازمت سے کنارہ کش ہونے کے برسوں بعد اعلیٰ عہدے کا فرمان پہلی مرتبہ موصول ہوا ہے۔ اگر ملکہ کوئی معمولی عہدہ دار ہوتی تو اس نے مدتوں قبل اس کی شکایت کی ہوتی اور مدتوں قبل اسے اس محنت شاقہ سے خلاصی مل گئی ہوتی۔ ایک مردہ دل مدبر کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے اس بنا پر اس کام کی حمایت کی تھی کہ وہ ممکن ہے کہ کوئی بیوقوف بادشاہ ہو جائے اور اسوقت یہ مناسب ہوگا کہ اس کے پاس بہت سا کام موجود رہے تاکہ وہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکے"۔ مگر فی الحقیقت یہ ایک طفلانہ حرکت ہے کہ ایک ایسے شخص پر کاروبار کے رسمی فرائض کا بار ڈال دیا جائے جسے لائز سوسائٹی کے بہت سے باضابطہ فرائض انجام دینا رہتے ہیں۔ یہ ان پرانے وقتوں کا ایک بقیہ چلا آرہا ہے جب جارج سوم ہر ایک امر کو خواہ وہ کیسا ہی بے حقیقت کیوں نہ ہو جانتا اور ہر ایک شئے پر خواہ وہ کیسی ہی حقیر کیوں نہ ہو اپنی منظوری دینا چاہتا تھا۔ معینہ کاموں کی مشقت اس بحث سے خارج کیجا سکتی ہے

بادشاہ کو نیک و بد کا جو اختیار حاصل ہے وہ ان باتوں سے حاصل نہیں ہوتا۔

انگریز ملکہ کے کس حد تک زیر بار احسان ہیں اس کی جانچ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دماغ پر بہت زور دیکر یہ سوچا جائے کہ انگریز ملکہ کے بغیر اپنا کام کس طرح چلائینگے۔ حکومت کابینی کو اس کے تمام لوازم سے معرا کردیجئے اور اس کے اجزائے ترکیبی میں سے صرف دو لازمۃ الوجود اجزا یعنی مجلس نیابتی (یا دارالعوام) اور کابینہ کو (جسے اس مجلس نے مقرر کیا ہو) باقی رہنے دیجئے اس کے بعد یہ جانچ کیجئے کہ انگریز صرف انھیں دو اجزا سے کیونکر اپنا کام چلائینگے۔ انگریزوں میں دستور سلطنت پر جزءً جزءً نظر ڈالنے کی عادت اسدرجہ کم اور دستور سلطنت کے جملہ اثرات کو مجموعاً دستور سلطنت پر محول کرنے کی عادت اسدرجہ قوی ہے کہ بہت سے لوگ تو اُسے غیر ممکن سمجھیں گے کہ کوئی قوم صرف انھیں دو عناصر سے مرفہ الحال رہنا تو کجا زندہ بھی رہسکتی ہے یا نہیں، اگر عام طور پر انگریزی حکومت کی جو نقل و تقلید کی جارہی ہے اس کا انحصار اسی امکان پر ہے۔ ایسا بادشاہ جسکی عظمت و وقعت لوگ صدق دل سے کرتے ہوں اور ایسا اولالامر جس کی عزت و حرمت واقعتاً کیجاتی ہو انکی بنا تاریخی حوادث پر ہے جو تقریباً اسی ایک جزیرے کے ساتھ مختص اور محض یورپ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اگر کوئی نیا ملک کابینی حکومت کا اہل ہونا چاہتا ہے اور صدارتی حکومت کی ذلت میں مبتلا رہنا گوارا نہیں کرتا تو اسے لازم ہے کہ وہ اپنا کابینہ اپنے ہی خاص وسائل سے مہیا کرے اور قدیم دنیا کی افتادہ عمارتوں کے ملبہ پر اعتماد نہ کرے۔

بہت سے طریقے ایسے پیش کئے جاسکتے ہیں جنکے ذریعہ سے کوئی پارلیمنٹ ظاہراً وہی کرسکتی ہے جو انگلستان کی پارلیمنٹ حقیقتاً کرتی ہے یعنی وزیر اعظم کا تقرر اسی کے ہاتھ سے انجام پائے لیکن میں ان تمام طریقوں میں سب سے زیادہ سادہ طریقہ کو لیتا ہوں، اس صورت میں اس دستور سلطنت کا سادہ ڈھانچ ہمیں نظر آئے گا اور ہم یہ دیکھیں گے کہ کس کس خصوص میں یہ طریقہ شاہی کی صورت سے مغائر ہے، اور اس حالت میں ہم اس الزام سے بالکل بری ہونگے کہ ہم نے ایک ایسا بدل منتخب کیا ہے جو ضرورت سے زیادہ اثرانداز و دلفریب ہے۔

اب فرض کیجئے کہ دارالعوام تن تنہا قائم ہے اور وہ وزیر اعظم کو بالکل ایسے ہی سادے طریقہ سے مقرر کردے، جیسے کسی ریلوے کے حصہ دار اپنے ناظم کا انتخاب کرتے ہیں، انتقال یا استعفٰی کی وجہ سے جب کبھی یہ عہدہ خالی ہو ہر ایک رکن یا ہر ایک گروہ ارکان کو جانشین کے نامزد کرنے کا حق ہو، انتخاب وزارت کے نازک مواقع پر اسوقت بالعموم جسقدر وقت صرف ہوتا ہے

ایسے مناسب وقفہ یعنی دس پندرہ دن کے بعد ارکان جس امیدوار کو مرجح سمجھتے ہوں، اس کے لئے اپنی اپنی رائیں دیں، اس کے بعد اسپیکر (صدر دار العوام) رایوں کا شمار کرے اور جس امیدوار کے لئے سب سے زیادہ رائیں ہوں وہ وزیر اعظم ہو جائے۔ انتخاب کے اس طریقہ سے پسندیدگی کا تمام اختیار بالکل اسی طرح فریقانہ جماعت منتظمہ کے ہاتھ میں آجائے گا جیسے اسوقت انگریزوں میں رائج ہے، صرف اتنا فرق ہوگا جتنا تاج کی مداخلت سے تعلق رکھتا ہے۔ کوئی بیرونی شخص کبھی بھی مقرر نہ ہوگا کیونکہ ہر ایک بڑا فریق جسقدر بے شمار رائیں اس معرکہ میں لاسکتا ہے وہ بادشاہ کے ایسی قلیل تعداد جماعت کی رایوں سے بے اندازہ بڑھجائیں گی، وزیر اعظم کا تقرر کسی معین زمانہ کے لئے نہیں ہونا چاہئے، بلکہ جب تک وہ خوبی سے کام کرتا رہے یا جب تک پارلیمنٹ کی مرضی ہو اسوقت تک ہونا چاہئے۔ حسب ضرورت تغیرات اور ان اختلافات کے علاوہ جنکی تحقیق مدنظر ہے، جو کچھ اسوقت ہوتا ہے وہی اسوقت بھی ہوتا رہے۔ اسوقت کی طرح اسوقت بھی وزیر اعظم عدم اعتماد کی قرارداد پر مستعفی ہو جائے گا مگر اسوقت جانشین کے انتخاب میں صرف پارلیمنٹ ہی کی ترجیحی رائے واحد علانیہ قوت ہوگی، حالانکہ اسکے برخلاف اسوقت یہ رائے ایک غالب قوت اور پس پردہ ہے۔

اگر ہم اس بحث کو تین حصوں میں تقسیم کریں تو اس سے بحث میں بہت مدد ملیگی کسی نیابتی حکومت کی تمام رفتار کے تین مرحلہ ہوتے ہیں، اول وزارت کا وقت تقرر، دوسرے اس کا زمانۂ قیام، تیسرے اس کا وقت اختتام۔ اب ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ ان میں سے ہر ایک مرحلہ میں ملکہ کا قطعی کام کیا ہے اور انگریزوں کی موجودہ حکومت ہر ایک مرحلہ میں اس سادہ تر کابینی حکومت کے بہ نسبت جو ملکہ کے بغیر وجود میں آئے اکن نیک و بد امور میں مختلف ہے۔

جبکہ سلطنت میں صرف دو ہی بڑے فریق ہوں اور جب ان فریقوں میں سے بھی بڑا فریق باخود ہا پوری طرح اس امر پر متفق ہو کہ اس کا پارلیمنٹی سرگروہ، یعنی وزیر اعظم کون ہوگا تو اس صورت میں نظم و نسق کے آغاز کار میں کابینی حکومت کے شاہی و غیر شاہی اقسام میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوگا۔ اسوقت بادشاہ کے لئے اس مسلمہ سرگروہ کا قبول کرنا ضروری ہے، اور اگر انتخاب براہ راست دار العوام کی طرف سے ہو تو ایوان کو بھی اسی کا منتخب کرنا ضروری ہوگا ایوان کا بڑا حصہ متفق و ہموار رہکر کسی موثر مقاومت کے بغیر اپنے فیصلوں کو منواتا رہے گا، بلکہ شاید ظاہراً بلا مقابلہ ایک حاوی و غالب فریق جو اپنے اندرونی مناقشات کے باعث پراگندہ نہ ہو

مطلق العنان حیثیت سے قائم رہیگا۔ ایسی حالت میں کابینی حکومت بلا تصادم چلتی رہے گی خواہ ملکہ ہو یا نہ ہو۔ اس صورت میں نہ بہترین بادشاہ کوئی نفع پہنچا سکتا اور نہ بدترین کوئی نقصان کر سکتا ہے۔

لیکن جب غالب فریق اس امر پر متفق نہ ہو کہ اس کا سرگروہ کون ہوگا تو بہت بڑے مشکلات پیش آجائینگے۔ اس حالت میں کابینی حکومت کی شاہی صورت میں بسا اوقات بادشاہ کو موثر انتخاب کا موقع حاصل ہوتا ہے لیکن غیر شاہی صورت میں یہ انتخاب کون کریگا؟ "ولیس" یا بزمگاہ یا کسی ایسی جگہ جلسہ کا ہونا قرار پائے گا، فریق کے اندر حصۂ کثیر حصۂ قلیل پر ایسی ہی اندرونی قسم کا مطلق العنانہ تشدد کرے گا جیسا ۱۸۵۱ء میں ہوا جب لارڈ جان رسل کو اعلیٰ حکومت کے متعلق اپنے دعاوی ترک کرنا اور پامرسٹن کے تحت میں کام کرنے پر قانع ہونا پڑا۔ اس موقع پر اسی پوشیدہ دباؤ سے کام لیا جائے گا اور کام لیا جانا چاہئے جو عہدے کا متمنی فریق اپنے ان گروہوں کے خلاف استعمال کرے گا جنھوں نے اس کی قوت کو تقسیم کر دیا ہو۔ اس میں بہت کچھ شک و شبہ کی گنجائش ہے کہ آیا اس قسم کا فریق ہمیشہ صحیح طور پر بہترین شخص کا انتخاب کرے گا یا نہیں، کوئی فریق جب ایک مرتبہ منقسم ہوگیا تو پھر یہ یقین رکھنا دشوار ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کے حق میں بھی اتفاق رائے کرلیگا جسے ایک بے غرض دوسرے دیکھنے والا بھی پسند کرے، ہر طرح کے بغض و حسد فوراً ہی مشتعل ہو جاتے ہیں اور ان کو فرو کر دینا ہمیشہ ہی دشوار اور اکثر غیر ممکن ہوتا ہے لیکن اس قسم کا فریق اگر بہترین سرگروہ کو منتخب نہ کر سکے تو بھی ایک بہت اچھے سرگروہ کے منتخب کرنے کے لئے قوی ترین محرکات موجود ہوتے ہیں۔ ان کی حکمرانی کا قرار و قیام اسی سرگروہ پر منحصر ہوتا ہے۔ صدارتی دستور سلطنت میں جو ادلین منتکبین رئیس جمہوریہ کا انتخاب کرتی ہیں وہ اس پر نگاہ نہیں رکھتیں کہ اُن کا پسند کردہ شخص آخر کار موزوں بھی ہوگا یا نہیں۔ ان کو جو کچھ تعلق ہوتا ہے وہ امیدوار کی حیثیت اور اس کی دلکشی سے ہوتا ہے، ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ بہ حیثیت حکمران کے اس کی قابلیت پر لحاظ کریں۔ اگر وہ کسی ضعیف الرائے شخص کو منتخب کر دیں تو وہ بھی اپنی میعاد مقررہ تک حکمرانی کرے گا، اور اگر وہ بہترین صائب الرائے ثابت ہو تو بھی اس میعاد کے ختم ہونے پر دستور سلطنت کے نوشتۂ قسمت کے بموجب دوسرا انتخاب عمل میں آئے گا مگر وزارتی حکومت کے تحت میں اس قسم کا کوئی قطعی نوشتۂ قسمت نہیں ہے۔ یہ حکومت ایک قابل علیحدگی حکومت ہے اسکے زمانۂ قیام کا

انحصار اس کے کام پر ہے۔ اگر کوئی فریق اتنا بیوقوف ہو کہ وہ کسی کمزور شخص کو اپنا سرگروہ بنالے تو وہ برسر اقتدار نہیں رہے گا۔ اس کی اصابت رائے ہی اس کی زندگی ہے۔ فرض کیجئے کہ ۱۸۵۹ء میں وھگ فریق ارل رسل اور لارڈ پامرسٹن دونوں کو الگ رکھنے کا عزم کر لیتا اور اپنی سرگروہی کے لئے کسی بے حقیقت سے ناقابل شخص کو منتخب کر لیتا تو غالباً وھگ فریق شلسوگ ہولسٹائن کی مشکل کے وقت میں منصب و اقتدار سے علیحدہ کر دیا گیا ہوتا۔ قوم اس سے بیزار اور پارلیمنٹ اس سے کنارہ کش ہو جاتی قوم یا پارلیمنٹ کبھی اس کی روادار نہ ہوتی کہ خفیہ مراسلات جن پر صلح وجنگ کے سے نازک معاملہ کا انحصار ہو، وہ ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہوں جو کمزور سمجھا جاتا ہو جسے اس لئے آگے بڑھا یا گیا ہو کہ وہ لاپروا طبیعت کا شخص ہے، اور جسے خود اس کے دوست وقعت کی نظر سے نہ دیکھتے ہوں" ناسوا اس کے وزارتی حکومت کا کام روز روشن میں ہوتا ہے، مباحثہ ہی اس کی زندگی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی رئیس جمہوریہ کمزور ہو لیکن اگر وہ اپنے نظم ونسق کے آخر تک اچھے وزرا کو برقرار رکھے تو ممکن ہے کہ اس کا پردہ ڈھکا رہے یعنی یہ امر معرض شک میں پڑا رہتا کہ وہ دانشمند ہے یا نادانشمند مگر ایک وزیر اعظم کو یہ دکھانا پڑتا ہے کہ وہ کیا ہے، اسے اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ اس مجلس کے کاروبار کے انتظام میں اس کی رہبری کر سکے، مشکل اوقات میں اسے اپنی طرف متوجہ کر لے، اور جوش واضطراب کے زمانے میں اس پر قابو رکھ سکے وہ علانیہ ایک متجسسانہ امتحان گاہ میں لایا جاتا ہے اور اگر وہ ناکام رہتا ہے تو اسے مستعفی ہونا پڑتا ہے علیٰ ہذا کوئی فریق پسند نہیں کرے گا کہ وہ اس عظیم الشان اختیار کے لئے جو ایک کابینی حکومت اپنے وزیر اعظم کو تفویض کرتی ہے، کسی کمزور شخص پر اعتماد کرے وزیر اعظم اگرچہ پارلیمنٹ کی طرف سے منتخب ہوتا ہے مگر وہ خود پارلیمنٹ کو برطرف کر سکتا ہے۔ ارکان کو بالطبع یہ فکر ہوگی کہ جس اعزاز کو انھوں نے بڑی تمناؤں سے حاصل کیا ہو اسے جو قوت غارت کر سکتی ہو اس قوت کو موزوں ہاتھوں میں ہونا چاہئے۔ وہ یہ جرأت نہیں کر سکتے کہ کسی ناموزوں ہاتھ میں اقتدار و اختیار دیدیں جو قوم کو نقصان پہنچانے کے علاوہ خود ان کو بالکلیہ تباہ کر سکتا ہو۔ اس لئے ہم یہ یقین کر سکتے ہیں کہ جب کبھی فریق غالب میں تفرقہ پڑا ہو تو کابینی حکومت کی غیر شاہی صورت ایک معقول قابل پارلیمنٹی سرگروہ ضرور مہیا کریگی یعنی اگر بہترین نہیں تو ایک بہت اچھا وزیر اعظم، مامور کرے گی کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاہی صورت اس سے

کچھ زیادہ کرتی ہے۔؟

میرے خیال میں ایک صورت میں ایسا ہو سکتا ہے۔ اگر آئینی بادشاہ اپنی قوت تمیزی میں یگانہ طبیعت کا غیر متعصب اور بہت بڑی سیاسی واقفیت کا شخص ہو تو وہ اس منقسم فریق کی صفوں ہی میں سے اس کے بہترین سرگروہ کو چن سکتا ہے، اور یہ بھی ایسے وقت میں جبکہ اس فریق کو اگر بحال خود چھوڑ دیا جائے تو وہ اس شخص کو نامزد نہ کرے گا۔ اگر بادشاہ میں یہ قابلیت ہو کہ وہ اس کامل ہوشمند مگر قطعی بیغرض تماشائی کی طرح کام کر سکے (جسے بعض صاحبان اخلاق کی تصانیف میں اسقدر نمایاں جگہ دیجاتی ہے) تو اسے یہ موقع حاصل ہے کہ وہ اپنی رعایا کے لئے اس سے بہتر شخص کا انتخاب کرے جیسا خود رعایا کرتی لیکن اگر بادشاہ ہر طرح کے تعصب سے اس طرح مبرا نہ ہو اور اس قسم کی ممیز نا قوت تمیزی نہ رکھتا ہو تو پھر یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ اس سے بہتر شخص کا انتخاب کرے گا جیسا خود فریق نے کیا ہو یہ یقین ہے کہ دانائی کے ساتھ انتخاب کرنے میں اس کے لئے وہی وجہ محرک نہیں ہوتی جو اہل فریق کے لئے ہوتی ہے، جو کچھ بھی واقع ہو بادشاہ کی جگہ قائم و برقرار رہے گی مگر ایک تقرر کنندہ فریق کی ناکامی اس کے مقرر کردہ شخص کی ذات پر منحصر ہے۔

نیز، یہ خطرۂ عظیم بھی لگا رہتا ہے کہ بادشاہ کی رائے سابقہ خیالات سے متاثر ہو جائے چالیس برس سے زیادہ تک جارج سوم کی ذاتی ناگواریاں کامیاب نظم و نسق کے راستہ میں بڑی دقتیں حائل کرتی رہیں۔ اپنے دور کے شروع ہوتے ہی اس نے لارڈ چیتھم کو وجود معطل کر دیا اور اپنے دور کے آخری زمانہ میں وہ مسٹر پٹ کو یہ اجازت دینے پر رضامند نہ ہوا کہ وہ مسٹر فاکس سے متفق ہو کر کام کرے۔ وہ ہمیشہ معمولی طبیعت کے شخصوں کو ترجیح دیتا، اعلیٰ قابلیت کو بالعموم ناپسند کرتا، اور بلند خیالات سے ہمیشہ منقبض رہتا تھا۔ آئینی بادشاہ اگر محدود قابلیت اور عام لیاقت کے معمولی آدمی ہوں (اور ہمیں یہ فرض کرنے کا کوئی حق بھی نہیں ہے کہ کسی معجزے کی رو سے وہ اس سے بہتر ہو جائینگے) تو بادشاہ کا فیصلہ اکثر کسی فریق کے فیصلہ سے بدتر ہی ہوگا اور اس کے ساتھ اکثر یہ خطرۂ مزمن لگا رہے گا کہ وہ ایڈنگٹن کے ایسے کسی باعزاز عامی شخص کو پٹ کے ایسے آزاد خیال اور اول درجہ کے آدمی پر ترجیح دیدے گا۔

اگر ہم کابینی حکومت کے نازک وقت میں یعنی جب تین فریق ہوں، دونوں طریقوں کے تحت میں وزیر اعظم کے انتخاب کی جانچ کریں تو پھر ہم اسی قسم کے مخلوط نتیجہ پر پہنچیں گے

یہ وہ صورت ہے کہ جس میں حکومت کی اس نوع (یعنی کابینی حکومت) کے نقائص کا ظاہر ہونا نہایت ہی یقینی ہے اور اس کی خوبیوں کے ظاہر ہونے کی بہت ہی کم توقع ہے۔ اس حکومت کی تعریف ہی میں یہ خصوصیت داخل ہے کہ اس میں جماعت عاملہ کا انتخاب جماعت وضع قوانین کی طرف سے ہوتا ہے مگر جب تین فریق ہوں تو قابل اطمینان انتخاب ناممکن ہے۔ واقعی اچھا انتخاب وہ ہے جو ایک بہت بڑے فریق غالب کی طرف سے ہو جسے اپنے انتخاب کردہ لوگوں پر اعتماد ہو مگر جب تین فریق ہوں تو اس قسم کا اعتماد نہیں ہوتا جو فریق تعداد کے اعتبار سے سب میں کمزور ہوتا ہے اسکی رائے فیصلہ کن ہو جاتی ہے، وہی یہ قرار دے سکتا ہے کہ کونسا امیدوار منتخب کیا جائے۔ مگر اس کا تاوان بھی اسے دینا پڑتا ہے کیونکہ وہ اس طرح خود اپنے امیدوار کے لئے رائے دینے کا حق زائل کر دیتا ہے وہ خود اپنے مورد عنایت شخص سے دست بردار ہو جانے کی شرط پر یہ طے کرتا ہے کہ دوسرے لوگوں کے مورد عنایت اشخاص میں سے کس کا انتخاب ہو۔ جو پسندیدگی اس طرح کی خود انکاری پر مبنی ہو وہ کوئی مستحکم پسندیدگی نہیں ہو سکتی۔ یہ ایسی پسندیدگی ہے جسے ہر لمحہ واپس لیا جا سکتا ہے۔ ۱۸۵۸ء کے واقعات اگرچہ میرے مقصود کی کامل وضاحت نہیں کرتے مگر پھر بھی ان سے کافی وضاحت ہوتی ہے۔ ریڈیکل (استیصالی) فریق جو معتدل لبرل فریق سے علیحدہ ہو کر کام کر رہا تھا، اس نے لارڈ ڈربی کو برسر اقتدار بنائے رکھا۔ انتہائی ترقی پسند فریق نے اسے مناسب سمجھا کہ وہ "سکون پسند" فریق کے ساتھ متفق ہو جائے۔ چنانچہ انھیں میں سے ایک شخص نے درشتی مگر صفائی کے ساتھ یہ بات کہی کہ "وہ ہم ان لوگوں کے تحت میں رہکر اپنی روش پر اس سے زیادہ چل سکتے ہیں جتنا ان لوگوں کے تحت میں چلتے"۔ اس کا مقصود یہ تھا کہ اس کی رائے میں وھگوں کے بہ نسبت ٹوری استیصالیوں کے زیادہ مطیع و منقاد ہوتے ہیں۔ مگر یہ صاف عیاں ہے کہ ایسے نمایاں مخالف گروہوں کا اتحاد دیرپا نہیں ہو سکتا۔ استیصالیوں نے یہ اتحاد ایسے لوگوں کو منتخب کر کے خریدا جنکے اصول ان کے اصول سے بغایت متبائن تھے۔ کنسرویٹو گروہ نے ایسی کارروائیوں سے اتفاق کر کے اسے خرید کیا جسکی حد وسعت ان کے بالکل مخالف تھی۔ کچھ مدت کے بعد استیصالیوں کو معتدل وھگوں سے پھر بد دلی ہوگئی اور وہ انکے مخالفہ سے پلٹ گئے وہ اپنی فیصلہ کن رائے وہی کو پہلے ایک خیال کی حکومت کے قیام کے لئے کام میں لائے،

اس کے بعد اس کے مخالف خیال کی حکومت کے کام میں لائے۔

میں اس روش پر الزام نہیں لگاتا ہوں، بلکہ اس سے صرف توضیح کا کام لے رہا ہوں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اگر ہم اپنے ذہن میں سوچیں کہ جب اس قسم کے کام میں بہت ہی غلو اور بہت ہی طوالت ہو جائے تو پھر پارلیمنٹی حکومت ناممکن ہو جائے گی۔ اگر تین فریق ہوں گے اور ان میں سے کوئی دو فریق ملکر کام کرنے کے لئے باستقلال متحد نہ ہوں گے اور کمزور ترین فریق دوسرے دو فریقوں کے پلّوں کو اپنی تائید سے بہت جلد جلد زیر زبر کرتا رہے گا تو کابینی نظم سلطنت کی شرط اولین قابل اطمینان طور پر انجام نہ پائے گی۔ کوئی پارلیمنٹ ایسی نہ ہو گی جو انتخاب کے لئے موزوں ہو اور ہم ایک ایسی جماعت عاملانہ کے انتخاب کی طرف سے مطمئن نہ ہو سکیں گے جس میں کافی حد تک استقلال موجود ہو کیونکہ خود انتخاب کنندوں کے خیال و احساس میں استقلال نہ ہو گا۔

کابینی حکومت کی ہر نوع میں خواہ وہ شاہی ہو یا غیر شاہی، اس نقص کا علاج صرف ایک ہی طریقہ سے ہو سکتا ہے۔ ہر فریق کے اعتدال پسند اشخاص کو اس حکومت کی تائید کے لئے متفق ہو جانا چاہئیے، جو بہ حیثیت مجموعی ہر ایک فریق کے لئے بہترین طور پر موزوں ہے یہی وہ طریقہ ہے جس نے اب سے کچھ زمانہ پیشتر لارڈ پامرسٹن کا نظم و نسق قائم رکھا تھا۔ یہ وزارت بہت سے امور میں ناقص تھی مگر بیرون ملک میں اسکی نفع بخش پر زور قوت اور اندرون ملک میں اسکی مفید مستعدی انگلستان کی بہت سی وزارتوں سے زیادہ سود مند تھی۔ کنسرویٹو اور استیصالی فریق کے اعتدال پسند اشخاص نے اعتدال پسند دھڑوں کے ساتھ کافی مربوط اتحاد کے ذریعہ سے ایک مستحکم حکومت کو قائم رکھا ہے۔ بادشاہ ہو یا نہ ہو، پارلیمنٹی حکومت کے اس سبب سے بڑے امتحان کے وقت میں بھی تحفظی خود انکاری وہ خاص قوت ہے جس پر اس حکومت کے قابل اطمینان طور پر قائم رہنے کا بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا بادشاہ کے اضافہ سے اس اعتدال میں کچھ مدد ملیگی یا اور دقت لاحق ہو گی؟۔ آیا یہ طریقہ شاہی قسم کی وزارتی حکومت میں زیادہ موثر ہو گا یا کم؟

اگر بادشاہ میں قوت تیزی موجود ہے تو ایسے نازک وقت میں جو مدد وہ دے سکتا ہے وہ بہت بڑی مدد ہو گی۔ وہ اپنی وزارت کے لئے ایسے مدبر کو منتخب کرے گا اور اگر ممکن ہو گا تو ایسے مدبر کو قائم رکھے گا جس پر آخر الامر اعتدال پسند فریق کی نظر پڑے گی

مگر ابھی ابتدائے کار میں یہ اعتدال پسند فریق اندھوں کی طرح سے اس کی تلاش میں مشغول ہوگا۔ بادشاہ بوجہ صاحب فہم، تجربہ کار، و باتدبیر ہونے کے یہ سمجھ لے گا کہ توازن قوی کا اجتماع کس طرح پر ہے اور وہ کونسا حصہ ہے جس کے ساتھ دوسرے حصص کے نرم مزاج ارکان آخر الامر وابستہ ہو جائینگے۔ ژولیدہ فریقوں کے تغیر پذیر تقلیبات کے درمیان اغلب یہ ہے کہ اسے اپنے انتخاب کو عمل میں لانے کے بہت سے مواقع ملجائینگے اس امر کا انحصار بادشاہ ہی پر ہوگا کہ وہ زید کو نظم و نسق قائم کرنے کے لئے طلب کرے یا عمرو کو، اور دونوں کو قسمت آزمائی کا موقع ملسکتا ہے۔ فریقوں کی ابتر حالت یقین و استقلال کے منافی ہے مگر اس میں وقتی و آئینی رواداری کے بہ کثرت مواقع حاصل ہیں۔ ان فریقوں کو کسی شئے کی حاجت محسوس ہوتی ہے مگر وہ قطعی طور پر نہیں جانتے کہ وہ شے کیا ہے اور اس لئے وہ ایک قلیل زمانہ کے لئے کسی شئے کو بھی اس خیال سے قبول کر لینگے کہ آیا یہ وہی غیر معلوم شئے تو نہیں ہے جس کی انھیں جستجو ہے یا یہ کہ اس سے کیا کام انجام پاتا ہے۔ کمزور حکومتوں کا اس تمام طولانی مسلسل دور میں جو ۱۷۶۲ء میں ڈیوک نیوکیسل کے مستعفی ہونے سے شروع ہو کر ۱۷۸۴ء میں مسٹر پٹ کے فائز ہونے پر ختم ہوا، جارج سوم کا پر زور عزم ایک اول درجہ کی وسیع الاثر قوت کا کام دیرہا تھا اگر فریقوں کے تفرقہ کے اس پیچیدہ و طولانی دور میں جن کا ہر ایک دیرپا پارلیمنٹی حکومت میں بکثرت واقع ہونا اور دیر تک قائم رہنا یقینی ہے، شاہی انتخاب کی بیرونی قوت ہمیشہ دانشمندی کے ساتھ استعمال کیجائے تو یہ ایک ایسا سیاسی نفع ہے جس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

مگر سوال یہ ہے کہ اس پر اس طرح سے عمل بھی ہوگا یا نہیں؟ ایک دستوری بادشاہ حکومت کی معمولی روش و رفتار میں ایک معمولی ہی قابلیت کا شخص ہوگا بلکہ مجھے تو یہ اندیشہ ہے کہ موروثی خاندانوں کی سریع الاخذ کمزوری پر نظر کرتے ہوئے ہمیں اس کا متوقع رہنا چاہئے کہ وہ ایک پست تر قابلیت کا شخص ہوگا۔ اصول و تجربہ دونوں سے یہی سبق ملتا ہے کہ شہزادوں کی تعلیم ضرور کمزور ہوتی ہے اور شاہی خاندان میں بالعموم دوسرے خاندانوں کے بہ نسبت قابلیت کم ہوتی ہے۔ پس ہم کس بنا پر یہ توقع کریں کہ ایک خاندان میں موزوں و مناسب قوت تمیز کا ورثہ نسلاً بعد نسلٍ ہمیشہ چلا آئے گا کیونکہ قوت تمیز اگر

ایک طرح کی ذکاوت نہیں ہے تو بدرجۂ اقل نایاب ضرور ہے۔

غالباً اکثر و بیشتر صورتوں میں کسی دستوری بادشاہ کی بڑی سے بڑی دانشمندی کا ثبوت یہ ہوگا کہ وہ خوب سمجھ بوجھ کر اپنے کو عملی کارروائیوں سے علیحدہ کئے رہے ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۹ء کے ناگوار وقفوں میں ملکہ اور شہزادۂ البرٹ نے بڑی ہی دانشمندی کی کہ اپنی طرف سے کسی شخص کو منتخب کرکے دقت نہیں ڈالی اگر وہ کسی کا انتخاب کرتے تو اغلب یہ ہے کہ لارڈ پامرسٹن کا انتخاب نہ کرتے، مگر انھوں نے یہ سمجھا کہ دنیا ان کی مداخلت کے بغیر حالت سکون میں آجاتی ہے اور اس لئے ایک بیرونی قوت کی مداخلت سے اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ اندرونی قوتوں کی وجہ سے جو مفید سکون پیدا ہو رہا ہے، اس میں اور تاخیر ہو جائے۔ اگر انھوں نے بالفرض ایسا نہ بھی سمجھا ہو تو ہمیں یہ فرض کرلینا چاہئے کہ انھوں نے ایسا ہی سمجھا تھا۔ فی الواقع ایک دائمی وجہ ایسی ہے کہ جو عاقل ترین اور ایسے بادشاہ کو جسے اپنی عقل پر نہایت ہی اعتماد ہو، خود اپنی عقل سے کام لینے میں نہایت ہی سست رفتار بنادے گی۔ وہ وجہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ کی ذمہ داری پارلیمنٹ کو محسوس ہونا چاہئے۔ جبتک پارلیمنٹ کا خیال یہ رہے گا کہ ارباب حکومت کا مہیا کرنا بادشاہ کا کام ہے، اسوقت تک یہ یقینی ہے کہ وہ خود اس کا انصرام نہ کرے گی۔ وزارتی حکومت کی شاہی صورت اگر معاون آلہ کو اصلی قوت بنادے یعنی اگر وہ اس مجلس کو جسے اعلیٰ فرائض انجام دینا چاہئے تھے، اس طرف مائل کردے کہ وہ ان فرائض کی انجام دہی کی توقع کسی دوسرے سے کرے تو یہ تمام صورتوں میں بدترین صورت ہوگی۔

انصاف یہ ہے کہ کابینی حکومت کی غیر شاہی قسم کے معاملہ میں اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ وہ شاہی نوع کے ایک سب سے بڑے اور نہایت ہی خاص نقص سے پاک ہے۔ جہاں دربار نہ ہوگا وہاں دربار کا برا اثر بھی نہ ہوگا۔ یہ اثرات کیا ہیں اسے ہر شخص جانتا ہے۔ اگرچہ کوئی شخص کیسا ہی اعلیٰ امبصر کیوں نہ ہو، اعتماد و قطعیت کے ساتھ یہ نہیں بتاسکتا کہ یہ اثر کتنا وسیع ہے۔ ملکۂ کیرولین کے انتقال کے بعد سر رابرٹ والپول نے ایسے الفاظ میں جو اس زمانہ کے آداب کے لحاظ سے نہایت مذموم معلوم ہونگے یہ کہا تھا کہ وہ بادشاہ کی لڑکیوں سے کوئی سروکار نہ رکھیگا بلکہ وہ اپنے کام کا تمام و کمال انحصار بادشاہ کی داشتہ میڈم ڈے والموڈن پر رکھیگا (شہزادیوں کی نسبت

اس نے ”دو ان لڑکیوں“ کے الفاظ استعمال کئے تھے)۔ جارج چہارم کے وقت کا ایک صاحب قلم یہ لکھتا ہے کہ ”بادشاہ ہمارا جانبدار ہے اور اس سے بڑھکر مفید مقصد یہ ہے کہ بارٹیشن کونگھم بھی ہماری حامی ہے۔“ ہر شخص جانتا ہے کہ اطالیہ کے اتحاد کے بعد سے اطالوی حکومت میں متعدد تغیرات کس قسم کے اثرات کی طرف منسوب ہیں۔ یہ مکروہ کارروائیاں اکثر اسی وقت سب سے زیادہ زور دکھاتی ہیں جب اور ہر شے میں ابتری پیش آجاتی ہے، اور اس لئے اس موقع پر وہ خصوصیت کے ساتھ خطرناک بھی ہوجاتی ہیں۔ نہایت ہی درشت مزاج اور نہایت ہی بداطوار بادشاہ بیگم بھی ایک ناقابل رخنہ نظم ونسق کے خلاف سازش نہیں کرے گی مگر جب پارلیمنٹ حیرانی میں پڑجائے، فریقوں میں تفرقہ رونما ہوجائے، کاموں کے بہت سے پہلو نکل آئیں، بہت سے مضر امور کا امکان پیدا ہوجائے، اور کابینی حکومت کا سنبھالنا دشوار ہوجائے، ایسے وقتوں میں بہت سی بیگمات سازش کے لئے آمادہ ہوجائینگی۔

اس امر پر نظر کرنا بہت ضروری ہے کہ آیا بادشاہ کے بغیر بھی ایک اچھے نظم ونسق کا آغاز ہوسکتا ہے کیونکہ بعض مستعمری مدبروں نے اس میں شک ظاہر کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ”میں یہ تصور ذہن میں قائم کرسکتا ہوں کہ وزارت جب قائم ہوجائے تو بغیر گورنر (والی) کے بھی بہت اچھی طرح چلتی رہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا آغاز قیام کیسے ہو“ یہاں تک خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ ایک نوآبادی جس نے انگلستان سے قطع تعلق کرلیا ہو اور اسے خود اپنی حکومت قائم کرنا ہو، اس کے لئے یہ امر دانائی کے خلاف نہ ہوگا کہ وہ عمر بھر کے لئے ایک گورنر کا انتخاب کرلے اور اس کے پسند کردہ وزرا پر کلیتہً اعتماد کرے، یہ والی کم وبیش ایسا ہی ہوگا جیسا آبے سی ایس نے ”والی اعظم“ کا عہدہ تجویز کیا تھا، مگر اس قسم کی نوآبادی میں ایسے عہدے کا آغاز کرنا درحقیقت ایک خودساختہ مصنوعی وقت کا پیدا کرنا ہوگا یہ عہدہ دار ایک نہ ایک فریق سے تعلق رکھنے والا شخص ہوگا سلطنت کا سب سے زیادہ باعظمت منصب ان بڑے بڑے فرقوں کی معرکہ آرائی کا موضوع بن جائے گا جن میں ہر ایک مستعمرہ کا سیاسی قوم منقسم ہوتی ہے۔ یہ فرقے ہر چیز میں دخیل اور رہر کام میں دراندازی ہوتے ہیں وہ نہ ایسا کرنا چاہیں گے اور نہ ایسا کرسکتے ہیں کہ تمام منصبوں میں سب سے زیادہ ممتاز ونمایاں منصب کا تقرر ان کی مرضی کے بغیر ہوجائے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ والی اعظم یعنی وزارتوں کا مقرر کرنے والا کسی سخت نازک موقع پر ایک اچھا دوست بھی ہوسکتا ہے

اور ایک بڑا دشمن بھی بن سکتا ہے۔ سب سے زبردست فریق کسی ایسے شخص کو منتخب کرے گا کہ اگر کوئی موقع جانبداری کا آجائے تو وہ ان کا جانبدار ہو جائے، اگر وہ کسی طرف مائل ہو تو انھیں کی طرف مائل ہو، جو ان کے لئے ہمیشہ ممد و معاون اور ان کے مخالفوں کیلئے ہمیشہ باعث دقت بنا رہے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ معرکہ آرا فریقانہ انتخاب کے ذریعہ سے کسی ایسے شخص کو منتخب کیا جائے جو بغیر کسی طرح کی جنبہ داری کے وزیروں کو منتخب کرے۔

مگر بادشاہ کے فرائض کے متعلق وزارت کے آغاز قیام کے وقت سے زیادہ اسکے دورانِ قیام میں اکثر لوگوں کو خاص دلچسپی ہوتی ہے اور اکثر لوگ اسی دوران میں ان فرائض کو شدید ترین اہمیت دیتے ہیں، مجھے یہ اعتراف ہے کہ میں خود بھی اسی رائے کا شخص ہوں، میرے خیال میں یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ ایک دستوری بادشاہی کے تحت میں ایک ذی علم وسیاسی قوم پر بادشاہی کرنے کا منصب ایک ایسا منصب ہے جسے ایک عقلمند ہر ایک منصب سے مقدم رکھے گا۔ اس منصب پر فائز ہونے کے بعد اسے اعلیٰ ذہنی قوے کے لئے بہترین محرکات مہیا ملیں گے اور ادنیٰ ذہنی قوے کے روک کا بہترین سامان بھی موجود ہو گا۔

قیام حکومت کے دوران میں ملکہ کے فرائض کے متعلق ہمارے پاس ایک بینظیر تحریر خود ملکہ کے ہاتھ کی موجود ہے۔ ۱۸۵۱ء میں لوئی نپولین اپنی حکمت عملی سے بادشاہ بن گیا اور ۱۸۵۲ء میں لارڈ جان رسل نے اسی طرح کی حکمت عملی سے لارڈ پامرسٹن کو خارج کر دیا۔ لارڈ مذکور ایک نہایت سبق وہ ترک آداب کا مرتکب ہوا اس نے ایوان میں اپنے رقیب کے فرائض کے متعلق ایک شاہی یادداشت پڑھکر سنائی، اس یادداشت میں لکھا تھا کہ دو ملکہ یہ چاہتی ہیں کہ اولاً لارڈ پامرسٹن کسی خاص معاملہ میں جو کچھ تجویز کرے، اسے صاف طور پر بیان کیا کرے تاکہ ملکہ صاف طور پر یہ سمجھ لیا کریں کہ وہ کس امر کے متعلق اپنی شاہی منظوری صادر کر رہی ہیں، ثانیاً یہ کہ جب وہ اس قسم کی کارروائی پر ایک مرتبہ اپنی منظوری دیدیں تو پھر وزیر اپنی ذاتی رائے سے اس میں تغیر و ترمیم نہ کرے۔ اس قسم کے فعل کی نسبت وہ یہ تصور کریں گی کہ تاج کے ساتھ راستبازی سے انحراف کرنا ہے اور اس صورت میں اس وزیر کے برطرف کر دینے میں اپنے دستوری حق سے بجا طور پر کام لیں گی۔ ان کو یہ بھی توقع ہے کہ لارڈ مذکور اور

غیر ممالک کے سفرا کے درمیان جو کچھ معاملات پیش آتے ہوں، ان کی بنا پر کوئی اہم فیصلہ کرنے سے قبل ملکہ کو اطلاع دیتے رہنا چاہئے۔ غیر ملکی مراسلات مناسب وقت میں بھیجنے چاہئیں اور مسودات منظوری کے لئے اتنے کافی وقت سے آنا چاہئیں کہ ان کے واپس کرنے سے قبل ملکہ ان کے مطالب سے آگاہ ہو سکیں؛

خاص خاص وزرا اور بالتخصیص وزیر خارجہ پر نگرانی رکھنے کے علاوہ ملکہ ایک حد تک کابینہ پر بھی نگران رہتی ہیں۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ وزیر اعظم تمام اہم ترین فیصلوں کی مستند اطلاع ملکہ کو بہم پہنچاتا ہے، اس کے ساتھ اخبارات میں جو کچھ ہوتا ہے اور پارلیمنٹ میں جو زیادہ وسیع فیصلے ہوتے ہیں ان کی بھی اطلاع دیتا ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اس امر کی فکر رکھے کہ قوم کے اندر سیاسیات میں جو کچھ پیش آرہا ہو اس کے متعلق جو کچھ جاننے کے قابل ہو اس سے ملکہ کو آگاہی ہوتی رہے۔ نہایت قوی رواج و دستور کے بموجب ملکہ کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر اسے وزارت کے ہر ایک اہم معاملہ کی خبر اس کام کے انجام پانے کے قبل ہی نہیں بلکہ ایسے وقت سے ہو جائے کہ ہنوز اس پر غور کرنے کا وقت باقی ہو یعنی ایسے وقت سے کہ ہنوز اس کے ترک کا موقع موجود ہو، تو وہ اسکی شکایت کرے۔

اس معاملہ کو مختصر الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ انگریزوں کی دستوری بادشاہت کے تحت میں بادشاہ کے تین حق ہیں، اسے یہ حق حاصل ہے کہ اس سے مشورہ لیا جائے، وہ کسی کام کی ہمت افزائی کرے، یا کسی کام سے متنبہ کرے، اور ایک اعلیٰ فہم و فراست کے بادشاہ کو اس سے زیادہ کی خواہش بھی نہ ہوگی۔ اس کو یہ محسوس ہوگا کہ اور دوسرے حقوق کے نہ ہونے سے اسے یہ موقع ملتا ہے کہ وہ ان حقوق کو نمایاں اثر کے ساتھ استعمال کرے۔ وہ اپنے وزیر سے یہ کہے گا کہ "ان کارروائیوں کی ذمہ داری تمہارے اوپر ہے، تم جس امر کو بہتر سمجھوگے اسی پر عمل ہوگا، تم جس امر کو بہتر سمجھوگے اسے میری کامل و موثر تائید حاصل ہوگی، مگر تمھیں یہ سوچ لینا چاہئے کہ تم جو کچھ تجویز کرتے ہو وہ فلان فلان وجہ سے برا ہے، اور جو تم تجویز نہیں کرتے وہ فلان فلان وجہ سے بہتر ہے میں مخالفت نہیں کرتا، مخالفت کرنا میرا فرض نہیں ہے مگر یہ خیال رکھو کہ میں تمھیں متنبہ کئے دیتا ہوں"۔ فرض کر لیجئے کہ بادشاہ راستی پر تھا اور اس میں پر زور اظہار خیال کی قابلیت بھی تھی جو اکثر بادشاہوں میں ہوتی ہے تو یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے

وزیر پر اثر نہ ڈالے۔ بادشاہ ہمیشہ وزیر کو اس کی روش سے ہٹا نہیں سکتا مگر وہ ہمیشہ اسکے دل میں اضطراب پیدا کر دے گا۔

ایک طویل دور حکمرانی میں ایک باخبر بادشاہ ایسا تجربہ حاصل کریگا جو کم کسی وزیر کو حاصل ہو سکتا ہے۔ بادشاہ یہ کہہ سکتا ہے کہ "تم نے ان معاملات کا ملاحظہ کیا ہے جو فلاں فلاں شخصوں کے انتظام میں پیش آئے تھے یہ کوئی چودہ برس قبل کا واقعہ ہے۔ ان سے ان برے نتائج کی ایک سبق آموز مثال ملتی ہے جو تمھارے پیش کردہ تجاویز کا لازمی نتیجہ ہونے والے ہیں۔ اس زمانہ میں تم زندگی عامہ میں اسقدر نمایاں حصہ نہیں لیتے تھے جتنا اب لیتے ہو اور ممکن ہے کہ تمھیں تمام واقعات یاد نہ ہوں۔ میں تمھیں یہ رائے دونگا کہ تم ان معاملات پر دوبارہ نظر ڈالو اور تمھارے رفقا میں سے جو لوگ ان معاملات میں شریک رہے ہوں ان سے گفتگو کرو۔ یہ ایک غیر دانشمندانہ حرکت ہے کہ جو روش اسقدر قریب زمانہ میں ایسی ناقص ثابت ہو چکی ہے اسے پھر جاری کیا جائے"۔

فی الحقیقت بادشاہ کو وہ فوقیت حاصل ہوگی جو ایک مستقل مددگار معتمد کو اپنے افسر اعلیٰ یعنی پارلیمنٹی معتمد پر حاصل ہوتی ہے یعنی وہ سابق کے پارلیمنٹی معتمدوں کی کارروائیوں میں شریک رہچکا ہوتا ہے یہ کارروائیاں خود اس کی زندگی کا جزو ہوتی ہیں، اس کے بہترین خیال اس پر صرف ہوتے ہیں، شاید اسے ان سے تردد ہوا ہو، شاید اسے ان سے خوشی حاصل ہوئی ہو، اس کے میلان کے خلاف ان کا آغاز کر دیا گیا ہو یا اس نے بطیب خاطر ان کی منظوری دی ہو۔ پارلیمنٹی معتمد کو ایک دھندلا سا خیال ہوتا ہے کہ اسکے پیشروؤں میں سے کسی کے زمانہ میں کچھ ہوا تھا جبکہ وہ خود اس قسم کے معاملات عامہ کے متعلق بہت ہی کم کچھ جانتا تھا یا بہت ہی کم کچھ فکر کرتا تھا۔ جن امور کی طرف مددگار معتمد کا ذہن آن واحد میں صاف طور پر پہنچ جاتا ہے انھیں امور کو سیکھنے سمجھنے کے لئے معتمد کو محنت کے ساتھ ادھورے طور پر آغاز کرنا پڑتا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ پارلیمنٹی معتمد اپنے ماتحت کو اپنے مرتبہ کے پر سکوت اثر سے خاموش کر سکتا ہے اور وقتاً فوقتاً ایسا کرتا بھی ہے، وہ کہتا ہے کہ "میں سمجھتا ہوں کہ اس تمام کارروائی میں کچھ نہیں رکھا ہے جس زمانہ کا تم ذکر کر رہے ہو اس میں بہت سی غلطیاں ہوئیں تھیں اور ہمیں اب ان پر بحث کرنے کی حاجت نہیں ہے"۔ ایک باشکوہ شخص بہت آسانی سے

ان تمام مشوروں کو نظر انداز کر دیتا ہے جو اس کے ماتحت پیش کرتے ہیں لیکن ایک وزیر اپنے ماتحتوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کر سکتا ہے، بادشاہ کے ساتھ وہ اس قسم کا سلوک نہیں کر سکتا مسلمہ فوقیت کی وہ معاشری قوت جس سے اس نے اپنے مددگار معتمد کو دبا دیا تھا، اسوقت وہ قوت اسکی جانب نہیں بلکہ مخالف کی جانب ہوتی ہے۔ اسے اب اپنے ایک مسلمہ زیر دست کے با ادب اشارات پر لحاظ کرنا نہیں ہے بلکہ ایک بالادست کے دلائل کا جواب دینا ہے جس کے سامنے اُسے خود مودب رہنا پڑتا ہے۔ فی الحقیقت جارج سوم سرکاری کاموں کے ظاہری ضوابط کو اپنے زمانے کے ہر ایک مدبر کے برابر بلکہ ان سے بہتر جانتا تھا۔ اگر کام کرنے اور محنت برداشت کرنے کی قابلیت کے ساتھ اس میں مردم شناس مدبر کے اعلیٰ صفات بھی موجود ہوتے تو اس کا اثر مطلق العنانہ ہو جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ انگلستان کا قدیم دستور سلطنت بادشاہ کو ایک طرح کا اختیار ایسا دیتا تھا جو موجودہ دستور سلطنت کی رو سے نہیں دیا جاتا جس زمانہ میں پارلیمنٹ میں کثرت رائے زیادہ تر شاہی سرپرستی سے خرید کیجاتی تھی، اس زمانہ میں بادشاہ خواہ اپنے وزیر کی وساطت سے یا بغیر اس کی وساطت کے اس معاملہ میں ایک فریق ہوتا تھا مگر اس موجودہ دستور سلطنت میں بھی جارج سوم کا ایسا اعلیٰ قابلیت کا بادشاہ بہت ہی بڑا اثر حاصل کر لیگا۔ تمام یورپ جانتا ہے کہ بلجیم میں شاہ لیوپولڈ نے اس قسم کے ذرائع کے استعمال سے جن کا میں ذکر رہا ہوں بے اندازہ اختیارات کا استعمال کیا ہے۔

نیز جو لوگ حال کی تاریخ انگلستان کی اصلی رفتار کے واقفکار ہیں وہ سب یہ جانتے ہیں کہ ٹھیک اسی طریقہ پر شہزادہ البرٹ نے بھی بہت بڑی قوت حاصل کر لی تھی۔ دستوری بادشاہ کے نادر صفات ان میں موجود تھے۔ اگر ان کی زندگی بیس برس اور وفا کرتی تو ان کا نام بھی تمام یورپ میں ایسا ہی مشہور ہو جاتا جیسا شاہ لیوپولڈ کا نام مشہور ہے۔ جس زمانہ میں وہ زندہ تھے ان کا پہلو دبا ہوا تھا، اس زمانہ میں انگلستان میں جن مدبروں کو سب سے زیادہ قوت حاصل تھی وہ ان سے بدرجہا زیادہ بڑھے ہوئے تجربہ کے لوگ تھے۔ لارڈ پامرسٹن پر وہ اگر قادرانہ اثر نہیں تو بہت وسیع اثر ڈال سکتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایسا کرتے تھے

مگر وہ لارڈ پامرسٹن پر حکومت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بڈھا مدبر جو انگلستان پر اس عمر میں حکمرانی کرتا تھا جب اکثر لوگ خود اپنے خاندانوں پر حکمرانی کرنے کے ناقابل ہو جاتے ہیں، وہ ان مدبروں کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھا جو شہزادہ البرٹ کے پیدا ہونے سے قبل مر چکے تھے۔ یہ دونوں مختلف عمر اور مختلف طبیعت کے شخص تھے۔ جرمانی شہزادے کی نزاکت (جسے خوش نصیبی سے بجا طور پر گیوٹے کی نزاکت سے تشبیہ دیگئی ہے)' اس نیم آئرلینڈی اور نیم انگریز مدبر کے لئے ایک بالکل ہی اجنبی شے تھی۔ لارڈ پامرسٹن کے نقائص یہ ہیں کہ وہ چھوٹے چھوٹے خطروں کے موقع پر کسی قدر شور و شغب کے ساتھ جسارت کا اظہار کرتا تھا اور معمولی معمولی باتوں میں ہمیشہ پرزور دقتیں حائل کر دیتا تھا مگر اس میں نفاست و شائستگی کا پہلو ہمیشہ مدنظر نہیں رکھتا تھا، شہزادہ البرٹ کے لئے جس میں ایک عالم کی سی احتیاط اور ایک عالم کی سی ہمت موجود تھی یہ باتیں بے شک و شبہ دلخراش ہوتی تھیں۔ یہ واقعات ہیں تو نہیں مگر ہمارے لڑکوں کے لڑکوں کو معلوم ہو جائیں گے۔ شہزادہ البرٹ نے بہت کچھ کیا مگر اس سے قبل ہی ان کا انتقال ہو گیا کہ وہ اپنا اثر مدبروں کی ایک ایسی نسل پر ڈالتے جو خود ان سے تجربہ میں کم اور ان سے سیکھنے کے شائق ہوتی۔

یہ فرض کرنا بالکل بچوں کی سی بات ہے کہ ایک وزیر اور اس کے بادشاہ کے درمیان جب مشاورت ہو تو وہ خالص مباحثہ کی مجلس بنجائے۔" وہ ربانیت جو ایک بادشاہ پر سایہ فگن ہوتی ہے، "ممکن ہے کہ اسے جو تقدس پہلے حاصل تھا وہ اب نہ رہا ہو پھر بھی اس میں بہت کچھ تقدس موجود ہے۔ کوئی بھی ایسا نہ ہوگا یا شاید ہی کوئی ہو جو ایک وزیر سے خود اسی کے کمرہ میں اسی طرح سے حجت کر سکے جس طرح وہ کسی دوسرے سے اس کے کمرے میں بحث کرتا ہو، وہ جس خوبی کے ساتھ دوسرے کے سامنے اپنے دلائل پیش کرتا اور اس کے دلائل کو مسترد کرتا اس خوبی کے ساتھ نہ وہ وزیر کے سامنے دلائل پیش کر سکتا ہے اور نہ اس کے دلائل کو مسترد کر سکتا ہے۔ ایک بادشاہ کے کمرہ کی حالت اس سے بھی بدتر ہے۔ اس کی بہترین مثال لارڈ چیتھم کی ہے لارڈ موصوف اس وقت تمام انگریز مدبروں میں سب سے زیادہ صاحب تحکم و گردن کش تھا اور تقریباً وہی پہلا انگریز مدبر تھا جو بادشاہ اور امرا دونوں کی

مرضی کے خلاف صاحب اختیار بنایا گیا تھا یعنی وہ عوام کی طرف سے وزیر بنا تھا۔ اندریں حالات ہمیں یہ توقع ہوگی کہ قوم کا یہ پُرغرور وکیل اپنے بادشاہ کے سامنے بھی تحکم سے کام لیتا رہا ہوگا یعنی جیسا وہ دوسروں کے سامنے تھا ویسا ہی بادشاہ کے سامنے بھی رہتا ہوگا، لیکن اس کے برعکس وہ خود اپنی قوت تصوری کا غلام تھا، وہ بادشاہ کے قرب میں مسحور سا ہو جاتا اور اپنی معمولی طبیعت سے ہٹ جاتا تھا۔ مسٹر برک نے کہا تھا کہ "بادشاہ کے کمرہ میں ذرا سا جھانکنے سے بھی وہ از خود رفتہ ہو جاتا ہے اور دم تک اس کی یہی حالت رہے گی"۔ ایک ظریف شخص نے یہ کہا تھا کہ دربار عام میں بھی وہ اسقدر جھکتا ہے کہ تم اس کی تمیمہ ناک کی نوک کو اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان سے دیکھ سکتے ہو۔ اس کی عادت تھی کہ وہ کام انجام دیتے وقت جارج سوم کے بستر کے قریب گھٹنوں کے بل کھڑا رہتا تھا۔ پس کوئی شخص گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر حجت نہیں کر سکتا۔ وہی یہ توہم احساس جو وزیر کی جسمانی ہئیت کو اس طرح بنا دیتا ہے وہ احساس اُسکی دماغی ہئیت کو بھی ایسا ہی بنا دیگا۔ وہ بادشاہ کے ناقص دلائل کی اسطرح سے تردید نہیں کریگا جسطرح وہ دوسرے لوگوں کے ناقص دلائل کی تردید کرتا ہے۔ وہ جب یہ جان لے گا کہ بادشاہ اس کے دلائل کو سننا نہیں چاہتا تو وہ خود اپنے بہترین دلائل کو موثر وقطعی طور پر بیان نہیں کرے گا۔ کسی ایسی بحث میں جس میں دونوں پلے برابر ہوں بادشاہ کا پلہ ہمیشہ جھکا رہے گا اور سیاسیات کی اہم ترین بحثوں میں اکثر دونوں پلے قریب قریب برابر ہی ہوتے ہیں۔ جب کبھی ایسا ہوگا کہ بادشاہ کی رائے کی جانبداری میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے تو اس کا پورا وزن پڑیگا لیکن وزیر کی رائے کی تائید میں جو کچھ کہا جائے گا اس کا وزن ہلکا و کمزور رہے گا۔

علاوہ ازیں نظریہ کے بموجب بادشاہ کو نازک موقع پر انتہائی درجہ میں استعمال کرنے کے لئے ایک اختیار حاصل ہے مگر حسب قانون وہ اس اختیار کو ایک موقع پر استعمال کر سکتا ہے یعنی وہ پارلیمنٹ کو برطرف کر سکتا ہے وہ اپنے وزیر سے لفظاً نہیں مگر معناً یہ کہہ سکتا ہے کہ "اس پارلیمنٹ نے تمھیں یہاں بھیجا ہے مگر میں دیکھوں گا کہ آیا کوئی دوسری پارلیمنٹ بھی ایسی مل سکتی ہے یا نہیں جو کسی دوسرے شخص کو یہاں بھیجے"۔ جارج سوم اس بات کو خوب سمجھتا تھا کہ ایسے اوقات میں اور ایسے امور کے متعلق

مقاومت کرے جب بہ ظن غالب یا بدرجہ اقل اس کی توقع ہو سکے کہ قوم اس کی تائید پر ہوگی۔ ان معاملات میں اس کی عیاری ایسی ہی تھی جیسی کسی مجنوں کی عیاری ہوتی ہے۔ اپنے زمانے کے قابلترین آدمیوں سے اسے معرکہ آرایان کرنا پڑیں مگر وہ کبھی ذرا بھی مضطرب نہ ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ کمزور دلیل کو خفیہ تہدید سے کیونکر مدد پہنچائی جا سکتی ہے اور عادتاً تعظیم کرنے والے شخص کو اس دلیل کا مخاطب کیونکر بنایا جائے۔

غالباً یہ اختیارات ایسے ہیں کہ ایک دانشمند آدمی انکو عمل میں لانے کا بیش از بیش خواہاں اور اسے اپنے قبضہ میں رکھنے سے کم سے کم خائف ہوگا مطلق العنان بننے کی خواہش یا نوانیوں کے الفاظ میں خودسری کے پیچھے جان دینے کی تمنا "ایک غیر تربیت یافتہ دل و دماغ کی علامت ہے جو شخص ایسی خواہش رکھتا ہے وہ بالفاظ تلکر یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ وہ مختلف امور کی حالت کسقدر مشکوک ہے" حصول تیقن کے لئے یہ بجا ہے کہ آپ اپنی مرضی کو بجبر دوسروں پر عاید کر دیں یا اس کے عاید کرنے کی خواہش کریں مگر خود اپنے ہی خیالات کو صاف و قطعی طور پر دیکھنا اور جب تک آپ انھیں اصول زندگی و طریق عمل پر عاید نہ کر سکیں اسوقت تک کرب و اذیت میں مبتلا رہنا، دوسروں کی رایوں کا نسبتاً ناگوار ہونا، اس قابل نہ رہنا کہ سکون کے ساتھ ان دلائل کی صداقت کا اندازہ کر سکیں یہ سب باتیں ہماری موجودہ تہذیب ذہنی کی ناقص حالت کا اظہار کرتی ہیں ہم کم از کم یہ تو جانتے ہیں کہ واقعات بے شمار ہیں، ترقی کی راہ پیچیدہ ہے اور (نوجوانوں کے سے) آتش افروز خیالات اکثر و بیشتر غلط اور ہمیشہ نامکمل ہوتے ہیں۔ ذہن میں ایک ایسے دور بین و مطلق العنان مدبر کا تصور قائم کرنا جو ان زمانوں کے لئے تجاویز قرار دے جن کا ابھی کہیں وجود بھی نہیں ہے، یہ ایک ایسا وہم ہے جس کی آفرینش کا موجب انسان کا غرور طباعی ہوتا ہے، واقعات سے اسے کوئی تائید نہیں حاصل ہوتی۔ شارلمان کے منصوبے اس کے ساتھ ہی خاک میں ملگئے، رشلو کے منصوبے غلط ہو گئے۔ نپولین کے منصوبے خارج از عقل اور آدمیوں کیلئے نہیں بلکہ دیوتوں کے لئے موزوں تھے مگر ایک دانشمند دستوری بادشاہ اس قسم کی خودنمائی میں نہیں پڑتا۔ اسکی زندگی کا کام ہوا میں گرہ لگانا نہیں ہے بلکہ وہ سادے دہقان واقعات کی دنیا میں کام کرتا ہے، وہ ان تجاویز سے سروکار رکھتا ہے جن پر عمل ہو سکتا ہے جن کی خواہش دتمنا ہے اور جو اخراجات ان کے لئے برداشت کئے جاتے ہیں وہ اسکے

سزاوار ہوتے ہیں، وہ ان وزارتوں سے جنھیں قوم اس کے پاس بھیجتی ہے یکے بعد دیگرے
یہ کہتا رہتا ہے کہ "میں ایسا اور ایسا خیال کرتا ہوں، تم سمجھتے ہو کہ اس میں کوئی بات ہے
میں نے اپنے دلائل ایک یادداشت میں لکھ لئے ہیں جو میں تمھیں دونگا۔ وہ یادداشت
غالباً اس موضوع پر بتمامہ جامع و مانع نہیں ہے مگر تمھیں غور کرنے کے لئے اس سے سامان
ہاتھ آجائے گا۔" برسوں تک ایک وزارت کے بعد دوسری وزارت سے بحث و مباحثہ
ہوتے ہوتے ایک عاقل ترین بادشاہ کے بہترین تجاویز یقیناً مقبول اور پست درجہ و ناقابل
عمل تجاویز خارج و مسترد ہو جائینگے۔ وہ اپنے وقت سے اسقدر پیچھے نہیں ہو سکتا کہ بالکل بیکار
ہو جائے کیونکہ وہ (قوم کے) قائم مقاموں یعنی اپنے وقت کے مخصوص آدمیوں کو قائل
و معقول کرنے کے لئے مجبور ہے۔ اس کے پاس بہترین ذرائع یہ ثابت کرنے کے مہیا
ہونگے کہ تمام جدید و عجیب امور میں وہ حق پر ہے کیونکہ برسوں کے بحث و مباحثہ کے
بعد غالباً وہ تمام دنیا کے چیدہ افراد کو اپنا جانبدار بنالیگا، یہ چیدہ افراد ایسے ہونگے کہ
وہ جہاں تھے وہیں رہینگے کیونکہ انھوں نے اپنے زمانے کے لوگوں کو خوش رکھا ہوگا
اور یہ لوگ نئے تصورات و اعلی خیالات کی طرف کبھی بھی زیادہ مائل نہوئے ہونگے۔ کوئی
شخص اگر سکون قلب کے ساتھ قبر میں جاسکتا ہے تو وہ ایک محتاط اور اپنی عقل و فکر سے
کام لینے والا دستوری بادشاہ ہے۔ وہ یہ سمجھے گا کہ اس کے بہترین قوانین اس کے زمانہ
کے ہمنوا تھے۔ جن لوگوں کو ان قوانین سے کام پڑتا تھا اور جن لوگوں کو ان سے نفع
پہنچتا تھا یہ قوانین ان لوگوں کے حسب حال تھے۔ اگر ایسا ہوگا تو اس نے اپنی زندگی
آسائش سے گزاری ہوگی۔ اس نے ایسی زندگی بسر کی ہوگی کہ اس کے دلائل ہمیشہ سنے
جاتے ہونگے، وہ ہمیشہ ان لوگوں کو جن پر ذمہ داری عاید ہوتی ہے کام کرنے کے قبل
ان دلائل پر غور کرنے کے لئے مجبور کر سکتا ہوگا، وہ یہ جان سکتا تھا کہ جن تجاویز کو اس نے
دنیا میں چلایا ہے وہ کسی شخص واحد کی تخیل پرستی کی اتفاقیہ اپج نہیں تھی جو اکثر غلط ہوتی
ہے بلکہ اس کا شمار ان اشیا میں تھا جن کے صحیح ہونے کا زیادہ سے زیادہ گمان موجود ہو۔
وہ ایک بڑے ذہین و رسا شخص کے خیالات تھے جنھیں آخر کار بہت سے معمولی ذہانت
کے لوگوں نے قبول کر کے ان پر عمل کیا تھا۔ مگر کیا ایسے بادشاہ کے ہونے کی ہم توقع
بھی کر سکتے ہیں اور اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ آیا نسلاً بعد نسلٍ ایسے بادشاہوں کے

سلسلہ کی امید ہوسکتی ہے۔ میڈیم ڈے سٹیل جس نے نفع بخش مطلق العنانی کی تعریف کا غلغلہ بلند کر کے شہنشاہ انگریز نڈر پر احسان رکھا تھا اسکو شہنشاہ نے جو جواب دیا وہ ہر شخص نے سنا ہوگا شہنشاہ نے کہا تھا کہ یہ صرف ایک اتفاقیہ خوش قسمتی ہے وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اعلیٰ قابلیت اور نیک ارادے جو ایک نفع رساں اور اچھے مطلق العنان کے وجود میں آنے کیلئے ضروری ہیں وہ کبھی بھی حکمرانوں کے کسی خاندان میں مسلسل طور پر مجتمع نہیں رہتے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ صفات، موروثی انسانی طبیعت کی دسترس سے بہت دور ہیں۔ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ دستوری بادشاہ کے اوصاف مخصوصہ اس دسترس سے زیادہ قرب رکھتے ہیں؟ مجھے اندیشہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ ہم ابھی ابھی یہ دیکھ چکے ہیں کہ کسی نظم ونسق کے ابتداے کار میں موروثی بادشاہ کے خصوصیات طبعی کا استعمال موروثی ملکات طبعی کی معمولی اہلیت سے بدرجہا بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ بے لوث تحقیقات سے یہ ثابت ہوجائے گا کہ کسی مخصوص وزارت کے دوران قیام میں بھی یہی نتیجہ قائم رہتا ہے۔

اگر ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ انگلستان میں صرف اسی موجودہ فرمانروا کے دور میں دستوری بادشاہ کے فرائض اچھی طرح ادا ہو رہے ہیں۔ پہلے دو جارج انگلستان کے معاملات سے ناواقف تھے اور وہ ان معاملات کی سربراہی کی نیک وبد کسی طرح کی بھی قابلیت نہیں رکھتے تھے۔ ان کے دور حکومت میں برسوں یہ حال رہا کہ وزیر اعظم کو پارلیمنٹ کو اپنے قابو و انتظام میں رکھنے کی مشقت کے علاوہ اس عورت کو ہموار رکھنے کی بھی زحمت اٹھانا پڑتی تھی جسے بادشاہ پر قابو حاصل ہوتا تھا، اور یہ عورت کبھی تو ملکہ ہوتی تھی اور کبھی کوئی داشتہ، جارج سوم برابر معاملات سلطنت میں مداخلت کرتا رہتا تھا مگر اس سے برابر نقصان بھی پہنچتا رہتا تھا۔ جارج چہارم اور ولیم چہارم بالاستقلال مسلسل رہبری نہیں کرتے تھے اور وہ اس قسم کی رہبری کے اہل بھی نہیں تھے۔ براعظم کے بلند درجہ کے ممالک میں دستوری بادشاہی ایک نسل سے زیادہ نہیں چلی ہے لوئی فلپ، وکٹر نوئل، اور لیوپولڈ اپنے اپنے خاندانوں کے بانی ہیں۔ ہمیں دستوری بادشاہی میں مطلق العنان بادشاہی سے زیادہ اس امر کی توقع نہ کرنا چاہئے کہ جو خاص قابلیت و ذہانت مورث اعلیٰ میں تھی وہ اخلاف میں بھی متواتر جاری رہے گی۔ جہاں تک تجربہ کی رسائی ہے اس سے اس توقع کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ کار آمد محدود الاختیار

بادشاہوں کا موروثی سلسلہ چلتا رہے گا۔

اگر ہم نظریئے پر نگاہ کریں تو اس توقع کی اور بھی کم وجہ ہے۔ ایک بادشاہ مفید وسودمند اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے وزرا کی باا شر وکارآمد رہبری کرے مگر یہ تیقن ہے کہ یہ وزرا اپنے وقت کے قابلترین لوگوں میں سے ہونگے، ان کو پارلیمنٹ کے کاموں کو اس طرح چلانا پڑے گا جس سے وہ پارلیمنٹ کو مطمئن کر سکیں۔ انہیں اس طرح تقریر کرنا پڑیگی کہ وہ پارلیمنٹ کو مطمئن رکھ سکیں۔ یہ دونوں کام بجز ایک نہایت ہی اعلیٰ وجامع قابلیت کے شخص کے اور کسی سے ایک ساتھ انجام نہیں پا سکتے۔ یقین ہے کہ ان دونوں مواہب فطرت سے کام لینے سے ہر شخص کو دنیا کا بہت کچھ سبق حاصل ہو جائے اور اگر ایسا نہیں ہوا ہے تو ایک پارلیمنٹی سرگروہ کو سرگروہ بننے کے قبل ایک شاندار تربیت کا زمانہ گزارنا پڑے گا۔ اسے پارلیمنٹ میں جگہ حاصل کرنا ہے، پارلیمنٹ کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہے، پارلیمنٹ کا اعتماد حاصل کرتا ہے، اپنے رفیقوں کا اعتماد حاصل کرنا ہے۔ کوئی شخص بغیر خاص الخاص قابلیت کے اور بغیر اس کے کہ اسے زندگی کے گوناگوں جنرئیات کی نازک تربیت حاصل ہوی ہو، اس مرتبہ پر نہیں پہنچ سکتا، پھر اس سے بڑھکر یہ کہ اس پر پہنچ کر اسے قائم بھی رکھنا ہے۔ کسی موروثی بادشاہ کو جسے فطرت نے ایک معمولی انسان بنایا، اور جیسے بادشاہ عام طور پر تاریخ میں پائے جاتے ہیں، اس امر کی کیا توقع ہوسکتی ہے کہ وہ ایسی تعلیم اور ایسی تربیت کے شخص کے مقابلہ سے عہدہ برا ہوسکیگا۔ وہ اپنے کام کے شروع کرنے کے لئے ایک اوسط درجہ کے شخص کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے، ممکن ہے کہ وہ فطین ہو اور ممکن ہے کہ بلید ہو لیکن بمرور ایام وہ نہ فطین رہے گا نہ بلید بلکہ وہ ایک سادہ، و عام شخص ہو جائے گا جو مہد سے لحد تک زندگی کے سیدھے سادے مقررہ کاموں کو پورا کرتا رہے گا۔ اس کی حالت اس شخص کی سی ہوگی جسے کبھی بھی جدوجہد نہ کرنا پڑی ہو جس نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہو کہ اسے کوئی نفع حاصل کرنا نہیں ہے، جسے دنیا میں اولین مرتبہ حاصل رہا ہو۔ جس نے عام زندگی کو واقعی صحیح حالت میں کبھی نہ دیکھا ہو۔ یہ توقع کہ ایک معمولی شخص جو اونچے گھرانے میں پیدا ہوا ہو وہ اس غیر معمولی شخص سے زیادہ ذہین وقابل ہوگا جو اونچے گھرانے میں نہ پیدا ہوا ہو، یا یہ کہ ایک ایسا شخص جس کی جگہ ہمیشہ معین و مقرر رہی ہو اس کی قوت فیصلہ اس شخص سے بہتر ہوگی جو اپنی قوت فیصلہ ہی کے زور سے

زندگی بسر کرتا ہو یا یہ کہ ایک ایسا شخص جو سمجھ کر کام کرتا ہو یا بے سمجھے دونوں حالتوں میں اس کی زندگی ایک ہی سی رہے گی، اس میں اس شخص کی سی نازک فہم و فراست پائی جائے گی جس نے اپنی ہی عقل و دانش سے ترقی کی ہو اور اگر وہ عقل سے کام نہ لے تو معاً اسے زوال ہو جائے، یہ توقعات خام خیالی سے زیادہ نہیں ہیں۔

ایک دستوری بادشاہ کے ہونے سے بادشاہ کا مخصوص نفع یہ ہے کہ اس کی جگہ مستقل ہے، اس سے اس کو موقع ملتا ہے کہ وہ پیچیدہ معاملات کے متعلق مسلسل واقفیت حاصل کر سکے مگر اس سے صرف موقع ہی ملتا ہے۔ اس موقع سے بادشاہ کو کام لینا لازم ہے سیاسی معاملات کی طرف کوئی شاہراہ نہیں گئی ہے، ان کے جزئیات وسیع، خوشگوار، پیچیدہ اور مخلوط ہیں۔ ایک بادشاہ جو بحث میں اپنے وزرا کے ہم پایہ ہونا چاہیے اسے ان وزیروں ہی کی طرح سے کام بھی کرنا چاہیئے۔ جس طرح وزرا کام کرنے والے آدمی ہیں اسی طرح اسے بھی ہونا چاہیئے۔ ایک مطلق العنان بادشاہ کو یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ کشتی سلطنت کا ناخدا وہی ہے۔ بادشاہت کا بوجھ اسی کے اوپر ہے۔ جیسا وہ خود ہوگا ویسے ہی اس کے معاملات ہونگے۔ ممکن ہے کہ لوگ اسے عیش پرستی کی طرف مائل کر دیں اور وہ تمام امور کی طرف سے لاپروا ہو جائے مگر اس کا نقصان و خطرہ بھی صاف ظاہر ہے۔ وہ خود اپنے کو نقصان پہنچائے گا ممکن ہے کہ انقلاب ہو جائے۔ اگر حکمرانی کی قابلیت نہ رہے گی تو ممکن ہے کہ کوئی دوسرا اس کے خلاف سازش کرے۔ مگر ایک دستوری بادشاہ کو کسی امر کا خطرہ نہیں ہے، وہ اپنے فرائض سے لاپروائی برت سکتا ہے مگر اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس کی جگہ ایسی ہی معین، اس کی آمدنی ایسی ہی مستقل، اس کے حظ نفس کے مواقع ایسے ہی کثیر رہینگے جیسے تھے۔ پھر وہ کام کیوں کرے؟ یہ صحیح ہے کہ برسوں کی مسلسل محنت سے اسے جو خاموش و خفیہ اثر حاصل ہو جائے گا وہ جاتا رہے گا مگر ایک پر ارمان نوجوان جس پر دنیا کے ناز و نعم نثار ہو رہے ہوں، وہ اس طمع میں کیوں پڑنے لگا کہ کسی آیندہ زمانہ میں اسے بعض بے کیف سے معاملات پر ایک گونہ اثر حاصل ہو جائے گا۔ یہ ممکن ہے کہ وہ اچھے ارادے قائم کرے، وہ یہ کہے کہ اگلے برس میں ان کاغذوں کو پڑھوں گا، میں کوشش کروں گا اور زیادہ سوالات دریافت کروں گا۔ میں ان عورتوں کو بات چیت کرنے کا موقع نہ دوں گا، مگر وہ عورتیں اس سے بات چیت کرتی رہینگی۔

سب سے زیادہ مایوس کن کاہلی وہ ہے جسے عمدہ تجویزوں سے دلفریب بنالیا جاتا ہے،
سولفٹ کہتا ہے کہ "وزیر خزانہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آج شب کو اس معاملہ کو طے کرے گا
لیکن وہ اسی طرح صدہا راتوں تک کہتا رہے گا"! ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ وزارت
جس کا اختیار بادشاہ کی توجہ کرنے سے کم ہو جائے گا اسے کبھی اس امر کا زیادہ اشتیاق
نہ ہو گا کہ بادشاہ کو کام کی طرف متوجہ کرے۔

یہ حالت اسوقت کی ہے جب جوانی میں بادشاہت نصیب ہو اگر پیری یا کہولت
کی حد کو پہنچ کر بادشاہ ہونے کی نوبت آئے تو اور بھی برا ہے۔ اسوقت وہ کام کے لئے
موزوں نہ رہے گا۔ اس نے اسوقت تک اپنی نوعمری کا سارا زمانہ اور سن رشد کا
ابتدائی حصہ بیکاری میں صرف کیا ہو گا اور اب اس سے محنت کی توقع رکھنا قیاس مع الفارق
ہے۔ ایک متوسط عمر کا عیش پسند و آرام طلب شخص اس طرح سے کام نہیں کرنے لگیگا
جس طرح جارج سوم نے یا شہزادہ البرٹ نے کام کیا۔ دستوری بادشاہت کے لئے
وہی شہزادہ موزوں ہے جو اوائل عمر ہی میں حکمران ہو جائے نوعمری ہی میں عیش و آرام
پر غالب آجائے، ابتداہی سے محنت کی طرف راغب ہو جائے اور اس میں فطرتاً معاملہ فہمی
کی قابلیت موجود ہو۔ اس قسم کے بادشاہ خدا کی بہترین نعمتوں سے ہیں مگر اس کے
ساتھ ہی وہ خدا کی نعمتوں میں نہایت ہی نادر و نایاب بھی ہیں۔

آئینی سلطنت میں اگر کوئی سست بادشاہ تخت نشین ہو گیا تو وہ اپنے زمانہ پر
اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑ جائے گا۔ اس سے بہت کم کوئی نفع پہنچے گا اور علیٰ ہذا نقصان
بھی کم ہو گا۔ اس کے دور میں کابینی حکومت کی شاہی شکل کم و بیش اسی طرح کام انجام
دے گی جیسے غیر شاہی شکل میں ہوتا۔ ایک صفر کے اضافہ سے کچھ نہ ہو گا اگرچہ اس صفر
کی جگہ اصل اعداد سے مقدم ہو گی لیکن ایک لاطینی مثل ہے کہ "بہترین اشخاص کی خرابی
سے بدترین اشکال پیدا ہو جاتے ہیں" شاہی شکل کی بدترین صورت، غیر شاہی شکل کی
بدترین صورت سے بہت زیادہ خراب ہو گی۔ یہ خیال کرنا بہت آسان ہے کہ کسی
آئینی تخت پر کوئی مستعد کار و دخل در معقولات کرنے والا بیوقوف متمکن ہو جائے
جو ہمیشہ اسوقت کام کرے جب اسے کام نہ کرنا چاہئے اور اسوقت کام نہ کرے جب
اسے کرنا چاہئے، جو اپنے وزرا کو ان کی دانشمندانہ کارروائیوں کے خلاف متنبہ کرے

اور ان کی غیر دانشمندانہ کارروائیوں میں ان کی ہمت افزائی کرے۔ یہ تصور قائم کرنا آسان ہے کہ اس قسم کا بادشاہ دوسروں کا آلہ کار ہو نہ ماسٹر کی رہبری کرتے ہوں، عورتیں اسے خراب کرتی ہوں، اور ایک ناقص دربار کے اثرات سے آزاد حکومت کو ذلیل کیا جائے۔

آئینی بادشاہت کے خطرات کی ایک مہیب مثال پیش آچکی ہے، ایک وخل دہ سودائی کا واقعہ سامنے موجود ہے، جارج سوم کی زندگی کے بڑے حصہ میں ہر ایک نازک موقع پر اس کی عقل گویا خبط ہو جاتی تھی۔ زندگی بھر اس میں ایک طرح کی خودکاری موجود رہی جو جنون کے مشابہ تھی۔ اس کا اثر مضرت رسان اور خودکارانہ تھا، ناموزوں و نامناسب امور سے اسے باز رکھنا دشوار تھا۔ اپنے اعلیٰ منصب کے زور سے وہ زیادہ سچے مگر کمزور طبیعت لوگوں کو موزوں و مناسب کاموں سے پھیر دیتا تھا۔ اس نے اپنی ذات سے اپنے ہمعصروں کے لئے ایک اعلیٰ اخلاقی مثال مہیا کر دی مگر وہ ان لوگوں کے مثل ہے جنکی نیکیاں ان کے ساتھ ہی فنا ہو جاتی ہیں اور ان کی برائیاں ان کے بعد تک رہجاتی ہیں۔ اس نے جنگ امریکہ کو طول دیدیا بلکہ شاید وہی اس جنگ کا باعث ہوا، اور انگریزوں کے لئے اہل امریکہ کی نفرت ورثہ میں چھوڑ گیا۔ اس نے سٹریٹ کی عاقلانہ تجاویز کو روک دیا اور اس لئے انگریزوں کو آئرلینڈ کے مشکلات بھی ورثہ میں ملگئے۔ اس نے انگریزوں کو وقت پر صحیح کام نہ کرنے دیا، اس لئے اب اس معاملہ میں ان کی کوششیں بیوقت ولاحاصل ہو گئیں۔ ایک مستعد کارنیم مجنون بادشاہ کے تحت میں دستوری بادشاہی حکومت کی ایک بدترین صورت ہے۔ اس میں ایک ایسی پوشیدہ طاقت ہے جو ہمیشہ پر شوق رہتی بالعموم ضدی ہوتی، اکثر غلط ہوتی جو وزراء پر اس سے زیادہ حکمرانی کرتی ہے جتنا وہ خود محسوس کرتے ہیں۔ جو انھیں اس سے زیادہ عاجز و مغلوب کر دیتی ہے جتنا عوام الناس یقین کرتے ہیں، جو غیر ذمہ دار ہوتی ہے کیونکہ اس پر گرفت نہیں ہو سکتی اور چونکہ کوئی اسے دیکھتا نہیں اس لئے اسے روک بھی نہیں سکتے۔ ایک اچھے بادشاہ کے مصالح بے بہا ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ایک خراب بادشاہ کے مفاسد بھی ناقابل تلافی ہیں۔

ہم اگر کسی نظم ونسق کے شکست کے وقت انگلستان کے بادشاہ کے اختیارات و فرائض کی جانچ کریں تو ہمیں ان نتائج کی تصدیق ہو جائیگی لیکن

پارلیمنٹ کو برطرف کرنے اور نئے امرا کے بنانے کا امتیاز خاص جو اس موقع کے اہم ترین اختیارات ہیں وہ اسدرجہ اہم اور اسقدر پیچیدہ مسائل پر محتوی ہیں کہ اس طویل مضمون سے بالکل آخر میں ان پر کافی طور پر بحث نہیں ہو سکتی۔

باب (۴)

دارالامرا

مینے اپنے آخری خطبہ میں یہ ظاہر کیا تھا کہ موقع آنے پر ایک آئینی بادشاہ کا نظم ونسق کے آغاز کار اور اس کے دوران دونوں میں بدرجہ اتم مفید ثابت ہونا ممکن ہے مگر واقعتاً اغلب نہیں ہے (اس موقع کے لئے) جیسے خیالات، جیسے عادات، جیسے قوائے عقلی و ذہنی کی ضرورت ہے وہ اس متوسط الصفات شخص کی حسب معمول لیاقت سے بدرجہا بڑھے ہوئے ہیں، جیسے بادشاہوں کے عام طور وطریق کے مطابق تعلیم ہوئی ہو۔ یہی دلائل نظم ونسق کے اختتام پر بھی تمام وکمال عاید ہوتے ہیں، مگر اس نازک موقع پر انگلستان کے بادشاہ کے خاص الخاص امتیازات (یعنی نئے امرا کے بنانے اور دارالعوام کے برطرف کرنے کے اختیارات) اپنا رنگ دکھاتے ہیں، اور ان اختیارات کے جا وبیجا استعمال کے متعلق ہم اسوقت تک بطریق واجب تنقید نہیں کر سکتے جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ امرا کون ہیں اور دارالامرا کیا ہے۔

دارالامرا ملکہ کہنا چاہئے کہ امرا کا نفع ان کی معظم و موقر حیثیت میں بہت بڑا نفع ہے۔ انھیں اس نظر احترام سے تو نہیں دیکھتے جس نظر سے ملکہ کو دیکھتے ہیں مگر پھر بھی اُن کا بہت احترام ہوتا ہے۔ طبقہ امرا کے اس منصب کا کام یہ ہے کہ وہ عوام پر دباؤ ڈالے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ دباؤ بالکل باطل ہو چہ جائیکہ وہ مضر ہو مگر پھر بھی عوام کے پرسکون خیالات پر یہ ایک طرح کا دباؤ ہی ہے جو کسی اور طرح سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ عامۃ الناس کی قوتِ تصوری نہایت کمزور ہوتی ہے۔ وہ ایک مرئی علامت کے بغیر کچھ دیکھ نہیں سکتے، اور بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ علامت کے باوجود بھی ان کی سمجھ میں نہیں

آتیں۔ امارت سے عوام الناس کا تصور امیر کی ذہنی قابلیت کی طرف منعطف ہوتا ہے۔ اس میں ایسے علامات ہیں جن سے وہ ہمیشہ ذہنی قابلیت کا استنباط کرنے کے عادی رہے ہیں اور اکثر اب بھی یہی نتیجہ نکالتے ہیں۔ ایک عام ہوشیار آدمی اگر دیہات میں کسی مقام پر جائے تو اس کا کچھ احترام نہ ہوگا مگر ایک "قدیم النسب" "زمیندار" کا احترام ضرور ہوگا۔ یہ زمیندار جب دیوالیہ ہو جائے اور ہر شخص جانتا ہو کہ اس کی بربادی میں اب ایک آن واحد کی دیر ہے، اس حال میں بھی عام کاشتکار اس نو دولت شخص کے بہ نسبت (جو اس زمیندار کے برابر بیٹھتا ہو) اس کی بہت زیادہ وقعت کرینگے۔ عام کسان اس کی لایعنی باتوں کو نئے آدمی کی معنی خیز باتوں کی بہ نسبت زیادہ سجھا کرینگے۔ تو پھر ایک معمر لارڈ کی جو وقعت ہوگی اس کا تو کوئی اندازہ بھی نہیں ہوسکتا۔ امرا کی ہستی ہی فی نفسہ اس حد تک مفید ہے کہ وہ ان درشت خو کم فہم اور محدود العقل انبوہ عوام میں جو الت امرا کے سوا نہ کسی اور کی قدر کر سکتے اور نہ کسی اور کا خیال اپنے ذہن میں قائم کر سکتے ہیں، ذہن و دماغ" کی اطاعت کا ایک جوش پیدا کر دیتی ہے۔

امرا کا طبقہ نہ صرف ان امور کی وجہ سے جنھیں وہ عالم وجود میں لاتا ہے بلکہ ان امور کی وجہ سے بھی جنھیں وہ روکتا ہے نہایت کارآمد ہے۔ یہ طبقہ دولت کی حکمرانی یعنی زرپرستی کے مذہب کا مانع ہے۔ یہ سیم وزر اینگلوسیکسن قوم کے طبعی اصنام ہیں، اس قوم کے لوگ ہمیشہ تحصیل زر کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، وہ ہر شے کا اندازہ و شمار روپیہ سے کرتے ہیں۔ روپیوں کا بڑا ڈھیر دیکھکر ان کی گردنیں جھک جاتی ہیں، اور چھوٹے ڈھیر کے سامنے سے وہ ناک بھوں چڑھا کر آگے بڑھجاتے ہیں۔ انھیں بالطبع یہ میلان ہوتا ہے کہ وہ دولت کی قدر خود دولت کے لئے کرتے ہیں، اور ایک معقول حد کے اندر یہ احساس بالکل درست ہے۔ جبتک کہ انگریز پورے زور و شوق کے ساتھ حرفت کے کھیل کھیل رہے ہیں اسوقت تک وہ لازماً ان لوگوں کی عزت و توقیر کرینگے جو کامیابی سے کھیل رہے ہیں اور ان لوگوں کو وہ سبک نظر سے دیکھیں گے جن کی چالیں غلط پڑ رہی ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ انگریز ابھی مدت دراز تک اس کھیل میں لگے رہیں گے کیونکہ اگر وہ اس سے بہتر کوئی اور شغل اختیار کریں تو

انکی موجودہ حالت بالکل بدل جائیگی۔ بہر نوع مذکورۂ بالا احساس صحیح ہو یا غلط، اس پر بحث کرنا بیکار ہے، یہ طے کرنا فانی انسان کا کام نہیں ہے کہ انگریزوں میں یہ احساس رہیگا یا نہیں، فطرت نے یہ تصفیہ کر دیا ہے کہ ایک معتدل حد کے اندر اس احساس کا رہنا ضروری ہے مگر بعض ممالک میں دولت کی توقیر اس حد سے بہت آگے بڑھ جاتی ہے۔ حصول دولت کی قوت و مہارت کے متعلق اسے مطلق پروا نہیں رہتی جس شخص کو دولت ورثہ میں ملگئی ہو اور جس نے خود اپنی قوت بازو سے دولت پیدا کی ہو وہ دونوں کی دولت کی یکساں وقعت کرتی ہے۔ سونے کا انبار لگا لینے سے غرض ہے اور اسی کیلئے مسابقت اور اسی کی الفت ہے اور بس۔ انگریزوں کا طبقۂ اعیان اسی بلائے بد سے انھیں محفوظ رکھتا ہے۔ کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں "ایک بیچارہ کروڑ پتی اس درجہ مردود ہو جیسا انگلستان میں ہے"۔ یہ تجربہ روز ہی ہوتا رہتا ہے اور یہ ثبوت روز ہی ملتا رہتا ہے کہ روپیہ اور محض روپیہ "لنڈن کی سوسائٹی" کو نہیں خرید سکتا۔ ایک دوسری ہی قوت کے غالب اقتدار کی وجہ سے روپیہ کا اثر دبا رہتا بلکہ مغلوب ہو جاتا ہے۔

مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے کچھ فائدہ نہیں ہے اگر پرستش ہی مقصود ہے تو روپیہ کی پرستش ایسی ہی خوب ہے جیسے منصب کی پرستش۔ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ ایسا ہی ہے تو نظم معاشرت کا یہ بہت بڑا نقص ہے کہ اس کے لئے دو بت موجود ہیں، اور بت پرستی کے اس مقابلہ میں صحیح پرستش کو بہتر موقع ملتا ہے۔ لیکن فی نفسہ یہ صحیح نہیں ہے کہ منصب کا احترام اور کم از کم موروثی منصب کا احترام ایسا ہی مبتذل ہے جیسے روپیہ کا احترام، دنیا جس طرح چل رہی ہے اس میں بعض ذاتوں میں عادات و اطوار نیم موروثی سے ہو جاتے ہیں اور عادات و اطوار فنون عالیہ میں سے ایک فن ہیں یہ نظم معاشرت کا "طرز" ہے اسے بنی نوع انسان کے روزمرہ کے میل جول میں وہی حیثیت حاصل ہے جو گا ہے بگا ہے کی تحریری ملاقات میں علمی اظہار خیال کے فن کو حاصل ہے۔ دولت کا احترام کرنے میں ہم درحقیقت کسی شخص کا احترام نہیں بلکہ اس شخص کے ایک ضمیمہ کا احترام کرتے ہیں۔ موروثی طبقۂ اعیان کا احترام کرنے میں ہم ایک شخص کا احترام اس اعتبار سے کرتے ہیں کہ اس میں بظن غالب ایک اعلیٰ صفت موجود ہے یعنی جو کچھ اس میں موجود ہے اسے وہ صاف عیاں کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ متوسط طبقہ کے لوگوں میں بھی غیر ارادی

طور پر زندگی کی نفاست پائی جائے، نفیس عادات واطوار کے لوگ ہر جگہ پیدا ہوتے ہیں مگر طبقۂ اعیان میں اس نفاست کا ہونا ضروریات سے ہے، اور جس شخص میں یہ نفاست نہ ہو اس کے لئے لازمی ہے کہ اس وصف کے حصول کے واسطے خلقاً اس میں کوئی لم ضرور ہو مگر یہ وصف اس نسل امرا کی خلقی ملک ہے خواہ کبھی کبھی کسی فرد واحد میں نہ پایا جاتا ہو

ایک تیسری بت پرستی اور ہے جس سے مراد محض عہدے کی پرستش ہے اور اس سے بھی یہ پرستش انگریزوں کو محفوظ رکھتی ہے، یہ تیسری قسم غالباً سب سے بدتر قسم ہے۔ دیوتاؤں میں ذلیل ترین دیوتا ایک ماتحت کارکن ہے، اور یا ایں ہمہ مہذب سب حکومتوں میں سب سے زیادہ عام ہے۔ فرانس اور براعظم یورپ کے تمام بہترین ممالک میں ایک واہمہ کی طرح سے اس کی حکومت جاری ہے یہ کچھ مفید مطلب نہیں ہے کہ آپ یہ ثابت کریں کہ ادنیٰ عہدہ داروں کی تنخواہ تجارتی عملہ کی تنخواہ سے کم ہے، ان کا کام تجارتی کام سے زیادہ دل گرفتگی کا باعث ہے، انکا دل و دماغ کم کارآمد اور ان کی زندگی زیادہ طاعت شعارانہ ہے۔ وہ اب بھی اس سے زیادہ اور اس سے بہتر سمجھے جاتے ہیں وہ تمغہ یافتہ اشخاص ہیں۔ ان کے کوٹ کے بائیں سینہ پر ایک چھوٹا سا سرخ نشان لگا ہوتا ہے اور کوئی دلیل اس کا جواب نہیں ہو سکتی۔ ایک صاحب نظر یہ کو جس امر کی تمنا ہوگی وہ انگریزی نظم معاشرت کی اتفاقی رفتار سے انگلستان میں واقعاً موجود ہو گئی ہے۔ جن اعلیٰ عہدوں میں دماغ سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے وہ خواہ مستقل ہوں یا پارلیمنٹی ہوں، ان سے اب معاشری فوقیت لامحالہ حاصل ہو جاتی ہے۔ ایک نائب معتمد جسے دو ہزار پاؤنڈ سالانہ ملتے ہوں وہ کسی مالیاتی کمیٹی کے اس ڈائرکٹر کے بہ نسبت بہت بڑا شخص ہے جسے پانچ ہزار پاؤنڈ سالانہ ملتے ہوں اور عوام الناس کے لئے یہ فرق قطعی خارج از بحث ہے مگر خزانہ وغیرہ کے ایسے چند عہدوں کے سوا جن پر کسی زمانہ میں طبقۂ اعیان کے افراد کا تقرر ہوتا تھا اور جن میں گئی گزری امارت کی بو اب بھی باقی ہے اور چھوٹے چھوٹے عہدوں کا کوئی معاشری فائدہ نہیں ہے، ایک مالدار بقال (بنیا) ایک محصل کروڑگیری کو ادنیٰ نظر سے دیکھتا ہے۔ اور اس سے بڑھکر یہ کہ اکثر ملکوں میں جس امر کو ناممکنات سے سمجھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ محصل کروڑگیری اس بنیے کو نظر رشک سے دیکھتا ہے۔ جہاں چھوٹے چھوٹے سرکاری عہدوں کو مصنوعی وقعت نہیں دیجاتی وہاں حقیقی دولت کا بڑا اثر پڑتا ہے۔

سرکاری ملازمت میں محرر کی کوئی وقعت نہیں ہے" اور آپ ایک عام انگریز کو اس امر پر آمادہ نہیں کر سکتے کہ وہ کیوں اس محرر کی کوئی حقیقت سمجھے۔

مگر یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ سوسائٹی (نظم معاشرت) کو اس طرح سیاسی آلہ کار بنانے سے اس کی نصف خوبیاں غارت ہوگئی ہیں۔ انگریزی قوم کے ''بہترین افراد (یعنی طبقۂ امرا) کا ایک بڑا حصہ اپنے دل کو ایک طرح کی خود دارانہ سہل انگاری میں مشغول رکھتا ہے۔ وہ اپنی منزلت کو قائم رکھتے ہیں' ان کی ہر بات کی اطاعت ہوتی ہے وہ اپنے زیردستوں کے ساتھ نیکی و فیاضی کا برتاؤ کرتے ہیں مگر انھیں دل کی ''رنگارنگی'' کا کوئی احساس ہی نہیں ہوتا، ان کے ذہن میں یہ خیال ہی نہیں آتا کہ سوسائٹی کی دل فریبیاں اسی دل کی رنگارنگی'' پر منحصر ہیں۔ وہ ہوشیاری کو چالبازی سمجھتے ہیں' اور ہمہ وقت انھیں بیکار کا یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ان کو لوگ چالاک نہ سمجھیں۔ سوسائٹی کے طرز و انداز پر اس شدت متانت کا اسدرجہ اثر پڑتا ہے کہ انگریزوں میں معدودے چند اشخاص جن میں مجلسی شان دکھانے کی اہلیت ہوتی ہے وہ اسے بہت زیادہ پوشیدہ رکھتے ہیں اور اس کے اظہار کو صرف انھیں لوگوں تک محدود رکھتے ہیں جن پر انھیں اعتماد ہوتا ہے کہ اس نازک فرق کی قدر کرینگے۔ اگر ہم ہوشیار ترین طبقات کو نہیں بلکہ قدیم ترین طبقات کو مقدم رکھیں اور یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایسا کرنا کسقدر سود مند ہے تو پھر انگریزی سوسائٹی کی یہ باوقار سہل انگاری لابدی و لازمی ہے۔

یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ انگریزی طبقۂ اعیان کا معاشری حق تقدم اب اس سے بہت کم ہے جتنا سو کیا بلکہ پچاس ہی برس پہلے تھا۔ دو بڑی تحریکیں بلکہ جدید نظم معاشرت میں سب سے بڑی تحریکیں اس کے حق میں نامسعود ہوئی ہیں حرفتی دولت کی بیشمار صورتوں میں ترقی حاصل کر لینے سے ایک ایسا حریف میدانِ مقابلہ میں آگیا ہے جس میں علی العموم زیادہ دماغی قابلیت موجود ہے اور اگر بدنمائی اور ذہنی توارث کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو اس حریف کو فوقیت و غلبہ حاصل ہوگیا ہوتا۔ کمپنیاں' ریلوے' قرضہائے شراکتی اور حصص وغیرہ روز بروز طبقۂ اعیان کے گرداگرد کے ان حلقوں کا اضافہ کرتے جارہے ہیں اور ایک وقت ایسا آنیوالا ہے کہ وہ اس طبقہ کو بالکل نظروں سے غائب کر دیں گے۔ یہ زیریں بناتات جسقدر بلند ہوتے جاتے ہیں اسی قدر طبقۂ اعلی پست ہوتا جاتا ہے۔ اب طبقۂ اعلی کے اپنی جگہ پر جمے رہنے کے وسائل اتنے نہیں رہے ہیں جتنے پہلے تھے انکا اقتدار

جو کچھ ہے ان کی نمائش ذہنی اور ان کی شان و شوکت میں ہے مگر نظم معاشرت یوماً فیوماً شان
و شوکت کے خیال سے بعید ہوتا جاتا ہے انگریزوں کے بہت بڑے ظرافت نگار نے
لکھا ہے کہ ہینٹ ڈیوڈ کا سابق ڈیوک شمالی سٹرک کو اپنی گاڑیوں سے بھر دیتا تھا سراؤں
اور ہوٹلوں کی منتظمہ عورتیں اور نوکر چاکر آداب بجالاتے تھے۔ برخلاف ازیں موجودہ
ڈیوک کسی ریلوے اسٹیشن سے سگار پیتا ہوا چپ چاپ نکلتا اور ایک بروہم میں بیٹھکر
اپنا راستہ لیتا ہے"۔ طبقۂ اعیان اگرچاہے بھی تو بھی وہ پرانی طرز زندگی پر نہیں چل سکتا وہ
اپنے سے ایک قوی تر طاقت کے زیر حکومت آگیا ہے اسے موجودہ نظم معاشرت کے
اس میلان تام سے نقصان پہنچ رہا ہے کہ اوسط کو بلند اور اعلیٰ کو پست اور غالباً بالکل ہی
پست کردیا جائے۔ نظم معاشرت کے اندر آرائش و زیبائش میں جسقدر کمی آتی جاتی ہے
اسیقدر طبقۂ اعیان کے ہاتھ سے اس کی مخصوص قوت کا ذریعہ نکلتا جاتا ہے۔

طبقۂ امرا کا جیسا کچھ احترام محض ان کی شان و امارت کی وجہ سے ہوتا تھا اگر ہم اسے
مرکوز خاطر رکھیں تو ہمیں حیرت ہوگی کہ دارالامرا بحیثیت ایک جمعیت کے ہمیشہ فروتر
رہا ہے یعنی انگلستان کی دونوں مجلسوں میں اس کا درجہ اول نہیں بلکہ دوم رہا ہے
جیسا کہ اسوقت بھی ہے لیکن میں اسوقت ازمنۂ وسطےٰ کا ذکر نہیں کرتا، میں انگریزی
دستور سلطنت کی ہیولانی یا طفلانہ حالت سے بحث نہیں کرتا بلکہ میں اس کے سن رشد کی
حالت کا ذکر کررہا ہوں۔ سر رابرٹ والپول کے زمانہ کو لیجئے۔ وہ اسوجہ سے وزیر اعظم تھا
کہ اس نے دارالعوام کو ہموار کرلیا تھا، وہ اسوجہ سے خارج کردیا گیا کہ اس ایوان میں
ایک انتخابی درخواست کے متعلق اسکو شکست ہوگئی تھی۔ وہ انگلستان پر اسوجہ سے
حکومت کرتا تھا کہ وہ دارالعوام پر حکمران تھا۔ باایں ہمہ اسوقت طبقۂ امرا انگلستان
کی حکمران قوت تھا۔ بہت سے ضلع ایسے تھے کہ وہاں کسی امیر کی زبان سے جو نکل جائے
وہی قانون تھا۔ اسوقت تک ایسے لوگ موجود ہیں جن کو یہ یاد ہوگا کہ لارڈ لوتھر نے
(جو عوام میں لارڈ لوتھر کہلاتا تھا) وسٹمورلینڈ میں اپنے نام کی ہیبت طاری کردی
تھی، قصبوں کے اور نیز دیہات کے ارکان کی ایک بہت بڑی تعداد انھیں امرا کی
نامزد کردہ ہوتی تھی۔ لوگ بے چون و چرا ان کے مطیع و منقاد تھے۔ انفرادی حیثیت
سے امرا قوم میں سب سے بڑے لوگ تھے، مگر بحیثیت ایوان کے جمع شدہ امرا

دوسرے درجہ پر تھے۔

اس اجتماع ضدین کی حالت کے پیدا کرنے میں بہت سے اسباب معین و مددگار ہو گئے تھے مگر خاص سبب ایک فطری سبب تھا۔ دارالامرا کبھی ایک ایسا ایوان نہیں رہا ہے جہاں سب سے زیادہ اہم امرا سب سے زیادہ اہم سمجھے جاتے رہے ہوں اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا کسی بحث و مباحثہ کی مجلس میں جن اوصاف سے کوئی شخص نمایاں حیثیت پیدا کر سکتا ہے وہ نہ موروثی ہیں اور نہ بڑی بڑی جاگیروں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ قوم میں، صوبجات میں، خود اپنے صوبہ میں ڈیوانشائر یا بڈفرڈ کا ڈیوک لارڈ ٹھرلو کے بہ نسبت ایک بہت ہی بڑا شخص تھا، ان کی بہت بڑی جاگیریں تھیں بہت سے قصبات ان کے قبضہ میں تھے، اُن کے بیشمار حشم و خدم تھے، ان کے جلو میں اتنے لوگ ہوتے تھے کہ ان کی شان و شوکت شاہی دربار کی سی معلوم ہوتی ہے۔ لارڈ ٹھرلو کے پاس نہ قصبات تھے نہ حشم و خدم تھا اس کی گذر ان اس کی تنخواہ پر تھی جب تک دارالامرا کا اجتماع نہ ہو اسوقت تک یہ ڈیوک نہ صرف بڑے بلکہ بے انتہا بڑے لوگ ہیں مگر دارالامرا کے مجتمع ہوتے ہی لارڈ ٹھرلو سب سے بڑا شخص بنجاتا ہے۔ وہ تقریر کرسکتا ہے دوسرے امرا تقریر نہیں کرسکتے۔ جن کاموں کو یہ ڈیوک دن بھر میں کر سکتے یا کر ہی نہ سکتے ہوں انھیں کاموں کو لارڈ ٹھرلو آدھ گھنٹے میں کر دیتا ہے۔ جب کوئی بدعقل امیر اُسکے اس غلبہ و استیلا کو ناپسند کرتا، اس کے حسب و نسب پر ناک بھوں چڑھاتا ہے تو وہ اس کے جواب کے لئے بھی تیار رہتا ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ بہتر ہے کہ کوئی شخص اپنی حیثیت خود اپنی کوشش سے پیدا کرے بہ نسبت اس کے کہ وہ اس حیثیت کے لئے کسی کے خلف ہونے کا منت کش ہو، جو محض ایک ”واتفاق در اتفاق“ ہے۔ لیکن اس طرح کا ایوان بڑے بڑے امرا کو کب پسند ہو سکتا ہے۔ وہ اسے گوارا نہیں کر سکتے کہ وہ خود اپنے ہی ایوان میں کسی ایسے شخص کے مقابلہ میں دوسرے درجہ میں ہوں جو ابھی کل تک ایک وکیل تھا اور وکیل بھی ایسا جسے سب جانتے ہیں کہ کسی وقت میں اس کے پاس مقدمات مطلق نہ تھے، وہ ”دوکرایہ کی گفتگو کیا کرتا اور آٹھ دس روپے کے لئے مارا پھرتا تھا“۔ (لیکن حقیقت یہ ہے کہ زمانے گزرتے گئے اور امرا کی یہ حیثیت برقرار رہی) امرائے عالیشان کو ایوان سے کسی قسم کی شوکت و حشمت حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس،

جب وہ ایوان کے اندر ہوتے ہیں تو ان کی شوکت وحشمت جاتی رہتی ہے۔ انھوں نے اس مشکل سے نکلنے کی دو تدبیریں سوچیں ایک تو رائے بالعوض کا طریقہ ایجاد کیا جس سے انھیں یہ موقع مل گیا کہ وہ بغیر حاضر ہوئے رائے دے سکیں، زور و قوت اور طعن و تشنیع کی ناگواری سے محفوظ رہیں مضحکوں سے پریشان نہ ہونا پڑے اور اپنے قصبات کے عالیشان قصر یا شہر کے محل کو چھوڑ کر جانا نہ پڑے جہاں ان کی شان ایک دیوتا کی سی بنی رہتی ہے۔ دوسرے اس سے بھی زیادہ موثر طریقہ یہ نکالا کہ وہ دارالامرا کے بجائے اپنے اثر سے دارالعوام میں کام لیتے تھے، ایک قصباتی نواب جسے صوبے کے دو ارکان کے انتخاب میں نصف دخل ہوا اور قصبہ کے دو ارکان کا انتخاب تو بالکل اسکے ہاتھ میں ہوا اور جو غالب حکومت کے ارکان کو جگہیں دلاتا یا ممکن ہے کہ مخالف فریق کے خود سرگروہ کو منتخب کرا دیتا ہو وہ اس بالواسطہ طریقہ سیاس کے بہ نسبت بہت بڑا شخص بن جاتا تھا جتنا وہ خود اپنے ایوان میں اپنی جگہ پر بیٹھ کر چانسلر کے قیل وقال کے سننے سے ہوسکتا تھا۔ جس زمانہ میں امرا کی قوت اول درجہ پر تھی اوس وقت بھی دارالامرا کی قوت دوسرے درجہ پہ تھی کیونکہ بڑے بڑے امرا جنھیں سب سے زیادہ معاشری اہمیت حاصل تھی انھیں خود اپنے ایوان کی فکر نہیں تھی، نہ وہ اُسے پسند کرتے تھے بلکہ وہ اپنی سیاسی قوت کا بہت بڑا حصہ دوسرے ایوان میں خفیہ مگر پُرزور اثر پیدا کر کے حاصل کرتے تھے۔

جب ہم دارالامرا کی ہئیت معظم سے قطع نظر کر کے خاصتہً اس کی کارآمد حیثیت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں انگریزی دستور سلطنت کا علمی نظریہ قطعی غلط معلوم ہوتا ہے۔ یہ نظریہ یہ بتاتا ہے کہ دارالامرا ملکت کا ایک مساوی الاختیار طبقہ ہے اور درجہ میں دارالعوام کے برابر ہے، یعنی یہ اسی طرح ملک کی اعیانی شاخ ہے جس طرح دارالعوام اس کی عمومی شاخ ہے، اور انگریزوں کے نظام سلطنت کے اصول کے موافق اعیانی شاخ کو عمومی شاخ کے مساوی اختیار حاصل ہے۔ یہ عقیدہ مسلمہ اس درجہ غلط ہے کہ انگریزی نظام سلطنت کی یہ ایک نمایاں خصوصیت اور اسکا ایک خاص الخاص وصف ہے کہ اس میں ایک ایسا ایوان اعلیٰ شامل ہے جسے ایوان ادنیٰ کے سارے اختیار تو نہیں حاصل ہیں مگر کچھ نہ کچھ اختیار ضرور حاصل ہے۔

دو مختلف النوع اور مساوی الاختیار ایوان کی خرابی صریحاً ظاہر ہے۔ ان میں سے

ہر ایک ایوان جملہ قانون سازی کو روک سکتا ہے لیکن کچھ نہ کچھ وضع قوانین تو ہر نوع لازمی و لابدی ہے۔ اس موقع پر ہمارے لئے وہ بہترین مثال موجود ہے جو وہم و قیاس میں آسکتی ہے۔ عہد وکٹوریا کے دستور سلطنت کا ایوان اعلیٰ اون پیدا کرنے والے دولتمندوں کا نمایندہ ہے، اس نے مجلس ادنیٰ سے اختلاف کر دیا ہے اور بہت سے کام معلق ہوگئے ہیں۔ اگر ایک بہت ہی عجیب و غریب تدبیر نہ کی گئی ہوتی تو حکومت کی کل بالکل ہی بیکار ہوگئی ہوتی۔ اکثر دساتیر سلطنت سے یہ لغزش سرزد ہوگئی ہے۔ دنیا کے دو سب سے زیادہ نمایاں جمہوریتی تنظیمات اس کے مرتکب ہوچکے ہیں۔ امریکا اور سوئزرلینڈ دونوں جگہوں کے دساتیر سلطنت میں ایوان اعلیٰ کو اسی قدر اختیارات حاصل ہیں جتنے ایوان ادنیٰ کو حاصل ہیں۔ وہ اگر چاہے تو بیحد دقتیں ڈال دے یعنی کام کو بالکل ہی روک دے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو یہ قانونی دستور سلطنت کی کسی کی خوبی کے باعث نہیں ہے بلکہ اسکا باعث اس ایوان کے ارکان کی معاملہ فہمی ہے۔ ان دونوں دساتیر سلطنت میں اس خطرناک تفریق کی حمایت ایک خاص عقیدۂ مسلمہ کے رو سے کیجاتی ہے جس سے مجھے اس وقت بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وفاقی حکومت میں کوئی ادارہ، کوئی اقتدار، کوئی جماعت ایسی ہونا چاہئے جسے حق امحا حاصل ہو اور جس میں شامل ہونیوالی مختلف ریاستیں سب مساوی درجہ کی ہوں۔ میں صاف یہ کہتا ہوں کہ میری نظر میں یہ عقیدہ بدیہی الثبوت نہیں ہے، اسے فرض کر لیا گیا ہے مگر ثابت نہیں کیا گیا ہے۔ ڈلاویر کی ریاست قوت و اثر میں نیویارک کی ریاست کے برابر نہیں ہے اور آپ ایوان اعلیٰ میں اسے مساوی حق امحا دیکر برابر نہیں کر سکتے۔ بیشک اس قسم کے ادارے کی تاریخ فطرت کے نہایت ہی موافق ہے۔ ایک چھوٹی ریاست کی یہ خواہش ہوگی اور ہونا چاہئے کہ جس دستور سلطنت میں محو ہو کر اس کی آزادی فنا ہوگئی ہے اس میں اسکی قدیمی آزادی کا کوئی نشان باقی رہ جائے۔ مگر کسی ادارے کا موافق فطرت کے ہونا اور بات ہے اور اس کا سود مند و کار آمد ہونا دوسری بات ہے۔ اگر فی الواقع وفاقی حکومت کی وجہ سے ایک قطعی النفاذ و مساوی الاختیار ایوان اعلےٰ کے قائم کرنے کی مجبوری لاحق ہوتی ہے تو اس قسم کی حکومت کے طبعی نقائص میں یہ ایک اور مزید اضافہ ہے۔ ممکن ہے کہ ضرورتاً کسی عیب کے قائم رکھنے کی حاجت ہو مگر اس احتیاج کے باوجود بھی عیب عیب ہی رہیگا۔

یہ امر ضروریات سے ہے کہ ہر ایک دستور سلطنت میں کہیں نہ کہیں کوئی ایسی ذی اقتدار قوت موجود ہو کہ وہاں تک رسائی ہو سکے۔ صاحب اقتدار اعلیٰ کا حدود سے بری کے اندر ہونا لازمی ہے اور انگریزوں نے اسے ایسا ہی بنا دیا ہے۔ ۱۸۳۲ء کے قانون اصلاح کی منظوری کے وقت دار الامرا، دار العوام سے اتفاق کرنے پر اسی قدر نا رضامند تھا جس قدر وکٹوریا کا ایوان اعلیٰ، وہاں کے ایوان ادنیٰ سے اتفاق کرنے سے نا رضامند تھا، مگر دار الامرا نے اتفاق کر لیا۔ بادشاہ کو نئے امرا کے بنانے کا اختیار حاصل ہے اور بادشاہ نے وزارت سے نئے امرا بنانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ دار الامرا نے اس نظیر کے قائم ہو جانے کو پسند نہ کیا اور اونھوں نے مسودۂ قانون کو منظور کر لیا۔ اس اختیار سے کام نہیں لیا گیا مگر اس کا موجود ہونا ویسا ہی سود مند ثابت ہوا جیسا اس کا عمل میں آنا سود مند ہوتا۔ ایک مالک کارخانہ جب یہ جانتا ہو کہ مزدور ہڑتال کر سکتے ہیں تو جس طرح وہ اس ہڑتال کے وقوع کو روکنے کے خیال سے ان کی بات کو مان لیتا ہے؛ بالکل اسی طرح اس علم سے کہ دار الامرا میں بادشاہ کی مرضی یعنی قوم کی مرضی سے نئے لوگ بھر دیے جا سکتے ہیں، امرا نے قوم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

قانون اصلاح کے وقت سے انگریزی تاریخ میں دار الامرا کا فرض بدل گیا ہے۔ اس قانون کے قبل تک اگر وہ ایک آمرانہ ایوان نہیں تھا تو کم از کم صاحبانِ امر کا ایوان ضرور تھا۔ وہ سرخیلِ امرا جنھیں دار العوام میں سب سے زیادہ اثر حاصل ہوتا تھا اور ارکانِ دار العوام کی باگ جن کے ہاتھوں میں ہوتی تھی وہ وہیں (دار الامرا میں) بیٹھے تھے۔ دار العوام پر ہیولائی اثر اس قدر غالب تھا کہ ان کے باہمی اتحاد میں کبھی کوئی شدید رخنہ نہیں پڑا۔ دونوں ایوانوں میں جب کوئی مناقشہ ہوتا تھا تو وہ ان کے اپنے حقوق خاص سے متعلق ہوتا تھا جیسا کہ عظیم الشان مقدمہ ایلزبری میں ہوا، قومی حکمتِ عملی کے متعلق نہیں ہوتا تھا؛ طبقۂ امرا کا اثر اس زمانہ میں اس قدر مسلم تھا کہ اس پر زور دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ انگریزی دستور سلطنت اگرچہ اس معاملۂ خاص کے متعلق اس وقت موجودہ حالت سے بہت ہی مغائر تھا تاہم وکٹوریا یا سوئزرلینڈ کے دستور سلطنت کی سی لغزش و فروگزاشت اس میں نہیں تھی۔ اس میں دو ایسے ایوان نہ تھے جن کی بنا ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف ہو بلکہ اس میں دو ایسے ایوان تھے جن کی بنا مشترک تھی یعنی دو ایسے ایوان تھے جنھیں حاوی عنصر

ایک ہی تھا۔ تخالف کا خطرہ ایک حقیقی اتحاد سے رفع ہو گیا۔

قانون اصلاح کے وقت سے دار الامرا نظر ثانی کرنے والا اور کاموں کو معلق کر دینے والا ایوان بن گیا ہے۔ وہ مسودات میں تبدیلی کر سکتا ہے۔ وہ ایسے مسودات کو مسترد کر سکتا ہے جن پر دار العوام ہنوز کلی طور پر مستحکم نہ ہوا ہو، یعنی قوم نے ہنوز جسکا قطعی عزم نہ کیا ہو۔ ان کا حق اتنا ایک طرح پر مشروط سا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تمہارے اس مسودے کو ایک مرتبہ، دو مرتبہ، غایت تین مرتبہ نامنظور کئے دیتے ہیں، لیکن اگر تم اسکے برابر پیچھے ہی رہو گے تو آخر میں ہم اسے نامنظور نہیں کریں گے۔ یہ ایوان ایسے پوشیدہ آمروں کا ایوان نہیں رہا ہے اس کے ارکین کو عارضی طور پر قوانین کے استرداد اور صریح طور پر ان کے تبدیل کرنے کا اختیار ہو گیا ہے۔

ڈیوک ولنگٹن کا بڑے مدبروں میں شمار کیا جانا صرف اسی واحد حق کی وجہ سے ہے کہ اس نے اس تغیر کی سربراہی کی۔ اس نے دار الامرا کو اس کی صحیح حیثیت کی طرف لیجانا چاہا اور اسکی رہبری کی۔ ۱۸۴۶ء میں قانون غلہ کی کشمکش کے نازک زمانہ میں اور جب کہ یہ سوال درپیش تھا کہ دار الامرا اسے مان لے یا اس سے مخالفت کرے، ڈیوک نے ایک نہایت ہی حیرت افزا خط متوفی لارڈ ڈربی کو لکھا تھا:۔ اس خط میں لکھا تھا کہ:۔

"کئی برس سے بلکہ ۱۸۳۲ء سے جب سے کہ میں اپنے عہدہ سے کنارہ کش ہوا ہوں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ دار الامرا کو اس اصول پر چلاؤں جسکی نسبت میں یہ سمجھتا ہوں کہ دستور سلطنت میں اس ادارے (دار الامرا) کا قیام اسی اصول کی وجہ سے ہے۔ یہ اصول اتفاق ہے ۔۔ میں نے تمام پر از شور و شر اور انتہا پسند کارروائیوں کی بے تکان مخالفت کی ہے، حالانکہ انگلستان میں کسی سیاسی فریق کے اندر اہمیت حاصل کرنیکا یہ صحیح طریقہ نہیں ہے خاصکر ایسے فریق میں جو حکومت کا فریق مخالف ہو۔ میں نے اہم مواقع پر پارلیمنٹ کے اندر بے تامل حکومت کی تائید کی ہے اور دونوں ایوانوں کے درمیان منافرت و تفریق کی مضرتوں کو روکنے کے لئے بھی میں نے ہمیشہ اپنے ذاتی اثر سے کام لیا ہے جس کی بعض نمایاں مثالیں موجود ہیں جن پر میں اس وقت خیال دلاؤنگا کیونکہ ان سے آپ کو میرے انتظام کی نوعیت واضح ہو جائے گی اور ممکن ہے کہ کسی حد تک یہ بھی عیاں ہو جائے کہ بغیر کسی ظاہری حق کے اتنے برسوں تک ایسا غیر معمولی اقتدار مجھے کیونکر حاصل رہا۔

"جب مجھے ان مشکلات کا علم ہوا جن میں سابق شاہ ولیم نئے امرا کے بنانیکے وعدے کی وجہ سے پھنس گیا تھا اور مجھے یقین ہے کہ ان کی تعداد کا کوئی حد و حصر نہیں رکھا گیا تھا تو میں نے خود یہ عزم کر لیا اور اپنے اثر سے دوسروں کو بھی آمادہ کر لیا جنکی تعداد بہت بڑی تھی کہ جب قانون اصلاح کے آخری مراحل کی بحث ہو تو وہ ایوان سے غیر حاضر ہو جائیں یہ اسوقت ہوا جب نئی وزارت کے بنانے کے متعلق گفت و شنود ناکامیاب ہو چکی تھی۔ اس کارروائی سے فی الوقت میرے فریق میں نہایت بے اطمینانی پیدا ہو گئی حالانکہ میرا یہ یقین ہے کہ اس کارروائی نے اسوقت دار الامرا اور ملک کے دستور سلطنت کو بچا لیا۔

"اس کے بعد ۱۸۳۵ء سے ۱۸۴۱ء تک کے زمانہ میں، میں نے دار الامرا پر یہ اثر ڈالا کہ وہ ان بہت سے اصولوں اور طریقوں کو ترک کر دے جنھیں اس نے اور خود میں نے، آئرلینڈ کے عشر، آئرلینڈ کے تنصیبات، اور دوسری کارروائیوں کے وقت اختیار کیا تھا۔ اس سے بہتوں کو کبیدگی و پریشانی ہوئی، مگر مجھے ایک خاص کارروائی یعنی کناڈا کے بالائی و نشیبی صوبوں کے الحاق کا معاملہ یاد ہے، اس کے ابتدائی مراحل میں میں نے اس کارروائی کے خلاف تقریر کی اور اس پر اعتراض کیا اور اس کے آخری مراحل میں میں نے ایوان کو اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ اس سے اتفاق کر لے اور اسے منظور کرے تاکہ ایک ایسے اہم معاملہ کے متعلق دونوں ایوانوں کے تنازعہ کی وجہ سے مفاد عامہ کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ پھر میں نے چین کے معاملہ میں حکومت کی کارروائیوں کی تائید اور حکومت کے ملازم کپتان ایلیٹ کی محافظت کی۔ ان سب کارروائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے فریق کے بعض لوگوں پر میرا اثر کمزور ہو گیا۔ ہو سکتا تھا کہ دوسرے لوگ میری اس روش کی تائید کرتے اور ممکن تھا کہ انھیں کو کثرت حاصل ہوتی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ کم از کم لارڈ ملبورن کی حکومت کے آغاز کے وقت سے میں ہر حال میں تمام فوجی معاملات کے متعلق خواہ وہ اندرون ملک کے ہوں یا بیرون ملک کے، اس حکومت سے برابر خط و کتابت کرتا رہا ہوں، لیکن اسی طرح اور بھی بہت سے معاملات میں میری ان کی مراسلت رہی ہے۔

"لامحالہ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کنسرویٹو فریق میں میرا اثر گھٹ گیا، لیکن

اس کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ اس کارروائی سے حکمراں کو قطعی سکون و اطمینان حاصل ہو گیا اور نظم و ضبط بھی اچھی طرح قائم رہا۔ آخر الامر گزشتہ دسمبر میں سر رابرٹ پیل کی حکومت نے استعفا دیدیا اور ملکہ نے لارڈ جان رسل سے ایک وزارت قائم کرنے کی خواہش کی۔ میں نے ملکہ کے نام کے خط میں جو کچھ درج کیا ہے اس سے خلاف کرنا اب میرے لئے ناممکن ہے میں بادشاہ اور قوم کا خادم ہوں، میں تنخواہ و انعام سے مستفید ہوا ہوں، اور میں سمجھتا ہوں کہ میں اب بھی فائز الخدمت ہوں، اور جب مجھے خدمت کے لئے کہا جائے تو میں اسکی بجا آوری کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا بشرطیکہ میں بغیر بدنامی کے ایسا کر سکوں یعنی جب تک میری صحت و طاقت اس قابل ہو کہ خدمت کو انجام دے سکوں اگر یہ ظاہر ہے کہ میرے اور فریق کے درمیان ہر طرح کے تعلق اور صلاح و مشورے کا خاتمہ ہو گیا ہے اور ہو جانا چاہئے تھا۔ میں اگر ۲۰ دسمبر کی شب کو سر رابرٹ پیل کے کابینہ میں شامل ہونے سے انکار کر دیتا تو اس میں کچھ بھی ناموزونیت نہ تھی اور بعضوں کا خیال ہے کہ مجھے ایسا ہی کرنا چاہئے تھا مگر میری رائے یہ ہے کہ اگر میں ایسا کرتا تو سر رابرٹ پیل کی حکومت نہ ہوتی۔ یہ کہ میں.... کرنا چاہئے تھا...... اور...... دوسری صبح کو برسر اقتدار.......

"لیکن بہر نوع یہ صاف ظاہر ہے کہ جب کبھی وہ انتظام ہو جسکا جلد یا بدیر ہونا لازمی ہے تو اسوقت اگر میں اتنا نافہم ہوں کہ کنسرویٹو فریق پر کوئی اثر ڈالنا چاہوں تو میرا کوئی اثر باقی نہ ہوگا۔ پس آپ کو یہ نظر آئے گا کہ اب آپ کے لئے میدان بالکل صاف ہے، اور جب آپ اس میدان میں داخل ہوں تو آپ کو مجھ سے اختلاف رائے کے نتائج کا کوئی اندیشہ نہ کرنا چاہئے۔ اور سچ یہ ہے کہ میں نے ۱۲ دسمبر کو ملکہ کے نام جو خط لکھا ہے اس میں میں نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ جب میرا فریق ملکہ کی حکومت کا فریقِ مخالف ہوگا تو میرے اور اس فریق کے درمیان تعلقات منقطع ہوں گے۔

"میری رائے میں سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ میں نے اتنی مدت تک دار الامراء پر جو اثر قائم رکھا ہے آپ ویسا ہی اثر پیدا کریں اور وہی حیثیت اختیار کریں جو میری تھی۔ سوال یہ ہے کہ یہ مقصد کیونکر حاصل ہو؟ ان کی رائے و فیصلہ کی رہبری کرکے یا ان کا اتباع کرکے؟ آپ کو معلوم ہوگا کہ میں نے ان کی رائے کی رہبری کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض نہایت ہی نمایاں مواقع پر مجھے کامیابی ہوئی ہے لیکن ایک بڑی حد تک اس میں تدبیر کا بھی دخل تھا۔

"جو اہم مواقع و مسائل اسوقت اس ایوان کے روبرو پیش ہیں، انکی نسبت میری رائے یہ ہے کہ امراکو اس جانب راغب کرنے کی کوشش کرنا چاہئے کہ وہ ایک ایسے مسئلہ کے متعلق جس کی نسبت بارہا یہ دعوے کیا گیا ہے کہ اس سے امراکی ذاتی غرض وابستہ ہے، ملک کو دونوں ایوانوں کے درمیان اختلاف رائے بلکہ تنازعہ کی مشکلات میں مبتلا کرنے سے اجتناب کریں۔ مذکورہ بالا دعوے اگرچہ فرداً فرداً ہر ایک امیر پر صادق نہ آئے مگر اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ مالکانِ اراضی پر وہ بالعموم صادق آتا ہے۔ میں اس کام کی مشکل سے آگاہ ہوں مگر میں اس امر سے مایوس بھی نہیں ہوں کہ یہ مسودہ منظور کرالیا جائیگا۔ آپ خود سب سے بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کو کیا روش اختیار کرنا چاہئے اور کس روش سے سب سے زیادہ اغلب ہے کہ دارالامرا کا اعتماد حاصل رہے۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ دارالامرا کو یہ صلاح دیں کہ جو امر نظم عامہ کی جانب سب سے زیادہ مائل ہو اور ملک کے فوری اغراض کے لئے سب سے زیادہ سودمند معلوم ہوتا ہو اسی کے لئے رائے دیں"۔

یہی وہ روش ہے جس سے دارالامرا اپنی موجودہ حالت پر پہنچا ہے، یعنی یہ ایک ایسا ایوان ہوگیا ہے جسے (اکثر حالتوں میں) اپنے حق احا سے تاخیر ڈال دینے کی قدرت اور (اکثر حالتوں میں) نظرثانی کا اختیار حاصل ہے مگر اس کے سوا اور کوئی حق و اختیار اسے حاصل نہیں ہے۔ ہمیں جس سوال کا جواب دینا ہے وہ یہ ہے کہ "دارالامرا کی جب یہ حالت ہے تو پھر دارالامرا کے وجود سے فائدہ کیا ہے"۔

یہ عام خیال صراحتہً بیکار ثابت ہوتا ہے کہ اس سے کسی فوری انقلاب کی روک تھام ہوتی ہے۔ جیسا کہ ڈیوک کے خط کی سطر سطر سے ظاہر ہوتا ہے، اس ایوان کے عاقل ترین اور سربرآوردہ ارکان یہ جانتے ہیں کہ قوم جس امر کے متعلق عزم مصمم کرلے ہیں پر اس ایوان کو جھکنا دینا چاہئے۔ قانون اصلاح اور قانون غلہ کے دو واقعات فیصلہ کن واقعے ہیں۔ امرا کہا جنتہ جیسہ اصلاح کو انقلاب، قانون غلہ کو ضبطی جائداد اور دونوں کو متفقاً تباہی کے مرادف سمجھتا تھا۔ اگر قوم سے مخالفت کرنے کا اعتماد انھیں کسی وقت بھی حاصل ہوا ہے تو اس مقاومت کا موقع یہی تھا مگر فی الواقع یہ محض وہم ہے کہ کسی ایوانِ ثانی یعنی دارالاعیان سے یہ توقع کیجاسکے کہ وہ کبھی بھی ایسے وقت میں ایوانِ عمومی یعنی قوم کے ایوان کی مخالفت کریگا جب یہ ایوان اور قوم دونوں اپنی ضد پوری کرنے میں اڑے ہوئے ہوں اور قوم کی

بھی یہی حالت ہو۔ امرا میں اسکی طاقت ہی نہیں ہے۔ جب قوم میں اشتعال پیدا ہو جاتا ہے تو ہر ایک طبقاتی ایوان، بالفاظ دیگر ہر ایک قلیل التعداد ایوان اپنے کو کمزور سمجھنے لگتا ہے۔ انقلاب کے وقت میں صرف دو طاقتیں ہوتی ہیں ایک تلوار دوسری قوم، تلوار جماعت عاملہ کے قبضہ میں ہوتی ہے۔ پنولین اول نے جو سبق پیرس کے عوام الناس کو دیا تھا وہ اچھی طرح معلوم ہے، گویا اس نے ۱۸ اریڈمیر کو نظریۂ انقلابات میں ایک اضافہ کیا تھا۔ ہر ایک سپاہی جو قوم کی سرگرمی کر رہا ہو وہ اس فوج سے کام لے سکتا ہے۔ مگر کوئی ایوان ثانی اس فوج سے کام نہیں لے سکتا۔ یہ ایک پرسکون جمعیت ہے جس میں بوڑھے امرا، بڑے قانون پیشہ اور جیسا کہ دوسرے ممالک میں ہوتا ہے، دانشمند اہل علم شامل ہوتے ہیں۔ اس قسم کی جماعت میں یہ طاقت نہیں ہوتی کہ وہ قوم کو دبائے بلکہ قوم اگر اس سے کوئی کام لینا چاہے تو اسے وہ کام کرنا ہی پڑے گا۔

انگریزی دستور سلطنت میں امرا کی نوعیت جیسی کچھ ظاہر ہو چکی ہے، اس سے یہ عیاں ہے کہ وہ انقلاب کو روک نہیں سکتے۔ دستور سلطنت میں ایک استثنائی دفعہ ایسی موجود ہے جو انقلاب کے روکنے سے اسے باز رکھتی ہے۔ جماعت عاملہ جو ایوان عمومی اور قوم کی مقرر کردہ ہوتی ہے وہ نئے امرا بنا سکتی اور اس طرح دارالامرا میں (اپنے موافق) کثرت رائے پیدا کر سکتی ہے۔ یہ جماعت عاملہ امرا سے کہہ سکتی ہے کہ "جس طرح ہم چاہتے ہیں اس طرح اپنے ایوان کے اختیار کو استعمال کیجئے، ورنہ آپ اسے بالکل استعمال نہ کریں گے ہمیں دوسرے ایسے لوگ مل جائیں گے جو اسے استعمال کریں۔ آپ کا ادائے فرض اگر ہمارے حسب منشا کام میں نہ آیا تو سب کچھ رکھا رہ جائے گا اور ہم جب چاہیں گے اسے باطل کر دیں گے" پس جو مجلس اس قسم کی تہدید کے زیر اثر ہو وہ نہ تو ایک مستقل العزم و مبرم جماعت عاملہ کو روک سکتی ہے اور نہ اسکا مقصود یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اسے روکے۔

فی الحقیقت دارالامرا، بحیثیت ایک ایوان کے کوئی ایسا پشتہ نہیں ہے جو سیلاب کو روک دے بلکہ وہ ایک علامت ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انقلاب ہونا لازم نہیں ہے چونکہ اسکی بنا قدیم وقعت و احترام اور نہایت دیرپا وفاشعاری پر ہے اس لئے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نئی طاقتوں کا ہیجان اور نئی قوتہائے عمل کا طغیان جسے ہم لوگ انقلاب کہتے ہیں، وہ فی الحال محض ناممکن ہے۔ ماہ نومبر میں جب تک درختوں پر بہت سی پرانی پتیاں

لٹکی رہتی ہیں اسوقت تک آپ یہ جانتے ہیں کہ ابھی کچھ بہت نہیں بڑھی ہے اور بادشت بھی نہیں چلی ہے، پس اسی طرح جب تک دارالامرا کو وسیع اختیار حاصل ہے، آپ یہ جان سکتے ہیں کہ ملک میں ہنوز اپوسانہ بدحالی نہیں پیدا ہوئی ہے اور کوئی شورانگیز کارروائی ایسی نہیں ہونے والی ہے جس سے بلطنِ غالب انہدام عظیم واقع ہوجائے۔

ایک خیال یہ قائم تھا کہ آزاد حکومت کے لئے دو ایوانوں کا ہونا لازمی ہے ایک ایوان تجویز کا پیش کرنیوالا اور دوسرا نظر ثانی کرنے والا ہو، پہلا شخص جس نے اس نظریہ پر ایسا سخت پتھر مارا جس سے فی الواقع اس پر کاری ضرب پڑگئی، اسکی نسبت بہت کم یہ گمان ہوسکتا تھا کہ وہ عمومی اثر کا جانبدار ہوگا یا اعیانیت کے سودمند ہونے کی طرف سے آنکھ بند کرلیگا۔ یہ شخص اس زمانہ کا لارڈ گرے تھا۔ اسے اس معاملہ پر عملی حیثیت سے نظر کرنا پڑی تھی۔ وہ انگلستان کا پہلا جلیل القدر وزیر نوآبادیات تھا جس نے ان تمام نوآبادیوں میں نیابتی ادارات کے اجرا پر کمرِ ہمت باندھی جن میں اسکی قابلیت موجود تھی، اور اسے معاً اس دشواری سے دوچار ہونا پڑا کہ ان نوآبادیوں میں مشکل سے ایک جمعیت کے لئے کافی و وافی اشخاص مل سکتے تھے، دو جمعیتوں کے لئے بقدر ضرورت اشخاص کے ملنے کا تو ذکر ہی بیکار ہے۔ پس یہ ہوا اور ایسا ہونا بالکل ہی قرین قیاس تھا کہ جمعیت ثانیہ مضرت رساں ثابت ہوئی۔ جمعیت ثانیہ یا تو شاہ وقت کی نامزد کردہ ہوتی تھی اور بادشاہ ایسے مواقع پر بالطبع زیادہ ذی علم و عالی الطبیعت اشخاص کو اپنے ساتھ ملا لیتا تھا، یا یہ جمعیت قوم کی طرف سے منتخب ہوتی تھی جسکے لئے بڑی بڑی جائدادوں کی شرط ہوتی تھی، یعنی اس میں وہ چند افراد ہوتے تھے جن میں بالتحقیق اصابت رائے کی صفت موجود ہوتی تھی۔ یہ دونوں انتخاب کنندے نوآبادی کے بہترین افراد کو منتخب کرکے انھیں جمعیت ثانیہ میں داخل کردیتے تھے اور نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جمعیت عمومی ان بہترین اشخاص سے خالی رہتی تھی۔ جمعیت عمومی ان رہبروں اور سرگروہوں سے معرا ہوجاتی تھی جو بہترین طور پر اسکی سرگروہی اور رہبری کرسکتے تھے۔ یہ فائق قابلیت کے لوگ اس غرض سے الگ کردیے جاتے تھے کہ وہ علیحدہ بیٹھکر آپس میں باتیں کریں بلکہ شاید اس میں مکابرے و مجادلے تک نوبت آجائے۔ یہ لوگ اعلیٰ و بیکار شدہ قوتوں کے ایک مرکز پر مجتمع ہوجانیکی مثال تھے۔ وہ بھلائی کرنا چاہتے تھے مگر کچھ نہ کرسکتے تھے۔ ایوان ادنیٰ جس میں سے نوآبادی کے تمام بہترین اشخاص نکال لئے جاتے تھے، جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ عمومیت کے

بہترین مخالفوں کو کمزور حالت میں بالکل الگ بٹھا دینے سے عمومیت میں ضعف آنیکے بجائے اور قوت آگئی تھی۔ پس جوں ہی تجربہ سے یہ امر ظاہر ہوگیا بلکہ ظاہر ہوتا ہوا معلوم ہوا، معاً یہ ظاہر ہوگیا کہ ایک اچھی اور آزاد حکومت کے لئے دو ایوانوں کا ہونا ضروریات سے ہے۔

ایک کمل ایوان ادنیٰ کے ہوتے ہوئے یہ یقینی ہے کہ اعلیٰ ایوان شاید ہی کسی مصرف کا ہو۔ اگر ہمارے پاس ایک انموذجی دار العوام موجود ہوتا جو قوم کی پوری پوری نمایندگی کرتا، ہمیشہ اعتدال کو مرعی رکھتا، کبھی مغلوب الغیظ نہ ہوتا اور اس میں کثرت سے ایسے لوگ موجود ہوتے جنھیں وقت و فرصت حاصل ہو، اور کسی امر پر اچھی طرح غور وخوض کرنے کے لئے جس آہستگی وثبات و استقلال کی ضرورت ہے، اسے وہ کبھی نظر انداز نہ کرتے تو یہ یقینی ہے کہ پھر ہمیں کسی اعلیٰ ایوان کی ضرورت نہ رہتی۔ کام اس خوبی سے انجام پاتا کہ اسکی ضرورت ہی نہ رہتی کہ کوئی دوسرا ایوان اس پر نگرانی رکھے یا اس پر نظر ثانی کرے۔ ہمیں اسکا علم ہے کہ حکومت کے معاملہ میں جو امر غیر ضروری ہوتا ہے اسکا اختیار کرنا مضر ہوتا ہے۔ خود حیاتِ انسانی اتنی پیچیدگیاں لاحق کر دیتی ہے کہ اس میں ایک اور مصنوعی اضافہ بالیقین نقصان ہی کا موجب ہوگا، اس کل کے پرزے اس قدر دقیق و نازک ہیں کہ آپ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بیکار پرزہ کہاں جا کر اٹک جائیگا اور سیکڑوں کارآمد پرزوں کو حرکت سے روک دیگا۔ لیکن جہاں ایک انموذجی دار العوام کے ہوتے ہوئے دار الامرا غیر ضروری اور اس لئے مضرت رساں ہو جاتا ہے وہیں یہ بھی ہے کہ انگلستان کا دار العوام فی الواقع جیسا ہے اس کے پہلو میں ایک بافرصت نظر ثانی کرنیوالی جماعت وضع قوانین کی اگر قطعی حاجت نہ ہو تو بھی اس کے بے انتہا سودمند ہونے میں شک نہیں ہے۔

اسوقت چھوٹے چھوٹے مسائل پر اتفاقیہ کثرت کا ہو جانا کسی موثر اقتدار کے زیر اثر نہیں ہے۔ قوم روشِ حکومت اور مہمات سلطنت کے سوا اور کسی امر پر مطلق توجہ نہیں کرتی۔ قوم انھیں مسائل کے متعلق سرسری طور پر تحکمانہ حکم لگا دیتی ہے اور اسی کو ہم رائے عامہ کہتے ہیں، مگر دوسرے معاملات پر وہ مطلق خیال نہیں کرتی اور اسکا خیال کرنا بے سود بھی ہے۔ حکم قائم کرنے کے لئے تو اس کے پاس مواد بھی نہیں ہوتا۔ مسودات قانونی کے جزئیات، حکمتِ عملی کے تعملی جزو، وضع قوانین کا مخفی حصہ، یہ سب اس کے راستہ سے خارج ہیں۔ وہ ان امور کے متعلق کچھ نہیں جانتی اور اس کے پاس نہ اتنا وقت ہے، نہ وہ اتنی محنت

کرسکتی ہے کہ ان مسائل پر احاطہ کرنے کے لئے جس غور وخوض کی ضرورت ہے وہ اس سے عہدہ برا ہوسکے۔ پس دارالعوام میں کسی اتفاقیہ کثرت کو حاوی اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ کثرت جس طرح چاہے قانون بنا سکتی ہے، اور اگرچہ اہم مسائل پر دارالعوام مجموعۃً نہایت ہی خوبی سے رائے عامہ کی نمایندگی کرتا ہے اور چھوٹے چھوٹے مسائل پر بھی اسکا فیصلہ اسکی ہیئت ترکیبی کی بعض پوشیدہ خوبیوں کی وجہ سے کسی حد تک صائب و افضل ہوتا ہے مگر با ایں ہمہ اس قسم کی دوسری جمعیتوں کے مانند دارالعوام بھی خود غرضانہ گروہ بندیوں کی فوری کارروائی کے شکار ہو جانے سے مامون نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ دارالعوام میں دو سو ۵۵ ارکان ریلوں کی طرف سے ہیں،، اگر یہ دو سو ارکان کسی ایسے معاملہ پر متفق ہو جانا چاہیں جسکی عام قوم کچھ فکر نہیں کرتی اور جسکی خود ان لوگوں کو اس وجہ سے فکر ہو کہ اس سے ان کی جیبوں پر اثر پڑتا ہے تو انھیں اختیار مطلق حاصل ہو جائے۔ یہ ہمیشہ ہو سکتا ہے کہ ایک خاص غرض کے چند زبردست و فتنہ پرداز اشخاص کسی اتفاق سے ایک آن واحد کے لئے حاوی جمعیت (دارالعوام) کے اوپر کامل غلبہ حاصل کر لیں، اور اس لئے یہ بہت ہی سودمند ہے کہ ایک مغائر نوعیت کا ایوانِ ثانی موجود ہو جسکی ہیئت ترکیبی بالکل مختلف ہو اور جسکی نسبت ہر طرح پر یہ خیال ہو کہ اس میں اس مقصد خاص کی حکمرانی نہ ہوگی۔

تمام پرفتن ذاتی اغراض میں سے سب سے زیادہ خطرناک اغراض، حکومت عاملانہ کے ہیں کیونکہ وہی سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے، اور ایسا واقع ہو چکا ہے اور پھر واقع ہوگا کہ دارالعوام میں نہایت درجہ صاحب قوت ہونے کی وجہ سے کابینہ ایسے چھوٹے چھوٹے معاملات قوم کے سر منڈھ دے جنھیں قوم پسند نہ کرتی ہو مگر اسکے ساتھ اتنی ان معاملات کو اسقدر کافی طور پر سمجھا بھی نہ ہو کہ وہ انھیں روک دیتی۔ اس لئے اگر نظر ثانی کی کوئی ایسی عدالت مل سکتی ہو جہاں جماعت عاملانہ طاقتور ہو مگر اتنی طاقتور نہ ہو تو حکومت کی صورت افضل و بہتر ہوگی۔ ایک ایسا ایوان جو کسی قانون کو وقتی طور پر روک سکے اگرچہ انقلاب کو نہ روکیگا نہ اس میں زیادہ وقت حائل کریگا مگر پارلیمنٹ خود سری کے چھوٹے چھوٹے واقعات کے راستہ میں سدِ راہ بن جائیگا۔

علاوہ ازیں ہر ایک بڑی جمعیت ایک تغیر پذیر جماعت ہے، کہنا یہ چاہئے کہ یہ ایک ایوان نہیں بلکہ متعدد ایوانوں کا مجموعہ ہے۔ آج کی رات یہاں ایک جماعت ہے کل کی رات

دوسری جماعت ہوگی۔ جماعت عاملانہ کی نسبت جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایوان کو برقرار رکھنے کا فرض اس پر عائد ہوتا ہے، اور وہ اس فرض کو انجام بھی دیتی ہے، اس سے بیشک ایک حد تک یکسانی و وحدت قائم رہتی ہے، ایک دائمی عنصر ایسا مہیا ہوگیا ہے جس کے آس پاس تمام تغیر پذیر عناصر جمع ہوتے اور گزر جاتے ہیں، لیکن اس تحفظی کل کے پورے وزن کی کامل رعایت کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی انگریزی دارالعوام احساسات و جذبات کے فوری تغیر و طوفان کے تابع ہے کیونکہ جو ارکان اس میں شامل ہیں وہ وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے ہیں، اور اس قسم کے تمام ایوانوں کا ایسا ہونا ضروری ہے۔ پس انگریزوں کے وضع قانون میں اس مضرت رساں نتیجہ کا احتمال دائمی ہے۔ پارلیمنٹ کے بہت سے قوانین ایسے ہیں جو اس وجہ سے مختلف خیالات کی زنبیل بن گئے ہیں کہ ان کے دفعات کے ایک حصہ کو ایک گروہ نے نافذ کیا اور دوسرے حصہ کو دوسرے گروہ نے۔

لیکن دارالعوام کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اسے فرصت میسر نہیں ہے! اس ایوان کی زندگی تمام زندگیوں میں بدتر ہے، یہ زندگی معینہ فرائض کا ایک حوصلہ فرسا دور ہے۔ اس کے سامنے اتنا کام آپڑا ہے کہ کبھی اس قسم کی کسی مجلس کے سامنے اتنا کام نہیں آیا تھا۔ برطانی شہنشاہی متفرقات کی حاصل جمع ہے اور اس مجموعہ کا ہر ایک جزو اپنے، اپنے ضروریات دارالعوام میں لاتا ہے۔ آج ہندوستان کی بحث ہے تو کل جمیکا کی، آج چین کی نوبت آئی ہے تو کل سلسوگ ہولشٹائن کی باری ہوتی ہے۔ انگریزوں کے قوانین کا تعلق ہر مسئلہ سے ہے کیونکہ ان کے ملک میں تمام اجزا و عناصر موجود ہیں۔ محض وہ سوالات جو وزراء سے دریافت کئے جاتے ہیں وہ انسانی معاملات کے نصف حصہ پر شامل ہوتے ہیں۔ ‹‹ خانگی مسودے ›› اگرچہ متعاقب قرار دیے جاتے ہیں پھر بھی غالباً انھیں سے دارالعوام کو اتنا حقیقی کام پیش آجاتا ہے جو کسی دقت کی کسی دوسری جمعیت کو قومی و ذاتی دونوں کاموں کو ملاکر بھی پیش نہ آیا ہوگا، ارکان کا اس طرح مسودات پیش کرنا بھی انگریزی حکومت کا ایک امتیاز خاص ہے۔ یہ تمام منظر تغیر پذیر کارروائیوں سے اس طرح پر ہے کہ اس کے پیچھے اپنا سر کھپانا نہایت ہی مشکل ہے

بہر نوع جب اس سے بہتر کوئی طریقہ نکل آئے اسوقت صورت حال جو کچھ بھی ہو مگر بحالت موجودہ توضیع قوانین کا کام، اسکی تمام جزئیات اور تمام دفعات کو خود ہی طے کرتا ہے۔

بے بسی کی تدبیر اور بیکار تضیع دماغ کی مثالوں میں ایک نہایت ہی مجبوری کی مثال یہ ہے کہ کسی ایسے مسودۂ قانون کے متعلق جس میں بہت سے دفعات ہوں، تمام ایوان ایک مجلس کے طور پر نشست کرے، معاندین اس مسودۂ قانون کو تباہ کرنا چاہیں اور قانون کے مختلف طرفدار اس میں طرح طرح کی ترمیموں کی فکریں کریں۔ پارلیمنٹ کا قانون کم از کم اتنا پیچیدہ تو ضرور ہوتا ہے جتنا کسی عقد کا طے کرنا، اور اس کا حال بہت کچھ ایسا ہوتا ہے کہ معاملتِ عقد رائے دہی پر چھوڑ دیا جائے اور اسکا تصفیہ ان لوگوں کی کثرت رائے پر ہو جن کو اس سے تعلق ہو اور اس میں غیر متول بچے بھی شامل ہوں۔ پارلیمنٹ میں ہر مقصد و غرض کا ایک نمایندہ ایک جماعت ہوتی ہے اور ہر صاحب غرض اپنے نفع کے لئے شور مچاتا ہے۔ حکومت عاقلانہ اپنی منضبط قوتوں اور چند قابل قدر ارکان کی مدد سے جو دار العوام میں بیٹھتے اور غور کرتے ہیں کسی قدر یکسانی و اتحاد قائم رکھتی ہے، مگر نتیجہ نہایت نامکمل ہوتا ہے کسی کل کی بہترین جانچ کام کی وہ مقدار ہے جو اس سے انجام پاتی ہے۔ کوئی شخص جو یہ جانتا ہو کہ قانونی دستاویزات کو کس طرح کا ہونا چاہئے، وہ پہلے ایک وصیت نامہ کو پڑھے جو اس نے ہی وقت لکھا ہو اور پھر پارلیمنٹ کے ایک قانون کو دیکھے۔ وہ یقینا یہ کہیگا کہ "میرے مختار نے اگر میرا کام اس طرح کیا ہوتا جس طرح مجلس وضع قوانین نے قوم کا کام کیا ہے تو میں اسے برطرف کر دیتا"۔ دار العوام جب تک ایسا ہی رہے جیسا اسوقت ہے، اسوقت تک ایک اشرافی، انضباطی اور تعویقی ایوان کا ہونا نہایت سودمند و مفید ہے۔

گر سوال یہ ہے کہ دار الامرا اس قسم کا ایوان ہے بھی یا نہیں؟ اس سوال پر تقریبًا بالکل ہی بحث نہیں ہوتی ہے۔ کم از کم تیس برس سے تو دار الامرا عام بحث و مباحثہ میں ایک امر مسلمہ سمجھا جا رہا ہے۔ عام حسیات و جذبات نے اس راستہ کو قطع نہیں کیا ہے اور اس معاملہ کو صاف کرنے کے لئے خیالات میں کسی قسم کا نمایاں جوش و ہیجان نہیں پیدا ہوا ہے۔

اس قسم کے ایوان میں جو وصف ہوتا ہے وہ دار الامرا میں بیش از بیش موجود ہے، یعنی یہ کہ اس میں مختلف معاملات طے پا سکتے ہیں۔ چونکہ معزز و باوقعت مشرفین کے کسی طبقہ کا پایا جانا دشوار ہے، اسلئے ایک اشرافی جمعیت کا مہیا ہونا بھی بیحد دشوار ہے۔ ایک وفاقی سینیٹ یا ایک ایوان ثانی جس سے توحد سلطنت کا اظہار ہوتا ہو اس میں یہی نفع مرعی ہے۔ وہ اس احساس کا اظہار مجسم ہے جسکا اثر نظم معاشرت کی بیخ و بن تک پہنچا ہوا ہے، یہ وہ

احساس ہے جو پیچیدہ سیاسیات سے قدیم تر ہے، اور جو عام سیاسی احساسات سے ہزار گونہ زیادہ قوی ہے، یعنی یہ ایک مختص المقام احساس ہے۔ سوئزر لینڈ کے مقامی حقوق کے حامی محب وطن نے یہ کہا تھا کہ "مجھے اپنا قمیص اپنے کوٹ سے زیادہ عزیز ہے"۔ اتحاد امریکی کی ہر ایک ریاست یہ محسوس کرے گی کہ امریکہ کے سینات کی بے وقعتی خود اسکی بے وقعتی ہے۔ اور اس لئے سینات کی وقعت و توقیر ہوتی ہے۔ اس کے کام میں عیب و صواب جو کچھ بھی ہو مگر وہ کام کر سکتی ہے۔ وہ ایک حقیقی، آزاد و موثر شے ہے۔ مگر عام حکومتوں میں یہ دشواری خطرناک حد تک پہنچی ہوی ہے کہ ایک غیر عمومی جماعت کو عمومی حکومت کے اندر پُرزور بنا دیا جائے۔

اس کہنے کا مفہوم کم و بیش یہی ہے کہ دارالامرا آزاد ہے۔ اگر یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ آزاد ہے تو وہ قوی نہیں ہو سکتا تھا بلکہ خود اسکی ہستی ہی کا امکان نہ رہتا۔ امرا متعدد اعتبار سے ارکان دارالعوام سے زیادہ آزاد ہیں، ممکن ہے کہ ان کا فیصلہ اتنا اچھا نہ ہو جیسا ہونا چاہئے مگر وہ قطعاً و حتماً انھیں کا فیصلہ ہے۔ دارالامرا کو بہ حیثیت ایک جماعت کے کسی معاشری رشوت کی پروا نہیں ہو سکتی، اور ہمارے اس زمانہ میں یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ دارالعوام کے بہت سے ارکان جو کسی اور رشوت کے اثر میں نہ آئیں وہ اس سب سے زیادہ فریب کار رشوت کے اثر میں آجاتے ہیں اور بہت زیادہ آجاتے ہیں۔ مطابع کے چلانے والوں اور مضمون نگاروں کی حالت اس سے بھی بدتر ہے کم از کم ان زیادہ باثر اشخاص کی حالت تو ضرور ایسی ہے جو اس ترغیب سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ جس چیز کو یہ لوگ معاشری حیثیت کہتے ہیں، اس "رتبے" کے لئے اور طبقۂ اعیان کے ساتھ خلا ملا بڑھانے کے لئے، ان ارکان میں سے بہت سے اشخاص کم و بیش ہر ایک کام کر ڈالیں اور ہر ایک بات کہہ ڈالیں گے۔ مگر امرا وہ لوگ ہیں جو معاشری رشوت دیتے ہیں، لیتے نہیں ہیں۔ وہ اس وجہ سے خرابی سے بالاتر ہیں کہ وہ خود مخرب ہیں۔ انھیں نہ کسی جماعت انتخاب کنندہ کا خوف ہے اور نہ انھیں کسی جماعت کو اپنی چرب زبانی سے لبھانا ہے۔ ملک میں اگر کوئی طبقہ ٹھنڈے دل سے بے غرضانہ رائے قائم کر سکتا ہے تو امرا کا طبقہ اسکا سب سے زیادہ اہل ہے۔ ماسوا اس کے ان کے پاس اس قسم کی رائے قائم کرنے کے لئے وقت بھی ہے۔ کوئی ایسا شغل جیسے شغل کہنا روا ہو، ان کے پاس نہیں ہے، جس سے وہ کسی اور طرف مشغول ہو جائیں۔

میدان کے کھیل محض لہو و لعب ہیں، اگرچہ بعض امرا انگریزوں کے حسب عادت ان میں بھی سنجیدگی پیدا کر دیتے ہیں۔ انگریزوں میں معدودے چند شخص ایسے ہوں گے جو سائنس یا ادب میں فنا ہو جائیں اور طبقۂ امرا میں تو غالباً یہ شغف متوسط طبقوں سے بھی کم ہے، سوسائٹی اس قدر یکساں و بے کیف ہے کہ اسے اب اس طرح کا شغل نہیں بنا سکتے جیسا اور وقتوں اور زمانوں میں رہا ہے۔ طبقۂ اعیان طبقہائے متوسط سے ہمیشہ ہراساں و ترساں رہتا ہے، اسے بقالوں اور سوداگروں کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ وہ اس قسم کی عیش و طرب کی سوسائٹی نہیں بنا سکتے جیسی فرانسیسی امرا نے کسی وقت میں بنا لی تھی۔ سیاسیات ہی ایک مشغلہ ہے جسے کوئی امیر مشغلہ کے نام سے اختیار کر سکتا اور بے خطر اس میں مشغول رہ سکتا ہے۔ علاوہ اسکے کہ دار الامرا کو عدالتی نظر ثانی کی آزادی اور دیگر امور پر موثر نظر ثانی کی حیثیت حاصل ہے اسے دائمی طور پر نظر ثانی کی فرصت بھی میسر ہے۔

یہ بہت بڑے اوصاف ہیں، اور جب یہ خیال کیا جائے کہ ایک ایوان ثانی کا مہیا کرنا کس قدر دشوار ہے، اور انگریزوں کے موجودہ ایوان اول کے ساتھ ایک ایوان ثانی کی کس قدر ضرورت ہے تو انگریزوں کو امرا کے ان اوصاف کا بہت کچھ منت کش ہونا چاہئے، مگر نہ اتنا کہ آنکھوں پر پردہ پڑ جائے۔ امرا کے ان اوصاف کے پہلو بہ پہلو ایسے نقائص بھی موجود ہیں جو بہت بڑی حد تک ان اوصاف کو بیکار کر دیتے ہیں۔ دار الامرا کو جو ثروت، جو منزلت، جو فرصت حاصل ہے وہ ایسی ہے کہ دار الامرا کو محض اسی بنا پر انگریزوں پر اس سے بدرجہا زیادہ حکمرانی حاصل ہو جاتی جو اس وقت ہے اگر اس کے خفیہ نقائص حارج ہو کر اسے کمزور نہ کر دیتے۔

ان میں سے پہلے نقص کو خفیہ کہنا زیبا نہیں ہے اگرچہ یہ ضرور ہے کہ وہ پوری طرح لوگوں کو معلوم نہیں ہے۔ انگریزوں کے ادارات کے ایک سخت نکتہ چین نے جو غیر دوستدار نہیں تھا، یہ لکھا ہے کہ بعض لوگوں میں دار الامرا کی قدر و منزلت کا جو مرض پیدا ہو جاتا ہے، اسکا "علاج" یہی ہے کہ وہاں جا کر اسکو دیکھا جائے"۔ اس کے دیکھنے کا وقت وہ نہیں ہے جب دونوں فریق اپنے پورے زور و شور کے ساتھ میدان کارزار میں موجود ہوں یا مصوت فوج کی قواعد ہوتی ہو بلکہ اس کے دیکھنے کا وقت وہ ہے جب وہ معمولی طور پر اپنا کام انجام دیتا ہو۔ کام کے وقت اس ایوان میں غالباً دس امیر ہوں گے، ممکن ہے کہ صرف چھ ہوں،

کارروائی کے لئے تین کا کورم (نصاب) ہے۔ وہ چار اور امرا وقت گزاری کرنے آجائیں یا نہ آئیں۔ یہ امرا خاص خاص متمرزاہل قانون اور چند مدبر ہوتے ہیں جنھیں ہر شخص جانتا ہے۔ (چند برس قبل جب لنڈہرسٹ، بروہم اور کیمبل زوروں پر تھے تو یہی لوگ سب سے بڑے مقرر تھے)۔ مگر ایوان کا اکثر حصہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو مقرر دارالعوام میں مہارت پیدا کرتے ہیں وہ دارالامرا میں بولنے سے گریز کرتے ہیں۔ لارڈ چیتھم اسے "نقش قالین" کہا کرتا تھا۔ زندگی کے زور شور کا اگر کوئی منظر ہے تو وہ دارالعوام ہے۔ اس اژدہام کا ہر ایک رکن اس معجون مرکب کا ہر ایک جزو (اچھا یا برا) ایک نہ ایک مقصد رکھتا ہے، ہر ایک کی (چھوٹی یا بڑی) ایک نہ ایک غرض ہوتی ہے جو کچھ فی الحال ہے اس کی نسبت اس کا ایک خاص خیال ہے، اور جو کچھ ہونا چاہئے اسکی نسبت اس کا ایک خاص خیال ہے، اس سے بحث نہیں کہ یہ خیال کیسا ہے؟ مگر نتیجہ واضح ہے اور اچھا ہے۔ اس ایوان کا ایک عام احساس ہے، ایوان کا ایک "ادراک" ہے اور کوئی شخص جو اسکا حال کچھ بھی جانتا ہو وہ اس سے متنفر نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے ایک بڑے ذکی الحس شخص نے بیانگ کہدیا ہے کہ دارالعوام کو (بہ حیثیت مجموعی) اس سے زیادہ ادراک ہے جتنا اسکے کسی ایک شخص کو ہے"۔ مگر دارالامرا میں ایسا کوئی ادراک نہیں ہے کیونکہ وہاں کوئی زندگی نہیں ہے۔ ایوان ادنیٰ پرشوق مدبرین کا ایوان ہے، اور ایوان اعلیٰ کی نسبت اگر کچھ نہ کہا جائے تو بدرجۂ اقل یہ تو ضرور ہے کہ وہ) پرشوق اشخاص کا ایوان نہیں ہے۔

یہ سہل انگاری ظاہرا ًغضبی پڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے، فی الحقیقت اتنی نہیں ہے کہ یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ) امرا کی مجالس بہت سا کام انجام دیتی ہیں اور بڑی خوبی سے انجام دیتی ہیں۔ اور پھر یہ سہل انگاری جس حد تک ہے وہ بہت ہی قبیح ہے۔ ایک ایسا ایوان جو دولتمند اشخاص پر مشتمل ہو اور جو بغیر وہاں گئے ہوئے بالعوض رائے دے سکتے ہوں وہ بہت زیادہ وہاں نہ جائیں گے[1] مگر اس تمام حذف و اسقاط کے بعد بھی اکثر و بیشتر امرا کی اپنے فرائض سے واقعی بے پروائی ایک بہت بڑا نقص ہے اور ظاہر و علانیہ بے پروائی ایک خطرناک نقص ہے۔

[1] دارالامرا کے ایک حال کی قرارداد کے موافق بالعوض رائے دہی کا طریقہ اب ساقط ہو گیا ہے۔ (حاشیہ طبع دوم)

جہاں تک سیاسیات کا تعلق ہے لارڈ چسٹر فیلڈ کا یہ اصول نہایت صحیح ہے کہ " دنیا آپ پر اسی کے موافق حکم لگائے گی جیسے آپ بظاہر معلوم ہوتے ہیں آپ فی الواقع جو کچھ ہیں اس پر حکم نہیں لگائے گی "۔ آپ جو کچھ ظاہر انظر آتے ہیں دنیا اسی کو جانتی ہے، دنیا یہ نہیں جانتی کہ آپ (باطناً) کیا ہیں۔ ایک جمعیت بالخصوص ایک تنقیح ساز جمعیت، جو مجتمع نہ ہوتی ہو اور جس سے بظاہر یہ پایا جاتا ہو کہ اسے اسکی پروا بھی نہیں ہے کہ وہ نظر ثانی کا کام کس طرح انجام دیتی ہے اس کے اجزا میں ایک اہم سیاسی نقص موجود ہے۔ یہ جمعیت کارآمد ہوسکتی ہے مگر بنی نوع انسان کو مشکل سے یہ یقین دلاسکتی ہے کہ وہ کارآمد ہے۔

دوسرا نقص اس سے بھی زیادہ بڑھکر ہے، اسکا اثر دار الامرا کے نہ صرف ظاہری کام پر بلکہ اس کے حقیقی کام پر پڑتا ہے۔ ایک اشرافی مجلس وضع قوانین کی ضرورت کے لئے اس کی تکوین میں زائد از ضرورت یکسانی رکھی گئی ہے۔ غلطیاں مختلف قسم کی ہوتی ہیں، مگر دار الامرا کی ہیئت ترکیبی ایسی ہے کہ وہ صرف ایک غلطی کی روک کرتا ہے یعنی زائد از ضرورت عجلت کے ساتھ تغیر نہ ہو۔ چند اہلِ قانون اور بالائی لوگوں کو چھوڑکر امرا تمام تر کم وبیش متمول زمیندار ہیں۔ اس میں کم وبیش اسی ایک طبقہ کے خیالات، محامد و نقائص موجود ہیں۔ وہ جس حد تک بھی قانون پر نظر ثانی کرتے ہیں، وہ نظر ثانی تمام وکمال اس طبقہ کے معمولہ اغراض، اسی کے حاوی و غالب خیالات اور اسی کی متوارث رایوں کے زیر اثر ہوتی ہے۔ قانونِ اصلاح کے وقت سے انکے میلان طبع کی یہ یکسانی بہت نمایاں نظر آرہی ہے۔ یہ کہنا تو سخت ہے کہ نئی توضیع قوانین کے متعلق امرا کا خیال معاندانہ ہے مگر مشتبہ ضرور ہے۔ اس قانونِ اصلاح کا انداز ایسا تھا جو ان کے اندازِ طبیعت کے مغائر تھا، اور جب ان سے ہوسکا تھا انھوں نے اسے نکال پھینکنے کی کوشش کی۔ یہ انداز وہ ہے جسے " روحِ جدید " سے ملقب کرتے ہیں۔ اس کے نفسِ مفہوم کو ایک فقرہ میں جمع کردینا آسان نہیں ہے۔ یہ ہماری زندگی میں جاری وساری ہے، یہی ہمارے اعمال و افعال کا محرک ہے، وہ ہمارے خیالات کا جوہر ہے۔ اس کے حصر وتعریف کے لئے اگرچہ ایک پورا مقالہ درکار ہوگا مگر ہم سب جانتے ہیں کہ اسکا مفہوم کیا ہے۔ اس پر امرا معترض ہیں، جہاں اسکا قدم آیا اور امرا بے لوث تنقیح ساز ہونیکے بجائے جانبداری کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔

ہیئتِ ترکیبی کی یہ وحدت کوئی عیب نہیں ہے، بلکہ اگر دار الامرا کی تنقید گو وہ

ایک مشکوک سی تنقید ہے، اعلیٰ تعلیم و فراست کو لئے ہوئے ہوتی تو یہ وحدت ترکیب ایک خوبی ہوجاتی یا ہوسکتی تھی۔ ہر زمانہ کے مخصوص وضع قانون میں اس زمانہ کے مخصوص نقائص ضرور ہونگے۔ وضع قانون ایک خاص طبیعت کا نتیجہ ہے جسکا ناقص و محدود ہونا لازمی ہے۔ اگر ہمیں کوئی ایسا کافی و وافی نقاد ملجائے جو ان امور کو دیکھ سکے جنھیں زمانہ نہیں دیکھتا ہے، اور زمانہ نے جس چیز کو غلط سمجھا ہے اسے وہ صحیح طور پر سمجھ سکے، تو یہ ایسا نقاد ہوگا جسکی قدر و قیمت کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا دارالامرا وہ نقاد ہے۔ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس زمانہ کے وضع قانون کے ساتھ اسکا بیدردستدارانہ انداز اس امر پر مبنی ہے کہ زمانہ جس چیز کو نہیں دیکھتا ہے وہ اسکی نظر میں ہے اور زمانہ جس چیز کو دیکھتا ہے اسے وہ زیادہ صحت نظر کے ساتھ دیکھتا ہے۔ امرا کا نہایت ہی خالی جانبدار، اور ان کا نہایت ہی سرگرم مدح خواں بھی اگر اس میں انصاف و صلاحیت ہے تو ایسا نہیں کہہ سکتا۔ شہادت ضرورت سے زیادہ قوی ہے مثلاً ایک معاملہ آزاد تجارت کا تھا کسی شخص کو بھی اس میں شبہہ نہیں ہوسکتا کہ امرا کی رائے کلیتہً غلط تھی، وہ جو کچھ کرنا چاہتے تھے اور اگر وہ اپنی ہی طبیعت پر چلتے تو وہ جو کچھ کر گزرتے انہیں وہ از سرتا پا غلطی پر تھے۔ "روح جدید" کی یہ سب سے زیادہ واضح و صاف جانچ ہے، اور معاملات کے بہ نسبت اسکی صحت کا تیقن آسان تر ہے۔ تجارت کی مثال جنگ کی ہے، اسکا نتیجہ ہویدا ہے۔ آپ کو اس سے نفع مالی ہوتا ہے یا نہیں ہوتا ہے۔ اعداد و شمار کے خلاف مرافعہ کرنا ایسا ہی ہیچ ہے جیسا نتیجہ جنگ کے خلاف مرافعہ کرنا۔ اس میں کسی کو شک نہیں ہوسکتا کہ محض آزاد تجارت کی وجہ سے انگلستان بہت کچھ بہتر حالت میں ہے، اور اس کے پاس روپیہ زیادہ ہے اور اہل ملک اس کا روپیہ جس طرح سے خرچ کرنا چاہتے ہیں اس طرح سے زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ وہ ایک صورت واقعہ جس میں ہم لاجواب طور پر "روح جدید" کی جانچ کر سکتے ہیں، انھیں یہ روح صحت پر تھی اور وہ شکی دارالامرا جس سے اگر ہوسکتا تو وہ اسے مسترد کر دیتا غلطی پر تھا۔

ایک دوسری وجہ اور بھی ہے، دارالامرا چونکہ ایک موروثی ایوان ہے اس لئے اس کی قابلیت عام معیار سے بہتر نہیں ہوسکتی۔ ہوسکتا ہے کہ اسمیں غیر معمولی قابلیت کے لوگ بھی شامل ہوں اور تقریباً ہمیشہ ایسے لوگ اس میں شامل رہے ہیں اور تقریباً ہمیشہ شامل رہیں گے، مگر اس کے پیدائشی قانون ساز بلحاظ اوسط غیر معمولی آدمی نہیں ہوسکتے

یہ خلف اکبر کا ایک گروہ ہے جنھیں اتفاق و تاریخ نے چن لیا ہے، اس لئے وہ بہت زیادہ
عقلمند نہیں ہو سکتے۔ یہ ایک مستقل معجزہ ہو جائے گا کہ اس قسم کے ایوان کو اپنے زمانہ کا
ایسا علم و وقوف حاصل ہو جو اس زمانہ کے دوسرے لوگوں کے علم و وقوف سے بالاتر ہو،
انکا علم اوروں سے فائق و کامل ہو، اور جو شے دوسروں کو نظر نہ آتی ہو اسے وہ دیکھتا ہو
اور جس شے کو دوسرے دیکھتے ہوں مگر صحیح نہ دیکھتے ہوں اسے وہ صحت کے ساتھ دیکھتا ہو۔

یہ مشکل اور بھی گہری ہو جاتی ہے۔ اس زمانہ کے قوانین پر نظر ثانی کرنا اور جو حق
نظر ثانی کرنے کا ہے اس طرح نظر ثانی کرنا ایک ایسا کام ہے جسکی انجام دہی کے لئے
طبقہ اعیان کو نہ صرف یہ کہ سہولت حاصل نہیں ہے بلکہ اس کی انجام دہی میں ایک مشکل
حائل ہے۔ ۱۸۶۵ء کی کتاب قوانین کو دیکھئے یعنی اس سال کے تمام قوانین پر ایک نظر
ڈالی جائے، آپ دیکھیں گے کہ یہاں ادب کے جواہرات نہیں بکھرے ہیں نازک
و لطیف پھولوں کے چمن نہیں لگے ہیں بلکہ سنگلاخ و روح فرسا کاموں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔
ان قوانین میں تجارت، مالیات، اصلاحِ قوانین تحریری و اصلاح قوانین غیر تحریری کی
بحثیں ہیں، وہ مختلف طرح کے کاروبار سے بحث کرتے ہیں مگر ہمیشہ وہ کاروبار ہی ہوتے
ہیں۔ کوئی تعلیم یافتہ انسان ایسا نہیں ہے جو ایک نوجوان امیر کے بہ نسبت کاروبار کو
اغلباً کم جانتا ہو بلکہ کاروبار کے جاننے کے لئے اسے ایک نوجوان امیر کے بہ نسبت
برتر موقع حاصل ہو۔ فی الحقیقت کام عیش طلبی سے زیادہ خوشگوار ہے، اس میں آدمی کا
سارا خیال بلکہ وہ خود ہمہ تن عیش طلبی کے بہ نسبت زیادہ تسلسل و زیادہ تعمق کے ساتھ متوجہ
ہو جاتا ہے۔ مگر جیسا ہے، ویسا بظاہر نظر نہیں آتا۔ ایک نوجوان شخص کو جسے اعلیٰ سے اعلیٰ
عیش و آرام حاصل ہو سکتا ہو یہ یقین دلانا دشوار ہے کہ کام میں اس سے زیادہ لطف ہے۔
ایک نوجوان امیر جسے حال ہی میں تیس ہزار پاؤنڈ سالانہ کی جائداد ہاتھ آئی ہو وہ علی العموم
پیٹنٹ (Patent) کے قانون، محصول گزرگاہ کے قانون، اور قید خانوں کے
قانون کے متعلق فکر نہیں کرے گا۔ وہ ہر قل کی طرح نیکی کو اختیار کریگا مگر کام کو ہر قل
بھی شاید ہی اختیار کرتا۔ کام سے کنارہ کرنے کے لئے اس کے سامنے ہر ایک ترغیب موجود
ہے۔ مگر کام کی طرف مائل ہونے کے لئے کوئی ترغیب نہیں ہے، اور اگر اسے کام
کی طرف توجہ کرنے کی خواہش ہو بھی تو اس کے ذرائع ناکمل ہیں۔ عیش و طرب اس سے

قریب ہے مگر کام اس سے بہت بعید ہے۔ ایک نیک نیت نوجوان شخص جس نے کاروباری دنیا سے بالکل الگ پرورش پائی ہو اور اسے کاروباری دنیا میں قدم رکھنے کی تمنا ہو کام کے متعلق اس کے جو خیالات ہوں گے، ان سے زیادہ باعث دلچسپی بہت ہی کم کوئی چیز ہو گی۔ اس خیال کا اس کے ذہن میں آنا دشوار ہے کہ کام میں ہوتا کیا ہے۔ کام فی الواقع یہ ہے کہ چند مخصوص ذرائع کو چند ویسے ہی مخصوص انجام کے ساتھ تطبیق دیجائے۔ مگر شاید ہی کوئی نوجوان شخص جسے تجربہ نہ حاصل ہو اس قابل ہو گا کہ انجام و ذرائع کو الگ الگ کر سکے۔ اسے ایک طرح کا اسرار معلوم ہوتا ہے اور یہ خوش قسمتی ہے اگر وہ یہ خیال نہ کرے کہ ظاہر صورت اصل چیز ہے اور غایت دانجام دوسرے درجہ پر ہے بکثرت ایسے کاروباری لوگ موجود ہیں جو اسے یہی صلاح دیں گے مگر ان لوگوں کو کاروباری کہنا ہی غلط ہے۔ یہ مضمون ایک طرح کا معما معلوم ہوتا ہے۔ یہ نفاست پسند نوجوان یہ پوچھتا ہے کہ "تم مجھے کیا پڑھنے کی صلاح دیتے ہو"، اور اسے یہ سمجھانا غیر ممکن ہے کہ مطالعہ کا اس سے کچھ واسطہ نہیں ہے اور ابھی اس کے دل میں وہ ابتدائی خیال ہی نہیں پیدا ہوئے جنکی نسبت وہ کچھ پڑھے۔ نظم و نسق ملکی، مصوری کی طرح ایک فن ہے، اور ان دونوں میں سے کسی میں بھی مشق و مہارت کسی کتاب سے نہیں حاصل ہو سکتی۔

سابق میں طبقۂ اعیان کا یہ نقص خود ان کے مفید مطلب مواقع کی وجہ سے پوشیدہ تھا، چونکہ یہی ایک طبقہ تھا جسے آسانی کے ساتھ روپیہ ملجاتا تھا اور وہ دماغی تربیت سے بھی آراستہ ہوتا تھا، اس لئے کوئی ان کا مدمقابل نہیں تھا اور اگرچہ غیر معمولی لیاقت کے لوگوں کو مستثنیٰ کر کے بالعموم ایسا نہ ہوتا ہو کہ سلطنت کے کام میں وہ لائق و فائق ہوں مگر جو لوگ مل سکتے تھے ان میں وہ سب سے اچھے تھے۔ تاہم اگلے وقتوں میں بھی وہ زیادہ محنت طلب کاموں سے خود کو بچائے رہتے تھے۔ وہ پیل یا والپول کے سے کسی شخص کو (جو سب کچھ ہو مگر عادتاً و طبیعتاً اعیانی نہ ہو) اپنی طرف سے کام کرنے اور اپنا انتظام کرنیکے لئے منتظم بنا دیتے تھے۔ مگر اب ایک طبقہ ایسا پیدا ہو رہا ہے جسکے خیالات تربیت یافتہ ہیں، جس کے پاس کثیر روپیہ موجود ہے اور پھر اس کے ساتھ اسے کاروبار میں بھی مہارت ہے۔ جس وقت میں یہ لکھ رہا ہوں اس طبقہ کے دو ارکان کا تقرر ایسے منصبوں پر ہو گیا ہے

جو فی نفسہ موقّر ہیں۔ اور (سیاسیات میں اگر کسی امر کا تیقن ہو سکتا ہے تو) یقینی ہے کہ وہ کابینہ میں شامل اور با اقتدار ہو جائیں گے۔ یہ کاروبار میں اعلیٰ مہارت حاصل کئے ہوئے لوگوں کا وہ طبقہ ہے جو چند برسوں میں اسقدر قابل ہو جائے تھا کہ کاروبار کو چھوڑ کر بلند حوصلگیوں میں پڑ جائے۔ ابھی تک زندگی عامہ میں ان لوگوں کی تعداد بہت ہی کم ہے کیونکہ یہ لوگ خود اپنی قوت سے واقف نہیں ہیں۔ یہ معاملہ پھر وہی کو مکس اور انڈے کے معاملہ کے مانند ہے۔ چند اصحاب جو دت یہ ظاہر کردیں گے کہ ایسا ہو سکتا ہے اور پھر اسکے بعد تمام لوگوں کا ایک گروہ ان کے پیچھے چل نکلے گا۔ یہ لوگ کاروبار کو کسی حد تک موروثی حیثیت سے (اگرچہ بعد) جانتے ہیں، اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ بہت سے "دار العلومی" خاندان ہیں جنکی زبانوں پر رفاقت کا چرچا رہا کرتا ہے اور انھیں جہاں اپنے لڑکوں کی قابلیت معلوم ہوئی تو فوراً انھیں لاطینی نظموں کے پڑھنے پر لگا دیا۔ اسی قسم کے کچھ ہندوستان والے خاندان تھے، اور اب مقابلتی طریق امتحان جب برگ و بار لائے گا تو غالباً پھر ایک نئی نسل ایسی ہی پیدا ہو جائیگی۔ بالکل اسی طرح کچھ کاروباری خاندان ہیں جو ان تمام امور سے جنکا تعلق روپیہ سے ہے اور ان تمام امور سے جنکا تعلق نظم و نسق کی سے، ایسے مانوس ہیں جیسے وہ اپنی سانس لینے کی ہوا سے مانوس ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امریکہ کے تمام ہی لوگ کاروبار سے آشنا ہیں، یہاں کے ملک کی آب و گل میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ بالکل اسی طرح انگلستان میں بھی بعض طبقات کاروبار کو جانتے ہیں اور ایک امیر بمشکل اسے جان سکتا ہے۔ کسی محل میں بیٹھکر کاروبار کا سیکھنا ایسا ہی دشوار ہے جیسا کسی باغ میں زراعت کا سیکھنا۔

بیشک ایک طرح کے کاروبار پر یہ اصول صادق نہیں آتا، ایک نوع کام کی ایسی ہے جس میں انگلستان کے طبقۂ امرا کو ابھی تک فوقیت حاصل ہے اور اغلب ہے کہ ابھی مدتوں اسے یہ فوقیت حاصل رہے گی۔ یہ کام سفارت کا کام ہے۔ نپولین جو آدمیوں کو خوب ہی پہچانتا تھا، اس سے جہاں تک ہو سکتا تھا انقلاب کے لوگوں کو قدیم درباروں کی سفارت پر نہیں بھیجتا تھا، وہ کہتا تھا کہ "وہ نہ کسی سے بات کرتے ہیں اور نہ کوئی ان سے بات کرتا ہے، اس لئے وہ اپنے وطن کو کوئی اطلاع نہیں بھیجتے"۔ اسکی وجہ صاف عیاں ہے یورپ کی پرانی سیاسیات بہت کچھ ملاقات کے کمروں میں طے ہوا کرتی تھی اور ایک بڑی حد تک

ضرورتاً اب بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ مختلف ممالک کے اعلے ترین طبائع کم و بیش ہم شکل ہوتے ہیں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ سب سے اعلیٰ طبقہ سب سے زیادہ سفر کرتا ہے، غیر اقوام کی حالات سب سے زیادہ جانتا ہے، مخصوص ملکی فریقانہ عصبیت جسے حب الوطنی کہتے ہیں اور اکثر ایسا ہی سمجھا بھی جاتا ہے، اسکا اثر اس میں بہت ہی کم ہوتا ہے۔ بیشک خود انگلستان میں نیا طبقہ تجار اصلی قابلیت میں طبقۂ اعیان کے ہمپایہ ہے، غیر ملکی معاملات کا علم انھیں ایسا ہی وسیع حاصل ہے اور غیر ممالک سے انکا تعلق امرا سے کچھ زیادہ ہی ہے مگر باایں ہمہ یہ نئی نسل سفارتی کام کے لئے اس درجہ کارآمد نہیں ہے جتنی پرانی نسل کارآمد ہے۔ سفیر محض ایک گماشتہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک نظارہ گاہ بھی ہوتا ہے اسکا باہر بھیجنا جس طرح حقیقی کام کے لئے ہوتا ہے، اسی طرح نمائش کے لئے بھی ہوتا ہے۔ وہ غیر درباروں میں اور غیر پادشاہوں کے سامنے ملکہ کی نمایندگی بھی کرتا ہے۔ طبقۂ اعیان اپنی حالت کے اعتبار سے اس کام کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ زندگی کے نمائشی جزو کی اسے اچھی تعلیم حاصل ہوتی ہے، اگر وہ کسی کام کے لئے موزوں ہے تو وہ اسی کام کے لئے ہے۔

مگر اس استثنا کے بعد، طبقۂ اعیان کاروبار میں لامحالہ، ان طبقات سے پست رہیگا جنھیں کاروبار سے زیادہ لگاؤ ہے، اور اس لئے اگر ہمیں یہ موقع حاصل ہو کہ ہم مختلف طبقات میں سے ایک طبقہ کو اس غرض سے منتخب کریں کہ اس میں سے کچھ لوگوں کو لیکر کاروبار کے معاملات پر نظر ثانی کرنے کے لئے ایک ایوان مرتب کیا جائے، تو یہ طبقۂ اعیان اس کے لئے موزوں نہیں ہوگا۔ فی الواقع دار الامرا جس خوبی کے ساتھ اپنا کام انجام دیتا ہے وہ ایک نمایاں مثال اس امر کی ہے کہ کاروبار کی عادت انگریزی قوم کے رگ و ریشہ میں کس درجہ پیوست ہے۔ ''مکمل ایوان''، کی عام ظاہری حالت مضحکہ انگیز معلوم ہوتی ہے بلکہ وہ ایک خطرناک اجتماع ضدین ہے جیسا مسٹر برائٹ اکثر کہا کرتے ہیں مگر حقیقی کاموں کا ایک بہت بڑا حصہ ''ذیلی مجلسوں''، کے اندر انجام پاتا ہے اور اکثر بہت اچھی طرح انجام پاتا ہے۔ امرا کا بہت بڑا حصہ اپنے مقررہ کاموں میں سے کوئی کام بھی انجام نہیں دیتا اور ان کاموں کو کچھ کر بھی نہیں سکتا مگر ایک حصۂ قلیل اپنے فرض کو انجام دیتا، اور بہت اچھی طرح انجام دیتا ہے، یہ حصۂ قلیل اس زمانہ میں جس قدر وسیع ہے اور جس قدر صدق دل سے کام کرتا ہے ایسا کہیں اور نہیں ہوا ہے۔

تاہم کوئی شخص اگر بغیر کسی تعصب کے اس معاملہ کی جانچ کرے گا تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ کام مکمل طور پر انجام پاتا ہے۔ انگلستان کے سے ملک میں جسکی ذہنی و دماغی حالت اس درجہ شاداب ہو وہاں قوانین کی نظرثانی میں اس سے زیادہ دماغی طاقت کام میں لائی جاسکتی ہے اور لائی جانا چاہئے۔

صرف یہی نہیں ہے کہ دارالامرا اپنا کام غیر مکمل طور پر کرتا ہے بلکہ ہمیشہ نہیں تو اکثر اپنے کام کو ڈرتے ڈرتے انجام دیتا ہے۔ چونکہ وہ قوم کا صرف ایک جزو ہے اسلئے وہ قوم سے خائف رہتا ہے۔ چونکہ سالہا سال سے وہ اس امر کا عادی ہو گیا ہے کہ نہایت ہی اہم معاملات کے متعلق وہ اپنی رائے اور سمجھ کے خلاف عمل کرے، اس لئے وہ شاید ہی اتنا بھی سمجھتا ہو کہ اپنی رائے پر کب عمل کرنا چاہئے۔ یہاں کی پژمردگی سے کسی نوجوان امیر کے ذوق و شوق پر جیسی اوس پڑ جاتی ہے وہ بسا اوقات مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ بہت سے امرا کے دل ہی دل میں یہ خیال چٹکیاں لیتا ہے کہ "جب قوانین غلہ منسوخ ہو گئے اور بوسیدہ (یا جیبی) قصبات کا نام و نشان مٹ گیا تو پھر روئی کے کارخانوں کے منضبط کرنے کے مسودۂ قانون کی دفعہ یازدہم کی تراش خراش کے درپے ہونے کا کیا حاصل ہے"۔ کسی معاملہ کے متعلق سر برآوردگان فریق کی طرف سے اگر کوئی پیغام پہنچ جائے، "ڈیوک اعظم" لارڈ ڈربی یا لارڈ لنڈ ہرسٹ کی زبان سے اگر کچھ نکل جائے تو ان امرا کی خفتہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں، مگر امرا اکثر و بیشتر کمزور ہوتے اور کس مپرسی کی حالت میں پڑے رہتے ہیں۔

دارالامرا اگر لارڈ پامرسٹن کی پہلی حکومت کی اس تجویز کو مسترد نہ کر دیتا کہ امرا کا تقرر زندگی بھر کے لئے ہوا کرے، تو یہ اہم نقائص فوراً ہی کم ہو جاتے اور بمرور ایام بالکل ہی مٹ جاتے۔ یہ تدبیر تقریباً بالکل مکمل تھی۔ دارالامرا کے ایسے پرانے ادارے کی اصلاح کرنے میں لامحالہ سخت مشکل کا سامنا ہوتا ہے۔ اس کے تحفظ کا امکان ہی اس کے تسلسل طبقاتی اور اس کے قدیمی احترام پر مبنی ہوتا ہے، اور اگر آپ اس کے متعلق ہنگامہ آرائی شروع کر دیں، جلسوں میں اسکی نسبت شور مچانے لگیں، تو وہ احترام جاتا رہتا ہے، اسکی مخفی دلکشی غائب ہو جاتی ہے، اسکا محفوظ تقدس ہوا ہو جاتا ہے۔ مگر خوبی قسمت سے نظام سلطنت کے کسی گوشہ میں ایک پرانا حق شاہی پڑا رہ گیا تھا جو اس ہنگامہ آرائی کی

ضرورت ہی باقی نہ رکھتا، جو ہنگامہ آرائی کے بغیر وہ سب کچھ کر دیتا جو اس تمام ہنگامہ آرائی سے انجام پاتا۔ لارڈ پامرسٹن اب دنیا سے گزر چکے ہیں اور انکی نسبت اب سکون دل کے ساتھ رائے دیجا سکتی ہے، پس ہمارا خیال ہے کہ وہ طبقۂ اعیان کے ایسے ہی مستحکم دوست اور شان اعیانیت میں ایسے ہی از سر تا پا غرق تھے جیسا انگلستان میں کسی شخص کا ہونا ممکن ہے، اور پھر بھی اونھوں نے اس اختیار سے کام لینے کی تجویز کی۔ دار الامرا اگر بدستور ڈیوک ولنگٹن کے زیر اقتدار ہوتا تو غالبًا امرا اس پر رضا مند ہوجاتے۔ یہ ضرور ہے کہ ڈیوک ان تمام دلائل و براہین پر غور نہیں کرتا جو ایک فلسفی مدبر اس کے روبرو پیش کرتا مگر وہ اپنے خصوصیات میں سے ایک خصوصیت کی وجہ سے راہ راست پر آجاتا۔ تاج کی مخالفت اسے سب باتوں سے زیادہ ناپسند تھی۔ ایک نہایت نازک موقع پر یعنی جب قوانین غلہ کا مسئلہ نازک حد کو پہنچ گیا تھا اس وقت اس نے جس بات کا خیال کیا وہ مسئلہ زیر بحث کا اقتصادی پہلو یا ملک کی بہبود کا کانٹے کے تول معلق ہونا نہیں تھا جیسا کہ دوسرے لوگ سوچ رہے تھے بلکہ اسکا خیال ملکہ کے وقتی اطمینان خاطر پر مرکوز تھا۔ وہ دستور سلطنت میں تاج کو اس درجہ بالا و فائق جزو سمجھتا تھا کہ نازک سے نازک مواقع پر بھی وہ تمام و کمال موجود الوقت حکمران کی وقتی آسائش پر نظر رکھتا تھا یا یہ کہتا تھا کہ اس کی نظر تمام و کمال اسی امر پر ہے۔ تاج کی کسی نمایاں و علانیہ کام کی مخالفت کرنے میں اسے کبھی راحت نہیں محسوس ہوتی تھی۔ یہ نہایت ہی اغلب ہے کہ اگر ڈیوک مذکور بدستور دار الامرا کا صدر ہوتا تو امرا اسے انگیز کر لیتے کہ بادشاہ کی بر محل تجویز رائج ہوجائے۔ مگر ڈیوک کا انتقال ہوچکا تھا، اور اسکا اقتدار یا اس اقتدار کا کچھ جزو ایک بہت ہی مختلف شخص یعنی لارڈ لنڈہرسٹ کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ لارڈ موصوف میں بہت سے اعلیٰ صفات تھے، از انجملہ ایک اسکی شاندار ذہانت تھی، صداقت کے دریافت کرنے کا ملکہ اس میں ایسا بڑھا ہوا تھا کہ اپنے زمانہ میں وہ اس بارے میں کسی سے دبکر نہیں تھا، مگر اسے صداقت سے الفت نہیں تھی۔ صداقت کے دریافت کر لینے کے اس ملکۂ عظیم کے باوجود وہ اپنی تمام عمر خطا یقین رکھنے والوں میں سے تھا، خطا بھی ایسی جسے اب خود اسکا فریق خطا تسلیم کرتا ہے۔ وہ ایک مدبر کی حیثیت سے صداقت کا ویسا ہی پتا چلا سکتا تھا جیسا کہ وہ اس زمانہ میں کر سکتا تھا جبکہ وہ جج تھا مگر اس صداقت کا کبھی اسے پتا نہ چلا، اس نے کبھی اسکی جستجو نہیں کی۔

وہ اپنے فریق کی جانبداری میں بہت بڑھا ہوا تھا، اور اس نے اپنی قابلیت مناظرہ، اور اپنی ذہنی قوت مباحثہ سے جسکا شاید ہی کوئی مد مقابل ہو سکے، یہ کام لیا کہ اپنے فریق کے مسلمات کی تائید کرتا رہا۔ مادام الحیات امرا کے بنانے کی تجویز فریق مخالف کی طرف سے پیش ہوئی تھی اور فی الوقت یہ گمان غالب تھا کہ اس سے اس فریق کو نقصان پہنچ جائے گا۔ اس کے نزدیک یہ ایک بڑا موقع تھا۔ اس موقع پر اس نے جو تقریر کی وہ ان لوگوں کے دلوں میں تازہ ہے جنھوں نے اسے سنا تھا۔ اس کی آنکھیں اس وقت اس قابل نہ تھیں کہ وہ پڑھ سکتا پس اس نے اپنے حافظہ سے ان تمام تحریری اسناد کا حوالہ دیا جن کا تعلق اس مسئلہ سے تھا اور بالکل صحیح حوالہ دیا۔ انگلستان کی کسی جمعیت میں ایسے جلیل القدر ذہنی مساعی کے دیکھنے کا شاید ہی اتفاق ہوا ہو۔ مگر نتیجہ قابل افسوس نکلا۔ اپنے تحریری اسناد کی رو سے نہیں بلکہ اپنے مسلمہ اقتدار اور نمایاں اثر کے زور سے اس نے دار الامرا کو حکومت کی تجویز کے مسترد کرنے پر آمادہ کر دیا۔ لارڈ لنڈہرسٹ نے یہ فرمایا کہ بادشاہ اب ایسے امرا نہیں بنا سکتا اور اس لئے مادام الحیات امرا نہیں ہیں۔ دار الامرا نے خاموشی کے ساتھ اپنی اصلاح کر لینے کے اس بے بہا و بے نظیر موقع کو مسترد کر دیا۔ اس قسم کا موقع دوم مرتبہ نہیں آتا۔ جو مادام الحیات امرا اس وقت نئے بنائے جاتے وہ ملک کے اولین لوگوں میں سے ہوتے۔ لارڈ میکالے کا ان اولین میں سے ہونا ضروری تھا، لارڈ ونسلیڈیل جو انگلستان کے قانون داں اصحاب میں سب سے زیادہ ذکی اور کسی سے کم منطقی نہیں ہے، وہ سب ہی سے اول ہوتا جس قدر وقت گزرتا جاتا اس قسم کے آدمیوں کا موزونیت و آہستگی کے ساتھ اضافہ ہوتا جاتا اور ایسے تیس چالیس افراد دار الامرا میں ٹھیک وہ عنصر پیدا کر دیتے جسکی ایک تنقیدی ایوان ہونے کے لحاظ سے اسے اس قدر ضرورت ہے، خاندان اور دولت کے پریشان کن مباحث کے بغیر بہترین پختہ کار لوگوں کا اس ایوان اشرافی میں اضافہ ہو جاتا۔۔ دار الامرا میں جس عنصر کی ضرورت تھی وہی عنصر ایک قاعدۂ آئینی کے رو سے اس کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور اس نے اس سے انکار کر دیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس غلطی کی اصلاح اب کس نوع کی کوشش سے ہوگی مگر جب تک اس کی اصلاح نہ ہو جائے ذہنی قابلیت کبھی ہرگز ویسی نہ ہوگی جیسی ہوتی، ہرگز ویسی نہ ہوگی جیسی اسے ہونا چاہئے اور ہرگز کام کے لئے مکتفی نہ ہوگی۔

مادام الحیات امرا کے بنانے کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور اصلاح کا ہونا بھی ضروری تھا۔ رائے بالعوض کے طریقہ کو منسوخ ہونا چاہئیے تھا۔ دارالامرا کی حاضری کی یہ سست رفتاری کسی نہ کسی وقت اسے برباد کر کے رہے گی۔ ایسے مواقع بھی ہیں جنہیں ظاہر داری ہی حقیقت ہوتی ہے اور یہ موقع بھی انہیں میں سے ایک ہے۔ دارالامرا کو جیسا ہونا چاہئیے اکثر دنوں میں وہ اس سے اس درجہ متغائر نظر آتا ہے کہ بہت سے لوگ اس کا یقین ہی نہ کریں گے کہ اسے کیا ہونا چاہئیے۔ صاف ظاہر ہے کہ جب بے فکر امرا کا اندراج رایوں کے ذریعہ سے اپنی "عدم حاضری" میں بافکر امرا کو باوجود ان کی حاضری کے مغلوب نہ کر سکیں گے تو پھر ان آخر الذکر امرا کی حاضری بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ رائے بالعوض کی منسوخی دارالامرا کو ایک حقیقی ایوان بنا دیتی اور پھر مادام الحیات امرا کے اضافہ سے وہ ایک اچھا ایوان بن جاتا۔

ان تغیرات میں سے بڑے بڑے تغیر دارالامرا کے ثانوی فرائض کے انجام دینے میں نہایت ہی حقیقی طور پر اس کے ممد معاون ہوتے۔ بڑی قوموں میں غالباً یہ ہمیشہ واقع ہوتا رہتا ہے کہ ذی فہم اشخاص کی بعض جماعتیں جنہیں دستور سلطنت میں نمایاں جگہ حاصل ہوتی ہے، اپنے لئے ایسے فرائض حاصل کر لیتی اور مفید طور پر ایسے فرائض کو کام میں لاتی ہیں جن کے سرانجام کی ابتدائے کار میں کسی کو بھی ان سے توقع نہیں ہوتی اور جو ان کے مقصود ابتدائی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ یہ امر دارالامرا کے متعلق خاص طور پر واقع ہوا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال دارالامرا کا عدالتی فرض ہے۔ یہ ایک ایسا فرض ہے کہ کوئی عالم نظریات کسی نئے دستور سلطنت میں اسے ایوان ثانی سے متعلق نہیں کرے گا اور انگریزوں کے نظام سلطنت میں ایسا ہونا محض امر اتفاقی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عدالتی فرائض کے لئے ایوان ثانی کی ناموزونیت کا احساس آہستہ آہستہ ہو چلا ہے۔ انگریزی دستور سلطنت کی موجودہ ترتیب کار میں یہ فرض دارالامرا کے تفویض نہیں ہے بلکہ دارالامرا کی ایک مجلس سے متعلق ہے۔ صرف اوکانل کے مقدمہ کے وقت، تمام ایوان نے یا ان چند امرا نے جن سے تمام ایوان مراد ہے، یہ چاہا تھا کہ وہ رائے دیں مگر ان سے یہ کہا گیا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے ورنہ وہ ایوان کے عدالتی امتیاز خاص کو تباہ کر دیں گے۔ دراصل کوئی شخص بھی یہ جرأت نہیں کرے گا کہ وہ فی الواقع عدالتی فرض کو ایک ایسی مجلس کی اتفاقیہ کثرت رائے کے تابع کر دے

جسکی حاضری کبھی کم، کبھی زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ یہ ایک خوابیدہ نظریہ ہے، بیدار واقعہ ایسا نہیں ہے۔ قانونی نظر سے بھی یہ ایک نہایت مشتبہ معاملہ ہے کہ اس ملک میں دو اعلیٰ عدالتیں ہونا چاہئیں یا نہیں، یعنی ایک تو پریوی کاونسل (مجلس شاہی) کی جوڈیشل کمیٹی (ذیلی مجلس عدلی) اور دوسری دار الامرا کی جوڈیشل کمیٹی (ذیلی مجلس عدلی) (اگرچہ اسمًا اسے کمیٹی نہیں کہتے مگر واقعًا ایسا ہی ہے)۔ ابھی بہت ہی حال کے زمانہ تک ایسا ہو سکتا تھا کہ ایک ہی شخص کے متعلق ایک کمیٹی تو یہ فیصلہ کردے کہ وہ روپیہ کے معاملہ میں ذی ہوش و عاقل ہے اور دوسری کمیٹی یہ فیصلہ کردے کہ زمین کے معاملہ میں وہ فاتر العقل ہے۔ اس محال کا علاج کر دیا گیا ہے، مگر جس غلطی کی وجہ سے یہ محال پیدا ہوا، اسکا علاج نہیں ہوا ہے یعنی دو اعلےٰ عدالتوں کا ہونا، جن میں بکرات و مرات ایک ہی مسئلہ کا پیش ہونا یقینی ہے اور پھر اسکے ساتھ یہ بھی یقینی ہے کہ گاہ بگاہ ان کے فیصلے ایک دوسرے سے مختلف ہو جائیں۔ میں دار الامرا کے عدالتی فرض کو اس کے حقیقی قانونی فرائض میں شمار نہیں کرتا، اول تو اس وجہ سے کہ وہ فی الواقع اس پر عمل نہیں کرتا، دوسرے اس وجہ سے کہ میں ظاہری اعتبار سے اس ایوان کو اس سے مبرا دیکھنا چاہتا ہوں۔ انگریزی قوم کی اعلیٰ عدالت ایک بہت ہی شان کی عدالت ہونا چاہئے، تمام دوسری عدالتوں پر اسکی حکومت ہونا چاہئے، اسکا کوئی حریف مقابل نہیں ہونا چاہئے، اسے قوانین میں یکسانی و وحدت پیدا کر دینا چاہئے، اور اسے ایک تشریعی جمعیت کی قباؤں کے نیچے پوشیدہ نہ ہونا چاہئے۔

دار الامرا کے عدالتی فرائض کے برعکس، اس کے حقیقی قانونی فرائض اس کی نوعیت حقیقی سے بہت زیادہ متجانس و متشابہ ہیں۔ ان میں سے پہلا فرض جماعت عاملانہ پر تنقید کرنا ہے۔ ایک ایسی جمعیت جس کے اکثر و بیشتر افراد کو کسی طرح کا نقصان اٹھانے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے، جس کے زیادہ حصہ کو کسی نفع کی توقع نہیں ہے، جہاں ہر شخص کی ایک معاشری حیثیت مضبوطی سے قائم ہے، جہاں کسی کا کوئی حلقۂ انتخاب نہیں ہے، جہاں شاید ہی کوئی ایسا ہو جسے موجود الوقت وزرا کی نسبت کچھ فکر ہو، ایسی ہی مجلس اس لائق ہے جس میں آزادانہ تنقید ہو سکتی ہے اور جس سے اسکی توقع ہونی چاہئے اور فی الواقع ایسا ہے بھی۔ گزشتہ وزارتوں کے کارناموں کے متعلق لارڈ گرے نے جو تنقید کی ہے وہ قابل داد ہے، مگر اس قسم کی تنقید کی پوری قدر و منزلت جب ہی ہوگی جب وہ مختلف پہلوؤں کو لئے ہوئے ہو

ہر بڑی قابلیت کا شخص اپنی تنقید میں اپنے ہی خیالات کا سکہ جماتا ہے۔ وہ تنقید اعلیٰ خیالات واحساسات سے مملو ہوگی مگر وہ خیالات واحساسات ایک ہی خاص دماغ کا نتیجہ ہوں گے۔ ہماری ضرورت یہ ہے کہ ایوان اعلیٰ میں بہت سے قابل ولائق نقاد موجود ہوں، وہ لارڈ گرے کے ہمپایہ نہ ہوں نہ سہی، کیونکہ ایسا ہونا تو دشوار ہے مگر لارڈ گرے کے مثل تو ہوں۔ بے لوثی میں وہ اس کے مشابہ ہوں، صفائی خیال میں وہ اسکے مشابہ ہوں اور سب سے بڑھکر یہ کہ وہ معاملات پر کامل وغائر نظر کرنے میں اس کے مشابہ ہوں۔ کسی معاملہ پر ایک تو ایکٹر کی نظر ہوتی ہے جسکا ہر ایک ایسے قدیم وجدید امر پر حاوی ہونا تقریباً یقینی ہے، جو محقق وقطعی ہو چکے ہوں (یہ مرعی رہے کہ میں اس وقت پختہ اور سوچے سمجھے کام یعنی کابینہ کے کام کا ذکر کر رہا ہوں) مگر اس کے ساتھ ایک الگ سے دیکھنے والے کی بھی نظر ہوتی ہے جس میں ان قدیمی وقطعی امر میں سے ایک یا زاید کا حذف ہو جانا اغلب ہے، مگر اس میں کچھ ایسے جدید وبعید معاملات کا شامل ہونا بھی اغلب ہے جنھیں منہمک ومشغول کام کرنے والا نہیں دیکھ سکتا۔ انگریزوں کے ایوان ثانی میں بہت سے مادام الحیات امرا ایسے ہونا چاہئیں جن میں اس اعلیٰ انتقاد سے فیض پہنچانے کی قابلیت ہو۔ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ جلد ایسا نہ ہوگا، مگر اسکا پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ لوگ اس شئی کی آرزو کرنا سیکھیں۔

دارالامرا کا دوسرا ثانوی کام اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ دارالعوام میں اگر اصلاحات ہو جائیں جن کی بہت ہی کم توقع ہے، تو ان اصلاحات کے بعد کے دارالعوام کی نہیں بلکہ وہ واقعاً جیسا اسوقت قائم وموجود ہے، اسکی حالت یہ ہے کہ وہ کاموں کے نیچے پسا جا رہا ہے۔ اس کو منتظم رکھنے کا کام کابینہ کے سر پڑتا ہے اور یہ کام نہایت ہی مشکل ہے۔ کابینہ کے ہر ایک اُس رکن کو جو دارالعوام میں شامل ہے، ایوان میں حاضر ہونا ضروری ہے۔ ایوان کے منتظم رکھنے کے لئے اسے اپنی آواز سے نہیں، تو اپنی رائے سے مدد دینا پڑتی ہے۔ تعلیمی محکمہ کے ایسے چھوٹے سے معاملہ میں بھی مسٹر لو کے ایسے پختہ کار مبصر نے کہا کہ "اس محکمہ میں ایک ایسے سرگروہ کا ہونا مفید ہوگا جسے دارالعوام کی حاضری کی صعوبت شدیدہ نہ برداشت کرنا پڑے"۔ اسے ضروریات لابدی ہی کے مانند سمجھنا چاہئے کہ کابینہ کے بعض ارکان اس مشقت سے مستثنیٰ رہیں، اور وہاں کے

ہیجان و اضطراب کا ان پر اثر نہ پڑے مگر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انھیں قوم کے سامنے اپنے خیالات کی تشریح کرنے کا بھی اختیار حاصل ہو، ان کی باتیں اسی طرح سنی جائیں جس طرح دوسرے لوگوں کی باتیں سنی جاتی ہیں۔ ایسا کرنے کی مختلف تدبیریں ہیں جن پر میں دار العوام کے متعلق گفتگو کرتے وقت کسی قدر بحث کروں گا۔ اتنا تو صاف عیاں ہے کہ دار الامراخاص اپنے ارکان کے لئے یہ مقصد حاصل کر لیتا ہے۔ ان کی ایک آواز ہوتی ہے اور اس سے بڑھکر یہ کہ ان کی ایک حیثیت ہوتی ہے جو کسی بالمقابل تدبیر میں نہیں حاصل ہو سکتی۔ کابینہ کے فرصت یافتہ ارکان دار الامرا میں اقتدار و اختیار کے ساتھ تقریر کرتے ہیں۔ وہ ایسے حکام نہیں ہوتے جنھیں تقریر کا حق دیدیا گیا ہو یعنی (جیسا کہ بعض وقت اشارۃً کہا جاتا ہے) وہ ایسے "محرر" نہیں ہوتے ہیں جو ایوان میں خطبہ پڑھنے کے لئے بلائے جائیں مگر اس میں رائے نہ دیں، بلکہ وہ ان لوگوں کے ہم رتبہ ہوتے ہیں جن کے سامنے وہ تقریر کرتے ہیں وہ جس طرح چاہتے ہیں تقریر کرتے ہیں، اور اپنے حسب دل خواہ جواب دیتے ہیں۔ وہ ایوان سے اس طرح خطاب نہیں کرتے جیسے کوئی ماتحت "دبی آواز" سے باتیں کرتا ہو بلکہ وہ اپنے قطعی رتبہ کی قوت و وقعت کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ مادام الحیات امرا کی وجہ سے انگریزوں کو زیادہ آزادی اور زیادہ گوناگون طور پر اپنے دستور کی اس خصوصیت سے کام لینے کا موقع ہاتھ آجائیگا۔ اس سے انھیں فرصت رکھنے والے قابل لوگوں کے خدمات زیادہ حاصل ہو جائیں گے، یہ دار الامرا کے سیاسی ممبر ہونے کی حیثیت کو ترقی دے دیگا کیونکہ اس سے واعظوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔

غالباً دار العوام کی طرف سے خطرہ یہ ہے کہ اسکی اصلاح زائداز ضرورت بیباکانہ ہوگی، دار الامرا کی طرف سے خطرہ یہ ہے کہ اس کی کبھی اصلاح ہی نہ ہو سکے گی۔ کوئی یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ اسے ایسا ہونا چاہئیے، سختی کے ساتھ برباد کردینے سے تو وہ بالکل محفوظ ہے مگر اندر ہی اندر انحطاط پذیر ہو جانے سے وہ محفوظ نہیں ہے، ممکن ہے کہ جس طرح تاج کا حق امتناع جاتا رہا ہے اسی طرح اسکا حق بھی جاتا رہے۔ اگر اس کے اکثر و بیشتر ارکان اپنے ادائے فرائض کی طرف سے غافل رہیں، اگر اس کے تمام ارکان ایک ہی طبقہ سے ہوتے رہیں اور وہ طبقہ بھی سب سے بہتر طبقہ نہو۔

اگر ایسے صاحب ذہانت اشخاص کے خلاف جو کوئی (امیرانہ) خاندان قائم نہ کر سکیں، اور ایسے قابل لوگوں کے خلاف جن کی آمدنی پانچ ہزار اشرفی سالانہ نہ ہو، اس کے دروازے بند ہیں، تو سال بسال اسکی قوت گھٹتی جائے گی اور آخر میں اسی طرح غائب ہو جائے گی جس طرح شاہی اختیارات غائب ہو گئے ہیں جن کی نسبت کوئی نہیں جانتا کہ کس طرح غائب ہو گئے۔ اسے قتل کا خطرہ نہیں ہے بلکہ تحلیل کا اندیشہ ہے، منسوخی کا خوف نہیں ہے بلکہ انحطاط کا ڈر ہے۔

باب (۵)

دار العوام؏

دار العوام کی معظمہ حیثیت اُس کی کار آمد حیثیت کے مقابلے میں بالکل ہی دوسرے درجے پر ہے۔ وہ "معظم" ضرور ہے اور ایک ایسی حکومت کے اندر جس میں سب سے زیادہ نمایاں حصص اس وجہ سے اچھے ہوں کہ وہ بہت زیادہ شاندار ہیں، ہر ایک نمایاں حصے میں جس کے اچھا بنانے کی خواہش ہے کچھ نہ کچھ شانداری ضرور ہے۔ انسانی "تخیل" حکومت میں بھی بالکل اسی تناسب و موزونیت کا خواہاں ہے جس کا وہ فنون لطیفہ میں جویاں و متلاشی ہے، تخیل انسانی پر ایسے ادارات کا کچھ بھی اثر نہ پڑیگا جو ان ادارات کے ہم پایہ نہ ہوں جن سے وہ خصوصیت کے ساتھ متاثر ہوتا ہے۔ دار العوام کے لیئے ضروری ہے کہ وہ اثر انداز ہو اور حقیقۃً بھی ایسا ہی ہے۔ مگر اس کا فائدہ اس کی ظاہری شکل میں نہیں بلکہ اس کی اصل حقیقت میں ہے۔ اس کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ بنی آدم پر رعب ڈال کر اختیار حاصل کرے بلکہ اس کا کام ہے کہ اپنے اختیار (حاصلہ) سے انسان پر حکمرانی کرنے میں کام لے۔

دار العوام کا خاص کام وہ ہے جسے ہم جانتے اچھی طرح ہیں مگر ہمارے (انگریزوں کی) عام آئینی زبان میں اسے تسلیم نہیں کیا جاتا یعنی دار العوام ایک انتخابی ایوان ہے، یہ ایک ایسی جمعیت ہے جو انگریزوں کے لیئے صدر کا انتخاب کرتی ہے۔ واشنگٹن اور اُس کے ہم طریق مدبروں نے ایک ایسے انتخابی حلقے کی تدبیر نکالی تھی جس کی نسبت یہ توقع تھی کہ وہ قوم کے

؏ میں اس باب کو بہت کچھ اسی طرح طبع کرا دیتا ہوں جس طرح پہلی مرتبہ لکھا گیا تھا، میں دیباچے میں بیان کر چکا ہوں کہ ابھی یہ کہنا بہت قبل از وقت ہے کہ گزشتہ قانون اصلاح (۱۸۶۷ء) سے دار العوام میں کیا تغیرات ہوں گے۔

عاقل ترین اشخاص پر مشتمل ہوگا اور بعد کافی غور و خوض کے اُس شخص کو صدر منتخب کریگا جو قوم میں
سب سے زیادہ عقلمند ہوگا مگر یہ حلقۂ انتخاب محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اسے کسی قسم کی آزادی
حاصل ہے اور نہ اس میں کچھ جان ہے۔ نہ کوئی جانتا ہے اور نہ کسی کو یہ جاننے کی فکر ہے
کہ اُس کے ارکان کون لوگ ہیں۔ وہ کبھی بحث و مباحثہ اور غور و فکر نہیں کرتے، انکا انتخاب
اس لیئے ہوتا ہے کہ وہ یہ رائے دیدیں کہ مسٹر لنکن صدر ہوں، یا مسٹر بر کنبرج وہ حسب دلخواہ
رائے دید یتے اور اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں، مگر انگلستان کا دار العوام ایک حقیقی
انتخاب کنندہ جماعت ہے۔ وہ جن لوگوں کو پسند کرتا ہے اُنھیں انتخاب کرتا ہے، اور
اس کے ساتھ ہی جنھیں وہ چاہتا ہے اُنھیں برطرف بھی کر دیتا ہے۔ اس سے کچھ سروکار
نہیں ہوتا کہ ابھی چند ماہ قبل وہ لارڈ ابرڈین کی تائید کے لیئے منتخب ہوا تھا یا لارڈ پامرسٹن
کی تائید کے لیئے۔ ناگہانی مواقع پر وہ اس مدبر کو نکال باہر کرتا ہے جس کے ساتھ وہ پہلے
وابستہ تھا اور اس سے بالکل مخالف مدبر کو منتخب کر لیتا ہے جسے پہلے اُسنے رد کر دیا تھا۔ اسمیں شک نہیں
کہ اس قسم کے واقعات میں در پردہ رائے عامہ کے تحتی میلان کا اثر ہوتا ہے مگر یہ بھی یقینی ہے کہ اس
قسم کے فیصلے میں ارکان دار العوام کی آزادانہ مرضی کو بھی بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔ دار العوام اس جانب کو
جاتا ہے جسکی نسبت وہ یہ سمجھتا ہے کہ قوم بھی اسکے عقب میں آخر الامر اسی جانب کو آجائیگی۔ مگر اس سے وہ
اپنے کو اس خطرے میں مبتلا کرتا ہے کہ دیکھیے قرعۂ فال کدھر پڑتا ہے، قوم پیروی کرتی ہے
یا نہیں کرتی۔ وہ خود ابتدا کر دیتا اور اپنی صواب دید اور اپنے تغیر خیال پر عمل پیرا
ہو جاتا ہے۔

امریکی قوم جب اپنے رئیس جمہوریہ کا انتخاب کر چکتی ہے تو اس کا وصف اس سے
زائل ہو جاتا اور اس حلقۂ توسطی سے بھی رخصت ہو جاتا ہے جس کے وسیلہ سے یہ انتخاب
عمل میں آتا ہے مگر دار العوام کو چونکہ اختیار انتخاب کے ساتھ ہی اختیار برطرفی بھی حاصل
ہے اس لیئے وزیر اعظم کے ساتھ اُس کے تعلقات مسلسلاً و مستقلاً قائم رہتے ہیں۔
دار العوام اُسے راستہ بتاتا اور اُس راستے میں دار العوام کی پیش روی کرتا ہے رجو
حیثیت دار العوام کی قوم کے مقابلے میں ہے وہی حیثیت وزیر اعظم کی دار العوام کے
مقابلے میں ہے۔ وہ صرف اسی طرف کو جاتا ہے جس کی نسبت اُسے یہ یقین ہوتا ہے
کہ دار العوام بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلا آئیگا مگر پیش روی اُسی کو کرنا پڑتی ہے۔ اس پر لازم ہے

کہ ایک طریق کو پسند کرے اور اُس پر چل نکلے، یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں جھجھک ذرا بھی نہ ہو۔ ایک اچھا گھوڑا سوار کے اشارے کو پسند کرتا ہے، اسی طرح بحث و مباحثہ کی ایک مجلس عظیم اس خیال سے خوش ہوتی ہے کہ وہ ایک قابل شخص کی سربراہی میں ہے۔ کوئی وزیر جو دار العوام کا بندۂ فرمان ہو جائے مبالغے کے ساتھ اُس کی خوشنودی کا طلبگار ہو، اس میں انضباط پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے، اور اُس کی صریحی و بدیہی غلطیوں کو دلیرانہ ظاہر نہ کر دے، ایسے وزیر کا اپنے منصب پر قائم رہنا شاذ و نادر ہو سکتا ہے، پارلیمنٹ کے بڑے بڑے سرگروہوں کے طبائع میں بہت فرق رہا ہے مگر ان سب میں قدر مشترک تھا کہ ان سب میں ایک طرح کی مضبوطی تھی۔ جس طرح زائد از ضرورت مراعات سے ایک چھوٹا بچہ جلد خراب ہو جاتا ہے اسی طرح عظیم الشان جمعیت بھی (اغماض و تساہل سے) غارت ہو جاتی ہے۔ انگریزی سیاسیات کی تمام زندگی ہی یہی ہے کہ وزارت اور پارلیمنٹ کے درمیان تاثر و تاثیر کا عمل جاری رہتا ہے۔ مقررشدہ اشخاص رہنمائی کی سعی کرتے اور تقرر کنندگان ان کی رہنمائی میں بلند و پست ہوتے رہتے ہیں۔

دار العوام کے فرائض میں اس وقت انتخابی فرض سب سے زیادہ اہم فرض ہے، اس فرض پر مصر ہونا اور اس کے لیئے مشقت اُٹھانا نہایت ہی پسندیدہ عمل ہے کیونکہ انگریزی روایات اس سے لاپروائی برت رہی ہیں، پارلیمنٹ کے دور اجلاس کے نصف زمانہ گزر جانے کے بعد آپ اخباروں میں پڑھیں گے بلکہ ان لوگوں سے بھی سنیں گے جنھیں اس معاملے سے زیادہ قرب رہا ہے اور جن کے معلومات زیادہ بہتر ہیں کہ "پارلیمنٹ نے اس دور اجلاس میں کچھ نہیں کیا، ملکہ کی تقریر میں بعض باتوں کا وعدہ کیا گیا تھا مگر وہ بہت ہی معمولی باتیں ہیں اور ان میں سے بھی اکثر منظور نہیں ہوئی ہیں"۔ لارڈ لِنڈہرسٹ کا برسوں یہ دستور رہا ہے کہ وضع قوانین کے چھوٹے چھوٹے نتائج کا شمار کراتے رہتے تھے حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب پہلی وِھگ حکومت قائم ہوئی تھی جس کے پاس توضیع قانون کا کام ہر ایک حکومت سے زیادہ موجود تھا اور اس نے سب سے زیادہ کام کیا بھی"۔ ایک وزیر کی طرف سے لارڈ لِنڈہرسٹ کی سی پُرشور تقریروں کا صحیح جواب صیغۂ متکلم میں ہونا چاہیئے تھا، اسے مضبوطی کے ساتھ یہ کہنا چاہیئے تھا کہ "پارلیمنٹ نے "مجھے" قائم رکھا ہے اور یہ اس کا سب سے بڑا فرض تھا پارلیمنٹ نے یہ کیا ہے کہ جس شے کو ہم روایتی وقعت سے

"ملکہ کی حکومت" کہتے ہیں، اُسے چلاتی رہی ہے، اس نے اس جماعت عاملانہ کو برقرار رکھا ہے جسے وہ دانائی خواہ نادانی سے انگریزی قوم کی بہترین جماعت سمجھی تھی"۔

دارالعوام کا دوسرا فرض وہ ہے جسے میں "اظہاری فرض" کہنا چاہتا ہوں۔ اسکا یہ کام ہے کہ جتنے معاملات اُس کے روبرو پیش ہوں ان سب پر انگریزی قوم کے دلی خیال کا اظہار کردے۔ اس کام کو وہ خوبی کے ساتھ انجام دیتی ہے یا خرابی کے ساتھ، اسکے متعلق میں ابھی آگے چل کر بحث کروں گا۔

پارلیمنٹ کا تیسرا فرض وہ ہے جسے میں "تعلیمی فرض" کہنا چاہتا ہوں (وضاحت کے خیال سے روزمرہ کے معاملات میں بھی اس "اصطلاح" کو قائم رکھا گیا ہے)۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کسی نظم معاشرت میں معتدبہ اشخاص کی ایک جلیل القدر وعلانیہ مجلس شوریٰ قائم کردی جائے اور وہ اس نظم معاشرت میں تغیر نہ پیدا کردے۔ اسے چاہئے کہ بہتری کے لئے تغیر پیدا کرے۔ اسے چاہئے کہ قوم جس بات کو نہیں جانتی وہ اسے سکھائے، دارالعوام کس حد تک ایسی تعلیم دے سکتا ہے اور کس حد تک وہ ایسی تعلیم دیتا ہے، یہ مسائل آئندہ کی بحث کے لئے ہیں۔

چوتھے یہ کہ دارالعوام کا ایک فرض اور ہے، جسے "اطلاعی فرض" کہنا چاہئے، یہ فرض اگرچہ اپنی موجودہ صورت میں بالکل حال کا قائم شدہ ہے مگر ازمنہ وسطیٰ کے فرض سے ایک عجیب مشابہت رکھتا ہے۔ قدیم زمانے میں دارالعوام کا ایک کام یہ بھی تھا کہ ہر قسم کے ظلم وستم سے بادشاہ کو مطلع کرتا رہے۔ وہ بادشاہ کے سامنے خاص خاص مقاصد کی تکالیف وشکایات کو پیش کرتا تھا۔ جب سے پارلیمنٹ کے مباحثوں کی اشاعت ہونے لگی ہے اس وقت سے اُس کے مثل پارلیمنٹ کے لئے ایک کام یہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ان تکالیف وشکایات کو قوم کے سامنے پیش کیا کرے اس لئے کہ وہی الحال صاحب اقتدار اعلیٰ ہے۔ اسوقت قوم کو اس واقفیت کی اتنی ہی ضرورت ہے، جتنی کسی وقت میں بادشاہ کو تھی۔ ایک آزاد قوم فی الواقع نہایت ہی انصاف دوست ہوتی ہے کیونکہ آزادی انسان کو عوض معاوضے کا عادی بنا دیتی ہے اور یہی انصاف کا جوہر اصلی ہے۔ انگریزوں کی قوم انصاف دوست قوم ہے بلکہ ممکن ہے کہ اس کی انصاف دوستی دوسری آزاد قوموں سے بڑھی ہوئی ہو مگر کسی آزاد قوم کا ذکی الحس ہونا نادرات سے ہے اور کم از کم انگریزی قوم کی تو یہ حالت

نہیں ہے۔ اس کی وسعت نظر انھیں چیزوں تک ہے جن سے وہ مانوس ہے، جو خود اُس کے تجربے میں آتی اور اُس کے خیال سے مطابقت رکھتی ہیں۔ متوسط طبقے کے انگریز یہ کہا کرتے ہیں کہ "ہم نے اس قسم کی کوئی بات کبھی اپنی زندگی میں نہیں سنی"، اور ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اس طرح وہ ایک دلیل پیش کر رہے ہیں۔ معمولی بحث کرنے والا اسکے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ کا تجربہ بالکل محدود ہے اور یہ دعوے صحیح ہو سکتا ہے خواہ آپ کو اس قسم کی کسی حالت سے کبھی سابقہ نہ پڑا ہو، مگر پارلیمنٹ کے ایک بڑے مباحثے میں اس احساس کا کچھ ادراک پیدا ہو جاتا ہے۔ کوئی خیال، کوئی عقیدہ، کوئی احساس کوئی تکلیف ہو اگر اُسے اپنی حمایت کے لیئے انگریز ارکان کی ایک معقول تعداد مل جائے تو خواہ اُسے کم و بیش تمام انگریز ایک غلط و مضر رائے سمجھتے ہوں، تو بھی وہ اُس کے امکان و وقوع کے قائل ہو جاتے ہیں، وہ اس رائے کو آئینی حدود کے اندر سمجھنے لگتے اور اُسے ایک قابل لحاظ رائے شمار کرتے ہیں، اور یہ (فی نفسہ) ایک بہت بڑی کامیابی ہے، عملی سیاسیات میں دخل رکھنے والے اشخاص کہتے ہیں کہ ایک مطلق العنان حکومت کی بہ نسبت ایک آزاد حکومت سے معاملت کرنا زیادہ سخت و صعب ہے۔ آپ کو یہ موقع مل سکتا ہے کہ آپ اس مطلق العنان بادشاہ کو دوسری جانب کی حجت کے سننے پر آمادہ کر لیں، اس کے وزرا جو دماغی تربیت یافتہ اشخاص ہوتے ہیں بالیقین ان امور کے جاننے کے خواہاں ہوں گے جو اُن کے مخالف ہوں گے، اور انھیں موقع حاصل ہے کہ وہ ان امور کو بادشاہ کے گوش گزار کر دیں، مگر ایک آزاد قوم اپنے سوا اور کسی جانب کی کوئی بات نہیں سنتی۔ اخبارات صرف اُسی جانب کی باتوں کو دہراتے رہتے ہیں جو اُن کے خریداروں کو پسند ہوتی ہیں، اپنے مفید مطلب دلائل کو عمدہ ترتیب سے شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا جاتا، اُس کی توضیح و تشریح کی جاتی اور مخالف دلائل کو توڑ مروڑ کر غلط بیان کیا جاتا اور خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ گراں گوش منصف بدترین منصف ہے، اسی طرح جس آزاد حکومت کا حکمران طبقہ جس معاملے کو سننا نہ چاہے وہ آزاد حکومت سب سے زیادہ سست رو حکومت ہوگی۔ میرا میلان تو اس طرف ہے کہ اہمیت کے اعتبار سے میں اُسے پارلیمنٹ کے فرائض میں سے دوسرا فرض قرار دوں کہ اس سے ہمیں کس حد تک ان باتوں کے سننے کا موقع ملتا ہے جنھیں ہم کسی اور طرح پر

نہ سنیتے۔

آخری امر وضع قوانین کا فرض ہے، جس کی اہمیت سے انکار کرنا درحقیقت نادانی ہے اور میں تو صرف اس امر کا منکر ہوں کہ اُس کی اہمیت تمام سلطنت کے عاملانہ انتظام یا اس سیاسی تعلیم کے برابر نہیں ہے جو پارلیمنٹ کے ذریعے سے تمام قوم کو حاصل ہوتی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ایسے مواقع بھی ہیں جب وضع قوانین کا کام ان دونوں کاموں سے زیادہ اہم ہو جاتا ہے، ہو سکتا ہے کہ قوانین قوم کی حالت کے مطابق نہ ہوں اور اسے ان میں تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس ہو، ایک قانون غلط تمام حرفتوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور اُس سے نجات حاصل کرنا ہزار انتظامی غلطیوں کا بدل ہو سکتا ہے، مگر عام طور پر قوم کے قوانین اُس کی زندگی کے حسب حال ہوتے ہیں، خاص حالات سے ان کی تطبیق ایک ذیلی کام ہے، نظم ونسق اور قومی زندگی کا چلانا، یہی وہ معاملہ ہے جس کا دباؤ سب سے زیادہ پڑتا ہے۔ بایں ہمہ ہر ایک جلیل القدر قوم کی کتاب قوانین میں ہر سال بہت سے اہم جدید قوانین شامل ہوتے رہتے ہیں، اور انگلستان کی کتاب قوانین میں یہ اندراج اور جگہوں سے زیادہ ہوتا ہے فی الحقیقت اصول قانون کی صحیح اصطلاح میں، اس کا بہت بڑا حصہ قانون ہی نہیں ہے۔ قانون وہ حکم ہے جو کثیر التعداد واقعات پر عائد ہو سکے وہ "مختص قوانین"، جن سے کتاب قوانین بھری پڑی ہے اور جو پارلیمنٹ کی کمیٹیوں کو تھکا دیتے ہیں، ان کا اطلاق صرف ایک ہی واقعے پر ہوتا ہے۔ وہ ایسے قواعد نہیں مدون کرتے جن کے مطابق ریلیں بنتی رہیں گی بلکہ وہ قانون یہ بتاتے ہیں کہ فلاں ریل اس مقام سے اس مقام تک بنے، اور کسی دوسرے معاملے پر اُن کا کوئی اثر نہیں پڑتا، لیکن اس تمام حذف واسقاط کے بعد بھی پارلیمنٹ کے سالانہ قانون کا نتیجہ یہ حاصلہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جیسا اکثر خیال کیا جاتا ہے پارلیمنٹ کے سالانہ اجتماع کا یہی بڑا نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا۔

بعض لوگ شاید یہ خیال کریں گے کہ مجھے دار العوام کا ایک چھٹا فرض یعنی اس کا مالی فرض بھی شمار کرنا چاہیئے تھا، مگر میں یہ خیال نہیں رکھتا ہوں کہ قانونی مصطلحات سے قطع نظر کر کے اُصول کے موافق دوسرے وضع قوانین کے فرائض سے جداگانہ دار العوام کا کوئی خاص فرض مالی معاملات کے متعلق بھی ہے۔ اسے دونوں (معاملات) کا اختیار ہے

اور یہ اختیار کابینہ ہی کی وساطت سے کام میں لایا جا سکتا ہے، مالی وضع قانون ایک ایسا وضع قانون ہے جو ضرورتاً ہر سال پیش آتا رہتا ہے مگر کسی امر کے کثرت وقوع سے اس کے مخالف نوعیت کا اظہار نہیں ہوتا نہ اس سے کوئی مخالفانہ طریق کا رلازم آتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اب اس زمانے میں، مالی معاملات کے متعلق دار العوام کی بڑی تخصیص، اُس کا خاص امتیاز نہیں بلکہ مخصوص دقت ہے، عام معاملات پر ہر ایک رکن جو چاہے تجویز کر سکتا ہے مگر نقد کے معاملے میں ایسا نہیں ہو سکتا، قوم پر محصول لگانے کی تجویز صرف وزیر ہی کر سکتا ہے۔ یہ اصول عام طور سے الٰہیات کے ان مسائل میں ملا دیا جاتا ہے جو ازمنۂ وسطیٰ میں بادشاہ کے امتیاز خاص کے متعلق شائع تھے مگر یہ اصول انیسویں صدی میں بھی ایسا ہی مفید ہے جیسا چودھویں صدی میں تھا اور اُس کی بنا ویسی ہی قطعی اصول پر ہے۔ دار العوام جواب واقعی فرماں روا بن گیا ہے اور وہی اصلی جماعت عاملانہ کا تقرر کرتا ہے، مدتوں سے وہ اس قسم کی روک ٹوک کرنے والا اور اخراجات میں کفایت کو مدنظر رکھنے والا گروہ نہیں رہا ہے جیسا کسی زمانے میں تھا۔ اب وہ خود اُس وقت کے وزرا کی بہ نسبت زیادہ روپیہ خرچ کرنے کی طرف مائل ہے۔ میں نے ایک نہایت ہی تجربہ کار واقف مالیات کو یہ کہتے سنا ہے کہ "اگر تم دار العوام میں تیقن کے ساتھ شور تحسین بلند کرنا چاہتے ہو تو کفایت شعاری پر ایک عام قصیدہ پڑھو اور اگر تم بالیقین شکست اُٹھانا چاہتے ہو تو کسی مختص بچت کی تجویز پیش کر دو"، اس کی توجیہ بالکل آسان ہے۔ سرکاری روپے کے ہر ایک صرف کا کوئی نہ کوئی ظاہری عام مقصد ہوتا ہے جو لوگ روپیہ خرچ کرنا چاہتے ہیں وہ اس مقصد کو بڑھا چڑھا کر دکھاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "اس عظیم الشان ملک کے لیے پچاس ہزار پاؤنڈ کیا چیز ہے کیا یہی وقت خسیسانہ اعتراض کا ہے۔ ہماری تجارت کبھی اس سے زیادہ منفعت بخش نہیں رہی ہے، ہمارے وسائل کبھی ایسے وسیع نہیں رہے ہیں، اس جلیل القدر قومی مقصد کے مقابلے میں پچاس ہزار پاؤنڈ کیا چیز ہیں"۔ جو ارکان خرچ کے طرفدار ہوتے ہیں وہ ضرور ہی ایوان میں آتے ہیں، شاید کسی رائے دہندہ یا کسی دوست نے جسے اس مصرف سے نفع پہنچ جائے یا جسے اس مقصد پر خاص توجہ ہو، ان سے حاضری کے لیے خواہش کی ہو گر کم از کم

اتنا تو ضرور ہے کہ ایک عام پسند جانب رائے دینا ہے جس پر اخبارات کا اُنکی مدح سرائی کرنا یقینی ہے، کیونکہ یہ اخبارات ہمیشہ محب بنی نوع انسان ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ باتیں بھی کرتے ہیں۔ جو ارکان اخراجات کے خلاف ہوتے ہیں وہ از خود بہت بہت کم آتے ہیں، وہ بے ضرورت غیر ہر دل عزیز کیوں بنیں، وہ مقصد ایک معلوم مقصد ہوتا ہے، اس مقصد کے بہت سے حامی، واقعی صدق دل سے ایسا ہی چاہتے ہیں، مخالفانہ رائے دینے سے بہت سے لوگ دشمن ہو جائیں گے اور اخبارات ان پر نفرین کریں گے۔ اگر کوئی روک نہ ہو تو قوم کا یہ ایوان بہت جلد قوم کے روپے کا وارا نیارا کر دے۔

وہ روک یہی ہے کہ قومی مالیات کے لیئے کابینہ پر ذمہ داری عائد ہے۔ اگر ہر شخص محصول عائد کرنے کی تجویز کر سکتا تو وزرا ایوان کو آزاد چھوڑ دیتے کہ وہ جس طرح چاہے اس محصول کو خرچ کرے اور خود ہاتھ جھاڑ کر الگ ہو جاتے مگر صورت حال یہ ہے کہ جو کچھ اخراجات بھی منظور ہوتے ہیں تا آنکہ جب وہ وزارت کے منشا کے خلاف بھی منظور ہوتے ہیں، ہر حال میں وزارت ہی کو روپیہ مہیا کرنا پڑتا ہے۔ لامحالہ وہ مزید اخراجات کی مخالفت کرنے میں وہ سب سے زیادہ زور دکھاتے ہیں، اس کا مطالبہ انھیں کو ادا کرنا ہوگا، انھیں کو محصول لگانا پڑے گا جو بالضرور ناگوار خاطر ہوتا ہے یا قرض لینے کی تجویز کریں گے جو معمولی حالات میں باعث شرم ہے۔ (کہنا یہ چاہیئے کہ) وزرا سیاسی خاندان کے لیئے بمنزلہ کمانے والے فرد کے ہیں اور خیری و نمائش کے مصارف اُنہیں بالکل اُسی طرح برداشت کرنا پڑتے ہیں جیسے بزرگ خاندان کو اپنی بیوی کی اور اپنی لڑکیوں کے سامان سنگھار کی قیمت پوری کرنا پڑتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی کابینہ تنہا و یکہ جماعت عاملانہ بنادی جاتی ہے تو اس سے از خود یہ بات پیدا ہو جاتی ہے کہ مالی نگرانی بھی کلیتہً اُسی کے ہاتھ میں ہو کیونکہ تمام کاموں میں روپے کا صرف ہوتا ہے، تمام حکمت عملیوں کا انحصار روپے پر ہوتا ہے اور جماعت عاملانہ جس کام میں مشتغل ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ افعال و تدابیر کی باہمی خوبی میں ہمواری پیدا کرے۔

ان فرائض پر نظر کرنے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دار العوام انگریزوں پر حکمرانی کرتا ہے،

اور حقیقت یہ ہے کہ انگریز اس طرح کی حکمرانی کے اس درجہ عادی ہو گئے ہیں کہ اسمیں مطلق کوئی ندرت نہیں معلوم ہوتی، مگر حکومت کے تمام عجیب و غریب انواع و اقسام میں سب سے زیادہ شکل "جلسہ عام" کی حکومت کی ہے۔ یہاں ۶۵۸ اشخاص* ہوتے ہیں جو انگلستان کے تمام اطراف و جوانب سے جمع کیئے جاتے ہیں جن کے شمائل و خصائل، جن کے اغراض و مقاصد، جن کی صورت شکل، جن کی زبان میں، باہمی مغائرت پائی جاتی ہے۔ اگر ہم یہ خیال رکھیں کہ انگریزی شہنشاہی کیسی شہنشاہی ہے، اسکے اجزائے ترکیبی کس قدر گوناگوں ہیں، اس کے تعلقات و روابط کس درجہ غیر منقطع ہیں، اسکی حکمت عملی تاریخ میں کس قدر دور رس ہے اگر ہم یہ خیال رکھیں کہ ایسی شہنشاہی کے حکمرانوں میں، کتنے وسیع معلومات، کیسی نازک فہم و فراست، کیسی مستقل مزاجی کی ضرورت ہے، تو پھر ان لوگوں کو دیکھ کر ہمیں حیرت ہوگی۔ ہم مختلف الحالات اشخاص کی ایک تغیر پذیر جماعت کو دیکھیں گے جس میں کبھی تھوڑے آدمی ہوتے ہیں، کبھی زیادہ، مگر کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ ایک گھنٹے کے لیئے بھی اُن کی تعداد برابر رہے۔ کسی کسی وقت یہ لوگ ذرا جوش میں آجاتے ہیں مگر زیادہ تر سست اور تھکے ہوئے سے رہتے ہیں، اظہار فصیح البیانی کیلیئے بے صبر ہوتے اور خوش دلی کے لیئے کوئی سا مذاق بھی ہو اُس سے چوکتے نہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو شہنشاہی برطانیہ پر حکمرانی کرتے ہیں، یہی انگلستان پر، یہی اسکاٹلینڈ پر، یہی ایک بڑی حد تک ایشیا پر، یہی ایک بڑی حد تک پالنشیا پر اور یہی امریکہ کے ایک بہت بڑے حصے پر، یہی دوسرے مقامات کے منتشر اجزا پر حکمرانی کرتے ہیں۔

پیلی نے بہت سی چبھتی ہوئی باتیں کہیں مگر اُس نے اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہی کہ کسی دشواری کا لوگوں کے ذہن نشین کرنا اسطرح کہ اُس کے تمام تشریحات و توضیحات اُن کے ذہن میں جادیں جائیں بہت ہی سخت کام ہے۔ اکثر بحث شدہ اور غیر منفصل سوالات کے مشکلات کی کلید عام طور پر اُنکے غیر بحث شدہ اجزا میں ہوتی ہے، یہ اجزا تصویر کے پس منظر سے مشابہت رکھتے ہیں جو صاف و آسان نظر آتی ہے اور بعینہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص ایسا نقش بنا سکتا تھا مگر حقیقت میں یہی نقش وہ شے ہے جو تصویر کو اسکی

* ۱۹۲۴ء میں ۷۰۷۔

صحیح جگہ پر قائم کرنا، اُس کے نقائص کو دفع کرتا ہے اور وہ تصویر جیسی کچھ بھی ہو اُس سے بنتی ہے۔ جو شخص بھی پالیمینٹی حکومت کی نسبت یہ گمان رکھتا ہو کہ وہ ایک آسان و طبعی شے ہے اور اُس کے لیئے کسی توضیح و تشریح کی ضرورت نہیں ہے، وہ اس حکومت کو نہیں سمجھ سکتا۔ جب تک آپ کو یہ نہ معلوم ہو کہ ایک "کلب" کے ذریعے سے حکومت کرنا عجائبات حاضرہ میں سے ایک عجیب شے ہے، اس وقت تک اس معاملے کی بنیادی اولین کا تصور آپ کے ذہن میں نہ پیدا ہوگا۔

حال ہی میں ایک نمایاں مثال اس امر کی مل چکی ہے کہ دفعۃً جب کسی ضرورت سے انگریزوں کو جمع کیا گیا ہے تو یہ معززین کیسے بے دست و پا ثابت ہوئے ہیں حکومت نے صحیح یا غلط طور پر یہ مناسب سمجھا کہ وبائے مویشی کے انسداد کا کام ہر صوبے کی صوبہ داری مجلس کو تفویض کیا جائے مگر اکثر "ایوان ہائے صوبجات" میں جو منظر پیش ہوا وہ نا قابل اطمینان پایا گیا صحیح فیصلہ تو کجا "کسی نتیجے سے فیصلے تک پہنچنے میں بھی نہایت دشواری پیش آئی۔ ایک اجلاس کو میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ اسمیں ایسا ہی ہوا، ہر مجلس نے ایک بہت ہی پیچیدہ تحریک پیش کی جسمیں بہت سی باتیں ایسی تھیں جسے ہر شخص پسند کرتا تھا، اور بہت سی باتیں ایسی تھیں جنھیں ہر شخص ناپسند کرتا تھا، اگرچہ یہ بھی ضرور تھا کہ کہیں کہیں تحریک کا کوئی حصہ کچھ لوگوں کے پسند خاطر تھا اور وہی حصہ دوسروں کے نزدیک قابل اعتراض تھا، یہ تحریک اجلاس کی اُدھیڑبن میں پھنسکر رہگئی، ہر شخص نے ترمیمیں تجویز کردیں، ایک ترمیم منظور ہوئی مگر اس سے کوئی بھی مطمئن نہیں ہوا اور اسطرح معاملہ وہیں کا وہیں رہگیا۔ انگلستان میں یہ مقولہ زبان زد ہے کہ "کسی بڑے جلسے میں کبھی کوئی کام نہیں ہوتا"، اور پھر بااینہمہ انگریزوں پر دار العوام یعنی ایک "بڑا مجمع" ہی حکمرانی کرتا ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ دار العوام حکمرانی نہیں کرتا، بلکہ وہ صرف حکمرانوں کا انتخاب کرتا ہے، مگر ایسا کرنے کے لیئے اس میں کسی نہ کسی خاص بات کا ہونا ضرور ہے، فرض کیجیے کہ کابینہ کا انتخاب لندن کی کسی بزمگاہ کی طرف سے ہوتا، تو وہاں کیسی کچھ ابتری نہ برپا ہوتی، کتنے کچھ سوال جواب نہ ہوتے، ہر طرف سے یہی آواز آتی کہ آپ فلاں فلاں شخص سے گفتگو کریں اور اُن سے یہ خواہش کریں کہ میرے نمایندے کے لیئے رائے دیں، - زید کی بیوی اور عمر کی بیوی بکر کی بیوی کو حیرانی میں ڈالنے کی کیا کچھ سازشیں نہ کرتیں، اس بزمگاہ کا انتخاب ملکۂ معظمہ کے زیر سایہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، اس کا کچھ بھی اثر نہ پڑتا، انتخاب اگر فی الواقع ارکان بزمگاہ کے

اختیار میں ہوتا تو ہماہمی اور سازشوں کا ہونا ضروری تھا۔ میں اس مضمون کے آغاز میں یہ سوال نہیں کرتا کہ کیوں دارالعوام خول کے ساتھ حکومت کرتا ہے بلکہ یہ بنیادی سوال کرنا چاہتا ہوں جو غالباً کبھی بھی نہیں ہوا ہے کہ دارالعوام اس قابل ہی کیسے ہو جاتا ہے کہ حکمرانی کرسکے؟

دارالعوام وہ کام کرسکتا ہے جسے صوبہ واری مجالس یا بزمگاہ انجام نہیں دیسکتے کیونکہ یہ ایک منظم جماعت ہے اور صوبہ داری مجالس اور بزمگاہ غیر منظم جماعتیں ہیں۔ انگلستان کے بہت بڑے خطیبوں میں سے دو خطیب، لارڈ بروم اور لارڈ بولنگبروک نے فریقانہ حکومت پر اعتراضات کرنے میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے ہیں پولنگبروک غالباً یہ جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے، وہ دارالعوام کی طاقت کا مستقل مخالف تھا، وہ اسپر ایک کاری حملہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن لارڈ بروم یہ کچھ نہیں جانتا، وہ پارلیمنٹی حکومت میں اسطرح ترمیم کرنا چاہتا ہے کہ جن عناصر کی وجہ سے پارلیمنٹی حکومت ممکن ہے انھیں عناصر کو ساقط کردیا جائے۔ اس وقت پارلیمنٹ کا حصۂ کثیر چند سرگروہوں کی اطاعت کرتا ہے، یہ سرگروہ جس امر کی تجویز کرتے ہیں اُن کی وہ تائید کرتا ہے، جسے یہ سرگروہ مسترد کردیتے ہیں اسے وہ بھی مسترد کرتا ہے، ایک پرانا معتمد خزانہ کہا کرتا تھا کہ یہ ایک ناقص و ناقابل حمایت معاملہ ہے، ہمیں اس مسئلے پر اپنی "اکثریت" کو کام میں لانا چاہیئے"۔ یہ معتمد پچاس برس پہلے تھا، جب قانون اصلاح منظور نہیں ہوا تھا جب "اکثریت" بہت ہی آنکھ بند کرکے تقلید کرتی اور وہ بہت کچھ اس حالت میں تھی کہ اُسے جدھر چاہتے لگا دیتے۔ اب اس زمانے میں اپنے پیرووں پر سرگروہوں کا اختیار قطعیت و دانشمندی کے ساتھ محدود کردیا گیا ہے۔ وہ اپنے پیرووں کو اپنے پیچھے چلا سکتے ہیں مگر تھوڑی دور تک اور وہ بھی چند معینہ اطراف میں تاہم تابع و متبوع کا وجود برقرار ہے۔ ایوان کے کنسرویٹو جانب میں اب بھی خودسرانہ سرگروہی کے آثار موجود ہیں، ایک دل مردہ مدبر کی بنسبت کہا جاتا ہے کہ اس نے صوبوں کے تازہ دم اور معزز ارکان کی لمبی قطار پر نظر ڈال کر کہا کہ "واللہ مارے دینے کے لیئے اتنے زیادہ نفیس حیوان یورپ بھر میں کہیں نہ ملیں گے"۔ مگر اس تمام طنز واستہزا سے قطع نظر کرکے پارلیمنٹ کا اصول یہی ہے کہ سرگروہوں کی اطاعت کی جائے۔ آپ چاہے اپنے سرگروہ کو بدل دیں، ایک کے بجائے دوسرے کو سرگروہ بنالیں، مگر جب تک آپ نمبر ایک کی خدمت

میں ہیں ان کی اطاعت کیجئے اور جب آپ دوسرے کی طرف چلے جائیں تو اُسکی اطاعت کیجئے۔ ایسا نہ کرنے کی پاداش یہ ہوگی کہ آپ بے مصرف محض ہو جائیں گے۔ یہ نہیں ہے کہ آپ کوئی اچھا کام نہ کرسکیں گے بلکہ مطلقًا کسی کام کے کرنے ہی کے قابل نہ رہیں گے، اگر ہر شخص جس امر کو صحیح سمجھے اُسی پر عمل کرنے لگے تو پھر ہر تحریک کے لیئے ۶۵۷ ترمیمیں پیش ہو جائیں گی اور نہ ان ترمیموں میں سے کوئی ترمیم منظور ہوگی اور نہ خود تحریک ہی منظور ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ جس وقت ہم صاف طور پر یہ تصور اپنے ذہن میں قائم کر لیتے ہیں کہ دارالعوام کی سب سے بڑی تخصیص اور سب سے بالاتر حیثیت یہی ہے کہ وہ ایک انتخاب کنندہ جماعت ہے تو پھر معًا ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ "فریق" اس کا جوہر خاص ہے۔ کبھی کوئی انتخاب بغیر فرقہ بندیوں کے نہیں ہوا ہے۔ بغیر اجتماع اور جتھہ بندی کے آپ ایک بچے کو بھی صحت گاہ میں نہیں بھیج سکتے۔ ایسے موقعوں پر آپ یہ دیکھیں گے کہ ایک تختے پر تو یہ لکھا ہوا ہے "یتیم (الف) کے لیئے رائے دو"۔ دوسری طرف ایک جھنڈے پر یہ منقوش ہوگا کہ "یتیم (ب) کے لیئے رائے دو (جو خاطر العقل بھی ہے)" اور ہر ایک فریق اپنے تختے اور جھنڈے کے لیئے سرگرم سعی ہوگا۔ جو امر ایسے خفیف و وقتی انتخابات کے لیئے صحیح ہے وہی حکمرانوں کے ایک جلیل القدر و مستقل انتخاب کے لیئے بدرجہا زیادہ صحیح ہوگا۔ دارالعوام ایسی حالت میں وقت گزارتا ہے جس میں انتخاب کا امکان ہمہ وقت قائم رہتا ہے۔ ہر وقت یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک حکمران کو با اختیار کر لے اور دوسرے کو برطرف کر دے، اس لیئے فرقہ بندی اس کا جزو لاینفک اور اُس کے دم کے ساتھ ہے۔

دوسرے یہ کہ فریقوں کے سرگروہوں کو رشوت دینے کے لیئے اگرچہ گزشتہ صدی کی سی وسیع سرپرستی نہیں حاصل ہے مگر وہ ایسی دھمکی دے سکتے ہیں جو تمام ترغیبات سے زیادہ موثر ہے یعنی وہ ایوان کو منتشر کر سکتے ہیں، یہی وہ راز ہے جو فریقوں کو متحد کیئے رہتا ہے، مسٹر کابڈن نے بہت ہی صحیح کہا ہے کہ "ہمیں کبھی اس امر کے پتا چلانے کا موقع نہ ملا کہ ارکان پارلیمنٹ کی منشا کے موافق،

ایوان کے منتشر کرنے کا موزوں وقت کونسا ہے" انھوں نے ارکان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ایک اس امر کو چھوڑ کر اور ہر امر کے لیئے وہ رائے دینے کو تیار ہیں، مگر انھوں نے کبھی یہ کہتے نہیں سنا کہ وہ اختتام پارلیمنٹ کے لیئے رائے دینے کو تیار ہیں"۔ کسی جمعیت کی خوبی کار کے لیئے مستقل ایوان کی ایک مستحکم کثرت کی ضرورت ہے، اور یہ کثرت اس طرح "جمع کی جاتی ہے"، کہ بعض خاص اشخاص کے ساتھ معتقدانہ تعلق ہو جاتا ہے یا جن اصولوں کی نمایندگی کرتے ہیں ان پر اعتقاد ہو جاتا ہے، اور ان لوگوں کے خوف سے یہ کثرت قائم رکھی جاتی ہے، "خوف یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ ان کے خلاف رائے دیں گے تو پھر بہت جلد آپ کا حق رائے ہی سلب ہو جائیگا۔

تیسرے یہ کہ اس کہنے کے بعد ہی کہ فریقانہ انتظام نیابتی حکومت کا اہم اصول ہے، پھر یہ کہنا کہ یہ انتظام اس وجہ سے دائماً کارآمد ہوتا ہے کہ اس میں سرگرم جانبدار شامل نہیں ہوتے بالکل ہی عجیب معلوم ہوتا ہے۔ یہ کہنا ایسا ہی ہے کہ کل جسم قوی و پرزور ہے مگر اس کے اجزائے سالمہ، سست و مضمحل ہیں اگر اس کے برعکس ہوتا تو پارلیمنٹی حکومت تمام حکومتوں سے بدترین حکومت ہو جاتی، وہ ایک فریقانہ حکومت بن جاتی"۔ جو فریق برسر اقتدار ہوتا وہ ان تمام مدارج کو طے کر ڈالتا جو اسکے خطیب تجویز کرتے، ان کے اصول میں جتنی باتیں مسلمہ ہوتیں، اُن کی زبان سے کسی وقت بھی جو کچھ نکلا ہوتا، وہ سب عمل میں آجاتا، مگر انگریزی پارلیمنٹ کے شرکاء اس طبیعت کے لوگ نہیں ہیں، وہ وھگ، ریڈیکل، ٹوری، جو چاہیں ہوں مگر ان سب سے بڑھ کر وہ کچھ اور بھی ہیں یعنی وہ معمولی انگریز ہیں اور (جیسا کہ پادری نیومین کو شکایت ہے) "ان کو بزور تحکم کسی اعتقادی سطح پر لانا، بہت دشوار ہے"۔ وہ اس امر کے شائق نہیں ہیں کہ اپنے فریق کے مسلمات کو ان کی انتہائی حد تک پہنچانے پر زور دیں۔ برخلاف ازیں، ان کی سربراہی کرنے کا بہترین مسلمہ طریقہ یہ ہے کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ سوچ سمجھ کر اور استدلالی نتائج کے درپے نہ ہو کر معتدل صورت اختیار کی گئی ہے۔ آپ لوگوں کو یہ کہتے سنیں گے کہ "اگرچہ میں اس امر کو تسلیم کر سکتا ہوں کہ بریڈ فرڈ کے معزز رکن نے بہت ہی قوی دلائل اس بارے میں پیش کیے ہیں کہ ۳ اور ۳ ملکر

پانچ ہوتے ہیں مگر اس سے میں اپنے کو اس مسلمہ کے تسلیم کرنے کا پابند نہیں بناتا میں سمجھتا ہوں کہ بہ اجازت مجلس میں یہ فرض کر سکتا ہوں کہ ۳ + ۲ سے ۵ نہیں ہوتے، پس یہ بہت کافی بنیاد ان تجاویز کے لیے ہے جو میں اس موقع پر پیش کرنے کی جرأت کروں گا،، ۔ دارالعوام کے بہت بڑے حصے کے لیے یہ زبان بہت ہی موزوں ہے بیشتر کاروباری اشخاص شفق کی سی ہلکی روشنی کو پسند کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی ظلمیات و تشکیات کی حالت میں بسر کی ہے، جہاں کوئی بات بھی بہت صاف نہیں ہوتی، جہاں اکثر امور کے لیے کم و بیش مواقع موجود ہوتے ہیں، جہاں مختلف طریقوں کے حق میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور جہاں ان تمام امور کے باوجود یہ لازمی ہے کہ عزم کے ساتھ ایک طریقے کو اختیار کر لیا اور اس پر استقلال کے ساتھ قائم رہا جائے۔ وہ ایسے ہی دلائل سننا چاہتے ہیں جو اس قسم کے ذہنی دھندلکے کے حسب حال ہوں، جو دلیل انھیں پسند آجاتی ہے اُسے اظہار نالیاقتی کا باعث سمجھ کر بیان کرنے میں کسی قسم کے پس و پیش ہونے کے بجائے، وہ اُسے "عملیت" کی ایک علامت سمجھتے ہیں۔ وہ خود ایسے ہی معاملتوں سے دانشمند بن چکے ہیں، جن کے استدلال وجوہ کو وہ بیان نہیں کر سکتے تھے، اور وہ جو کچھ چاہتے ہیں وہ ایک واضح مگر پر از اعتدال نتیجہ ہے جس کی بوقت حاجت تکرار ہو سکے، یہ کوئی ایسی شے ہونا چاہیئے جسے وہ استدلال مجرد نہ سمجھیں،، مگر اس استدلال مجرد کو عملی زندگی کے اندر محلول و ممزوج کر دیا گیا ہو۔ ایک بے صبر نوجوان نے ایک مرتبہ یہ کہا تھا کہ "میرے خیال میں تو پیل کے دلائل میں کچھ بھی قیام و ثبات نہیں ہے،، اور یہی وجہ تھی کہ سر رابرٹ پیل، اس زمانے کے ارکان دارالعوام کا بہترین سر گروہ تھا، ہم یہ چاہتے ہیں کہ استدلال سے قید و بند کی سختی کو نکال دیا جائے اور صرف اس کا حصل باقی رہے۔

درحقیقت انگریزی طرز حکومت کے تحت میں اکثر و بیشتر سرکردگان دارالعوام خود بھی اپنی فریقانہ رایوں کو حد سے آگے بڑھانے کے شائق نہیں ہیں۔ ان کو واقعیت کے ساتھ سابقہ پڑا ہے۔ اقتدار حاصل کرنے کے بعد فریق مخالف اکثر اس سٹہ کرنے والے سوداگر کے مانند ہوتا ہے جس کے مطالبات واجب الادا ہو چکے ہیں۔ وزرا پر اپنے وعدوں کا پورا کرنا ضروری ہوتا ہے اور ایسا کرنے میں اُنھیں مشکلات کا

سامنا ہوتا ہے - وہ یہ کہہ چکے ہیں کہ بصورت معاملات ایسی اور ایسی ہے اگر آپ
ہمیں بر سر اقتدار کر دیں گے تو ہم ایسا اور ایسا کریں گے مگر جب سرکاری کاغذات
ان کے ہاتھ میں آتے ہیں اور وہ اپنے مستقل مددگار سے گفتگو کرتے ہیں (جو
ناخوشگوار واقعات کا عادی، انداز و اطوار میں نہایت ہی مودّب مگر
اپنی رائے کا نہایت ہی سخت ہوتا ہے) تو پھر بہت جلد شکوک و شبہات دل میں
جگہ کر لیتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے سٹہ کرنے والا سوداگر اپنے
مطالبات کو قبول نہیں سکتا، سابق کا فریق مخالف بر سر حکومت ہو کر ان فقروں کو
فراموش نہیں کر سکتا جنھیں ملک کے خوفناک طرح سر ابد ستور دہراتے رہتے ہیں۔
مگر جس طرح کہ سوداگر اپنے قرضدار سے یہ پوچھ سکتا ہے کہ "آیا آپ چار مہینے کیلئے
ایک ہنڈی قبول نہیں کر سکتے ؟" بالکل اسی طرح وزیر اپنے مستقل نائب سے یہ
کہتا ہے کہ "آیا تم کوئی درمیانی راستہ نہیں نکال سکتے، یہ ضرور ہے کہ میں محض ان
فقروں کا پابند نہیں ہوں جو مباحثے میں کیے گئے ہوں، مجھ پر یہ الزام نہیں
لگایا گیا ہے کہ مجھے وضعداری نباہنے کا ادعا ہے مگر" وغیرہ وغیرہ، اور نتیجہ ہمیشہ یہ
ہوتا ہے کہ ایسی درمیانی روش نکالی جاتی ہے جسے تا حد امکان اس روش کے
مشابہ دکھایا جاتا ہے جس کا خیال فریق مخالف ہونے کے زمانے میں ظاہر کیا گیا
تھا مگر اس درمیانی روش کی حد امکان اسی حد تک ہوتی ہے جو مسلمہ واقعات
کے حسب اقتضا عمل میں آسکے، یہ واقعات و فرامین بر قرار اور ہمیشہ نہایت
تکلیف دہ بنے رہتے ہیں۔

کسی فریق پر اعتدال کو لازم گردانے کے تمام طریقوں میں بہترین طریقہ یہ ہے
کہ کوئی ایسی تدبیر نکالی جائے کہ اس فریق کے ارکان فی الواقع اعتدال پسند بافکر اور
کم و بیش محتنب سے ہو جائیں، اور دوسری بہترین تجویز یہ ہے کہ وہ سرگروہ جنھوں نے
اس کی جانب سے سب سے زیادہ اعتراضات کیئے ہیں اُنھیں دنیا کے واقعی
معاملات سے گہرا واسطہ پڑ جائے - انگریزی طریق میں یہ دونوں تدبیریں موجود ہیں،
اس تدبیر نے فریقیانہ حکومت کو ہی واحد طریقے سے دائمی و ممکن بنا دیا جس طریقے
کے بغیر کوئی اور صورت اُس کے قیام و اتفاقی نہیں ہو سکتی - وہ طریقہ یہی ہے کہ اسے

نرم کر دیا ہے۔

مگر یہ تدبیریں اگرچہ ان نقائص کو کافی طور پر رفع کر دیتی ہیں، جن سے ایک عام بزمگاہ یا مجلس صوبہ بیکار ہو جاتی ہیں مگر وہ دار العوام کو اس قابل نہیں بناتیں کہ وہ انگلستان پر حکمرانی کر سکے۔ نیابتی جلسۂ عام میں ایک نقص ایسا ہے جو دوسرے جلسہ ہائے عام کے نقائص سے بہت بڑھا ہوا ہے، یعنی ممکن ہے کہ وہ آزاد نہ ہو۔ ممکن ہے کہ رائے دینے والے اسے اُس کی رائے پر چلنے نہ دیں اور اگر وہ ایسا کریں تو فریقانہ انتظام کی خرابیوں کے متعلق جتنی روک ٹوک شمار میں آئی ہے سب بیکار ہو جائے۔ حلقۂ انتخاب کا احساس، ایک حاوی فریق کا احساس ہے، اور اس احساس کو مقامی سیاسی گماشتے اُبھارتے اور برانگیختہ کرتے ہیں بلکہ کبھی کبھی بناتے بھی ہیں، اس قسم کی رائے معتدل نہیں ہو سکتی، موثر بحث کے زیر اثر نہیں آ سکتی جن واقعات کا دباؤ پڑ رہا ہے اُنسے اس کا گھر الگاؤ نہیں ہو سکتا، وہ قریبی ذمہ داری کے اصلاح کرنیوالے اثر کے زیر سایہ نہیں قائم ہو سکتی، یہ اس طریق پر نہیں قائم ہو سکتی جس طریق پر وہ لوگ رائے قائم کرتے ہیں جنہیں اس رائے پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ حلقہ جات انتخاب کی حکومت پارلیمنٹی حکومت سے بالکلیہ متباین ہے، یہ حکومت بجائے اس کے کہ ان اعتدال پسند اشخاص کی حکومت ہو جو عمل کی جائے وقوع سے قرب رکھتے ہوں، ایسے غیر معتدل لوگوں کی حکومت ہے جو جائے وقوع سے بہت دور ہوتے ہیں، یہ ان لوگوں کا فیصلہ نہیں ہے جن پر فیصلہ کرتے وقت اپنی برطرفی کا خوف طاری رہتا ہے اور جو ہمیشہ یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ اُن کے فیصلے کا مرافعہ ہو سکتا ہے بلکہ یہ ان لوگوں کا فیصلہ ہے جو اپنے کنج تنہائی میں بیٹھے ہوئے ہیں اور جنھیں کسی پاداش کا خوف نہیں ہے۔

اکثر اشخاص پارلیمنٹی حکومت کے ان شرائط کو جب پڑھیں گے تو وہ انھیں تسلیم کر لیں گے لیکن عوام کے دلوں میں جو خیالات جاگزیں ہیں انمیں کم از کم دو نہایت ہی اہم خیال ان شرائط کے منافی ہیں۔ عامۃ الناس کے بے اصول سرگروہوں کے دلائل جس تجویز کی جانب صاف طور پر مائل ہیں اور جس تجویز کو بعض

نہایت سربرآوردہ فلسفیوں نے اپنی نظر کرم کا مورد الطاف بنالیا ہے۔ یہ دونوں تجویزیں اسی قسم کی ہیں۔ یہ دونوں تجویزیں نہ صرف پارلیمینٹی حکومت کو خراب کردیں گی بلکہ وہ انھیں مطلقاً کام سے روک دیں گی۔ چونکہ وہ اس کام کو بالکل ہی ناممکن کردینگی اس لیئے یہ سوال ہی نہیں باقی رہتا کہ وہ اچھا کام کریں گی یا بُرا۔

ان میں سے پہلی تجویز تو حد سے بڑھی ہوئی عمومی تجویز ہے۔ اس نظریے کا مطالبہ یہ ہے کہ انتخاب پارلیمنٹ میں اکیس برس کی عمر کے ہر شخص کو (اگر عورت کو نہیں تو ہر مرد کو ضرور ہی)، مساوی حق حاصل ہو۔ فرض کیجئے سال گذشتہ انگلستان میں ایک کروڑ بیس لاکھ بالغ مرد تھے۔ اس نظریے کے مطابق ہر شخص کو پارلیمنٹ کے انتخاب میں ایک کروڑ بیس لاکھ میں سے ایک حصہ ملیگا۔ صریحی قانون کے ذریعے سے دولتمند و ذی عقل اشخاص کو غریب اور بدعقل اشخاص کے مقابلے میں زاید رائیں نہیں حاصل ہونگی، اور کوئی ایسی پوشیدہ تدبیر بھی نہیں ہے کہ ان کا اثر مزید رایوں کے مساوی ہوجائے۔ اس قسم کی تجویز کو عمل میں لانے کی کل بہت سہل العمل ہے۔ ہر مردم شماری کے موقع پر ملک کو ۶۵۸، انتخابی اضلاع میں اس طرح تقسیم کردیا جائے کہ ہر ایک ضلع میں بالغ مردوں کی تعداد برابر ہو، اور صرف یہی اضلاع حلقہ ہائے انتخاب ہوں، اور یہی کل پارلیمنٹ کا انتخاب کریں۔ لیکن اگر پارلیمینٹی حکومت کے لیئے شرائط مذکورہ بالا لازمی ہوں تو اس قسم کی پارلیمنٹ کوئی کام نہ کرے گی۔

اس قسم کی پارلیمنٹ اعتدال پسند اشخاص پر مشتمل نہیں ہوسکتی۔ بعض انتخابی اضلاع خالص زرعی مقامات میں ہوں گے اور ان اضلاع میں دیہات کے پادری اور زمیندار کو تقریباً غیر محدود اختیار حاصل ہوگا۔ انھیں یہ موقع حاصل ہوگا کہ وہ رائے دینے کے لیئے مزدوری پیشہ اشخاص کی ایک پوری آبادی کو بہکا لے جائیں۔ یہ اضلاع زمینداروں کی ایک حکمران جماعت کا انتخاب کردیں گے جس میں کسی دوسرے فریق کا میل نہ ہوگا۔ وہ چھوٹے چھوٹے متفرق حصے جو اس وقت اتنے بہت سے پارلیمنٹی ارکان کا انتخاب کرتے ہیں وہ مزدوروں کے اس اژدہام میں غائب ہوجائیں گے ان کی رایوں سے پارلیمنٹ میں مخصوص ارکان نہ جائیں گے۔ انگلستان کا زرعی حصہ اپنے نمایندوں کو خالصۃً مجالس صوبہ کے ارکان سے منتخب کریگا۔ دوسری طرف

حلقہ ہائے انتخاب کا ایک بڑا حصہ قصبات پر مشتمل ہوگا اور یہ حلقے ایسے لوگوں کا
انتخاب کریں گے جو قصبات کے ادنیٰ ترین طبقوں کے اعتقادات یا عدم اعتقادات
کی نمایندگی کریں گے۔ شاید ایسا بھی ہو کہ قصبات کے یہ ارکان دو حصوں میں
منقسم ہو جائیں، ایک حصہ تو کاریگروں کے اصلی و واقعی نمایندوں کا ہو (یہ ضرور
نہیں کہ یہ کاریگر اپنی صنف میں بہترین افراد سے ہوں (جو ایک منتخب و ذہین گروہ ہے)
بلکہ یہ لوگ کام کرنے والوں کی عام صنف سے ہوں گے) اور دوسرا حصہ اس جماعت
کی رکنیت کا مخصوص مدعی ہو اور میں ایسے لوگوں کو شراب خانوں اور قہوہ خانوں کے
قائم مقام کہہ سکتا ہوں، تمام بڑے بڑے حصوں میں جہاں انتخاب کی باقاعدہ کوششیں
ہوتی ہیں، یہ مقامات ناجائز داد و ستد (رشوت) اور ناجائز انتظامات کے مرکز بن جاتے
ہیں۔ اس کی بہت کافی شہادتیں موجود ہیں کہ یہ داد و ستد اور یہ انتظامات کس نوعیت
کے ہوتے ہیں مگر یہاں ان کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص سمجھ جائیگا
کہ میرا روئے سخن کن امور کی طرف ہے، اور انھیں امور کی وجہ سے کیسے بے اصول
ارکان منتخب ہو جاتے ہیں۔ پس یہ نئی پارلیمنٹ قصبات کے ادنیٰ ترین طبقے کے
دو قسم کے نمایندوں اور ادنیٰ ترین زرعی طبقے کے ایک قسم کے نمایندوں پر مشتمل
ہوگی۔ قصبات کے اصلی نمایندے ایک خاص قسم کے لوگ ہوں گے، اور
دیہاتوں کے اصلی نمایندے ایک دوسری ہی مختص قسم کے مگر اول الذکر سے
بہت ہی مشابہ ہوں گے۔ ایک میں تو قصبات کے کاریگروں کے خیالات و
میلانات غالب ہوں گے اور دوسرے پر دیہاتوں کے مقام کے خیالات
و میلانات مستولی ہوں گے۔ ہر طبقہ اپنی ایک خاص زبان میں گفتگو کرے گا۔
ہر ایک دوسرے کے لیئے ناقابل فہم ہوگا اور جو طبقہ سرسبز ہوگا وہ انھیں بد اخلاق
نمایندوں کا طبقہ ہوگا جن کے انتخاب میں ناجائز وسائل کام میں آئے ہوں گے،
اور اخراجات ناجائز میں انھوں نے جو کچھ صرف کیا ہوگا اس سرمائے سے وہ
بہ اغلب وجوہ اچھا نفع اٹھائیں گے۔ اگر صحیح ہے کہ پارلیمنٹی حکومت صرف اسی حال میں
ممکن ہوگی جب نمایندوں کی حاوی و غالب کثرت، ایسے لوگوں پر مشتمل ہو جو فی الواقع
اعتدال پسند ہوں، ان میں نمایاں تباین نہ ہو اور وہ طبقاتی تعصبات سے پاک ہوں،

تو پھر یہ متجاوز الحد عمومی پارلیمنٹ اس حکومت کو قائم نہیں رکھ سکتی، کیونکہ اسکے ارکان دو طرح کی اخلاقی زیادتیوں اور ایک طرح کی بد اخلاقی کے لیئے نمایاں ہوں گے۔

میں ایک لمحے کے لیئے بھی مسٹر ہیر کی تجویز کو حد سے بڑھی ہوئی عمومیوں کی تجویز کے ساتھ نہیں ملاتا۔ البتہ یہ دشوار ہے کہ اس میں افسانے کا سا رنگ نہ محسوس ہوتا ہو، جب باوقار و معمر مقنن اور پختہ مغز فلسفی ایسی امید افزا تجویزیں پیش کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا پھر جوان ہوتی جا رہی ہے۔ یہ انھیں طبقات کی طرف سے ہوتا ہے کہ نوجوانوں کو بالعموم یہ تلخ جواب ملتا ہے کہ ان کی نفیس تجاویز کی راہ میں سخت و صعب دشواریاں حائل ہیں، یہ تجویزیں ایسی ہی دوسری تجویزوں کی تکرار ہیں جو اس سے بہت قبل ناکامیاب ہو چکی ہیں اور ہمیں اس آزمودہ کل کے بہت ہی معتدل نتائج پر قانع ہونا چاہیئے لیکن مسٹر ہیر اور مسٹر مل اپنی نئی تجویز کے ماحصل کے طور پر ایسے وسیع نتائج پیش نظر کرتے ہیں اور ایسی دل پذیر ترقیوں کی توقع دلاتے ہیں کہ ایک پرجوش نوجوان نے کبھی اپنی غایت سرخوشی کے عالم میں ایسی امیدوں کے خواب نہ دیکھے ہوں گے۔

میں مسٹر ہیر کی تجویز کے خلاف میں اس کی مفروضہ غیر عملیت کا کوئی بار نہیں ڈالنا چاہتا کیونکہ یہ تجویز ابھی نئی ہے اور اصل یہ ہے کہ جب تک یہ تجویز پرانی نہ ہو جائے اُسے عمل میں لا بھی نہیں سکتے۔ خوش قسمتی سے اس قسم کا کوئی تغیر عظیم دفعتہً واقع نہیں ہو سکتا۔ ایک آزاد قوم کو ایسے نئے ادارات کی سرگردانی میں مبتلا نہیں کیا جا سکتا جنھیں وہ سمجھتی نہ ہو کیونکہ جب تک وہ انھیں سمجھ نہ لے وہ انھیں قبول ہی نہ کریگی۔ لیکن مسٹر ہیر کے احباب انکی تجویز کی نسبت جو کچھ کہتے ہیں اگر وہ پورا ہو جائے بلکہ اسکا نصف ہی حصہ پورا ہو جائے تو پھر اگر سنہ ۱۹۶۶ تک یہ تجویز قبول نہ کر لی گئی ہو، تو ضرور اس پر عمل پیرا ہو کر دیکھنا چاہیئے کہ کیا ہوتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم تحریروں کے ذریعے سے برابر اس اصول کو عوام کے دلنشین کرتے رہیں، اور تحریر سے بہتر تو یہ ہے کہ اس کا تھوڑا تھوڑا ابتدائی تجربہ شروع کر دیں۔ انتخاب کے تمام دوسرے طریق عمل میں بہت ہی کوفت و پریشانی ہے مگر اس تجویز پر اعتقاد رکھنے والے ان تمام شور و شر کو برطرف کر دیتے اور اس امید میں پڑ جاتے ہیں کہ جب یہ مل خوش کن تجویز عمل میں آجائیگی تو بس ایک ایسا زمانہ آجائے گا کہ خیال بھی

اس سے آگے پرواز نہیں کرسکتا۔ میں بھی اس احساس راحت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں بلکہ چاہتا ہوں کہ کاش اس میں شرکت بھی کرسکوں ،

مسٹر ہیر نے اپنی تجویز جس شرح و بسط سے پیش کی ہے اس شرح و بسط سے اس پر بہ اطمینان بحث نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے جس شغف کے ساتھ اس تجویز میں جزئیات جمع کیے ہیں ان پر کوئی معمولی شخص آسانی کے ساتھ احاطہ نہیں کرسکتا جو کچھ ہوسکتا ہے اسے ثابت کرنے کے لیئے وہ اس قدر مضطرب تھے، کہ انھوں نے اکثر لوگوں کو اس حیرانی میں ڈال دیا ہے کہ یہ تجویز (فی نفسہ) ہے کیا۔ میں نے ایک شخص کو یہ کہتے سنا ہے کہ وہ اس تجویز کو دو دن متواتر یاد نہیں رکھ سکتا، مگر میں جس دشواری کو محسوس کرتا ہوں وہ اصلی دشواری ہے اور جزئیات سے اسے مطلق کوئی تعلق نہیں ہے۔

حلقہائے انتخاب کے بنانے کے دو طریقے ہیں، اول یہ کہ قانون کی رو سے یہ حلقے بنائے جائیں جیسا انگلستان اور تقریباً ہر دوسری جگہ ہوتا ہے، قانون یہ بتائیگا کہ فلاں فلاں اوصاف سے حلقۂ (الف) میں ایک رائے حاصل ہوگی۔ جن لوگوں میں یہ اوصاف موجود ہوں گے وہ حلقۂ (الف) میں شمار ہوں گے یہ وہ حلقے ہیں جنھیں ہم لازمی حلقہائے انتخاب کہہ سکتے ہیں اور ہم ان کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ قانون انتخاب کرنے والوں کو خود نیا حلقہ بنانے کے لیے آزاد چھوڑ دے۔ قانون یہ بتا دے کہ ملک کے تمام بالغ مرد رائے دیں گے، یا وہ مرد رائے دیں گے جو لکھنا پڑھنا جانتے ہوں یا وہ جن کی آمدنی پچاس پاؤنڈ سالانہ ہو، یا کوئی شخص جسکی کسی نوع سے تعریف کردی گئی ہو، اور پھر اس کے بعد رائے دہندوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ خود جس طرح چاہیں اپنے گروہ بنالیں۔ فرض کیجیے کہ دار العوام کے انتخاب میں رائے دینے والوں کی تعداد ۶۵۸۰۰۰ ہو۔ ممکن ہے کہ مجلس وضع قوانین یہ کہہ دے کہ ہمیں اس کی پروا نہیں ہے کہ تم اپنے گروہ کس طرح بناتے ہو، ایک معیّنہ دن ہر جماعت کو یہ اطلاع دینا چاہیئے کہ وہ کس گروہ میں رائے دینا چاہتا ہے، اگر ہر ایک رائے دہندہ اطلاع دے اور ہر شخص اپنی رائے سے بیش از بیش کام لینے کا خیال رکھے تو ہر گروہ میں ٹھیک ایک ہزار آدمی ہوں گے،

مگر قانون اسے لازمی نہیں قرار دیگا، یہ ان ۵۸۲ گروہوں کو لے لیگا جنہیں سب سے زیادہ تعداد ہو، اس سے بحث نہیں کہ ان میں ۳۰۰۰، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۹۰۰ یا ۸۰۰ کتنی رائیں ہیں۔ وہ ایسے گروہ ہونا چاہیئے جن کی تعداد سب سے زیادہ ہو، تعداد خواہ کچھ ہو، اور یہی قوم کے حلقہائے انتخاب ہوں گے"۔ اگر یہ کہنا روا ہو تو میں کہوں گا کہ" یہ اختیاری حلقہائے انتخاب" ہیں۔ سٹر ہیر ایک بہت ہی پیچیدہ قسم کے حلقۂ انتخاب کی رائے دیتے ہیں مگر " اختیاری اصول کے عیب و صواب کے ظاہر کرنے کے لیئے سہل ترین طریقہ پیش نظر رکھنا سب سے بہتر ہے"۔

اس اصول کی ترغیبات بہت صاف ظاہر ہیں، حلقہائے انتخاب کے لازمی طریق کے تحت میں جماعت ہائے قلیل کی رائیں بیکار جاتی ہیں۔ اس وقت بلدۂ لندن میں بہت سے ٹوری ہیں مگر بلدی ارکان سب کے سب وہگ ہیں۔ اس لیئے قانون و اصول کے بموجب لندن کا ہر ایک ٹوری بغیر نمایندگی کے ہے۔ اسکا شہر پارلیمنٹ میں ان ارکان کو نہیں بھیجتا جنھیں یہ ٹوری بھیجنا چاہتے ہیں بلکہ ان ارکان کو بھیجتا ہے جنہیں وہ نہیں بھیجنا چاہتے لیکن اختیاری طریق میں لندن کے ٹوری جو ایکہزار سے تعداد میں بہت زیادہ ہیں، باہم متفق ہو کر اپنا ایک حلقہ بنا لیتے اور ایک رکن کا انتخاب کر دیتے۔ بہت سے موجودہ حلقہائے انتخاب میں قلیل التعداد جماعتوں کی عدم رائے دہی مایوس کن و مزمن ہو گئی ہے۔ مجھے تو ایک زرعی صوبے میں بیس برس تک ایک رائے کا حق حاصل رہا ہے اور میں لبرل ہوں مگر میرے حلقے سے ہمیشہ دو ٹوریوں کا انتخاب ہوتا رہا ہے اور میری زندگی بھر ہوتا رہیگا۔ اس وقت جو حالات ہیں، اس کے اعتبار سے میری رائے محض بیکار ہے لیکن اگر میں دوسرے ایک ہزار سربرون کے ساتھ کنسرویٹو فریق کے اس صوبے اور دوسرے صوبوں میں اتفاق باہمی کر سکوں، تو ہم سب ملکر ایک لبرل رکن کا انتخاب کر سکتے ہیں۔

نیز اس تجویز میں حلقہائے انتخاب کے رقبوں کے تمام مشکلات سے بھی نجات ملجاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خلاف قیاس امر ہے کہ لورپول بھی اتنے ہی ارکان کا انتخاب کرے جتنے ارکان کنگز لن لائم ریجس کی طرف سے منتخب ہوتے ہیں، لیکن خود ساختہ اصول کے موافق لورپول بھی کنگز لن لائم ریجیس کی سطح پر آسکتا ہے کنگز لن لائم ریجیس کے

لبرلوں کی قلیل التعداد جماعت، لورپول کے لبرلوں کی قلیل التعداد جماعت سے گفت وشنود کر سکتی اور اس طرح ہزار کی تعداد پوری کر سکتی ہے اور یہی حال ہر جگہ ہوگا۔ اس طرح کثیر التعداد آبادی کے لوگوں کو اُن کا جائز نفع حاصل ہو جائیگا۔ جب حلقہائے انتخاب خود ساختہ طور بنائے جائیں گے تو انھیں یہ موقع حاصل ہوگا اور وہ برضا و رغبت ایسا کریں گے کہ حلقہائے انتخاب کی زیادہ سے زیادہ تعداد بنالیں۔

علاوہ ازیں کسی بڑے شخص کے قدر دان اُس کے حسب رتبہ اسکے لیے ایک حلقۂ انتخاب بنالیں گے۔ چنانچہ ایسا ہوا ہے، مسٹر مل کو وسٹ منسٹر کے انتخاب کنندوں نے منتخب کیا تھا، اور جب سے وہ ارکان کا انتخاب کررہے ہیں، کبھی انھوں نے اپنے لیئے اس سے بڑے اعزاز کا کوئی کام نہیں کیا۔ مگر وسٹ منسٹر کے انتخاب کنندگان مسٹر مل کی حالت کو گیا جائیں مسٹر مل کے دل ودماغ کا وہ کونسا چھوٹے سے چھوٹا جزو ہے جو اُن کے دل ودماغ میں آسکے؟ ان کی ذہانت وطباعی کے ایک بڑے جزو کو ان میں سے اکثر لوگ پسند نہیں کریں گے۔ ان کا مقصود یہ تھا کہ وہ ذہنی قابلیت کے آگے سر نیاز خم کرتے ہیں مگر دنیا میں غیر معلوم خدا کی پرستش اگر کوئی شے ہوئی ہے تو وہ یہی تھی لیکن اختیاری اصول کے موافق مسٹر مل کی کتاب کے کئی ہزار مطالعہ کنندگان میں سے ایک ہزار اشخاص ایک قابل قدر طبقہ بنا سکتے تھے۔

میں اور فوائد کا بھی شمار کر سکتا ہوں مگر مجھے اس تجویز کا قدح کرنا منظور ہے اسکی مدح کرنا منظور نہیں ہے وہ مخالف وجوہ و اسباب کیا ہیں جو ان خوبیوں کو مغلوب کر دیتے ہیں؟ میں اسکا جواب یہ دیتا ہوں کہ حلقہائے انتخاب کی خود ساختہ ترکیب میری نظر میں پارلیمنٹی حکومت کے ان شرائط اولین ہی کے منافی معلوم ہوتی ہے، جنھیں ابھی ابھی قرار دیا جا چکا ہے۔ اختیاری طریق کے تحت میں، سیاسیات کا نازک دیر خطر موقع، ارکان کا انتخاب نہیں ہے بلکہ حلقہائے انتخاب کا بنانا ہے۔ امریکہ میں "صدر گری" ایک تجارت بن چکی ہے اور اسی طرح اختیاری اصول کے موافق انگلستان میں "طبقہ گری" بھی ایک تجارت بن جائیگی۔ ہر فریق کو حساب کا ایک سوال حل کرنا پڑیگا۔ سرگروہ یہ کہیں گے کہ

"ہمارے پاس ۳۵۰۰۰ رائیں ہیں ہمیں ایسی فکر کرنا چاہیئے کہ ہمارے ۳۵۰ ارکان منتخب ہو جائیں" اور اس کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ انتظام و انضباط ہے جو شخص یہ چاہیگا کہ وہ کسی لبرل حلقۂ انتخاب کا ایک جزو ہو اسے خود اپنے لیئے ایک ہزار دوسرے لبرلوں کے درپے نہ ہونا چاہیئے، اگر وہ ایسا کریگا تو دس ہزار خطوط لکھنے کے بعد اسے یہ معلوم ہوگا کہ وہ غالباً سو اشخاص کے حلقۂ انتخاب کا ایک جزو ہے، اور یہ سب رائیں رائگاں جائیں گی اور یہ حلقۂ انتخاب کسی شمار کے قابل بھی نہ ہوگا۔ مذکورہ بالا لبرل شخص پر یہ لازم ہوگا کہ وہ پارلیمنٹ اسٹریٹ کی بڑی انجمن اندراجات کو لکھے، اس کے قابل منتظموں سے مراسلت کرے اور وہ بہت جلد اس کی رائے کو اس کے لیئے کام میں لائیں گے۔ وہ کہیں گے کہ "صاحب آپ نے دیر کر دی، مسٹر گلیڈ اسٹن نے پوری رائیں حاصل کر لی ہیں، انھوں نے سال گزشتہ اپنے ہزار آدمی بنا لیئے تھے، اکثر وہ معززین جن کا ذکر آپ اخبارات میں پڑھتے ہیں وہ پوری رائیں حاصل کر چکے ہیں، جہاں کسی معزز شخص نے کوئی نفیس تقریر کی اور ہمارے پاس خطوں کا ایک انبار لگ جاتا ہے کہ "ہمیں اس شخص کے حلقۂ انتخاب میں شامل کر دیجیئے"، مگر ہم ایسا نہیں کر سکتے، ہماری یہ فہرست موجود ہے، اگر آپ اپنی رائے کو ضائع نہیں کرنا چاہتے ہیں، تو آپ ہماری ہدایت پر چلیں۔ تین نہایت قابل اطمینان معززین موجود ہیں (اور ایک ان میں سے آنریبل بھی ہیں) آپ ان میں سے کسی شخص کو رائے دے سکتے ہیں، اور ہم آپ کا نام لکھ لیں گے، لیکن اگر آپ لاابالیانہ طور پر رائے دینا چاہتے ہیں تو آپ بالکل نظر انداز ہو جائیں گے۔

اس انضباط کا صریحی نتیجہ یہ ہوگا کہ زیادہ تر فریقیانہ اشخاص کا انتخاب عمل میں آئیگا۔ یہ ارکان گو آزادی پر نظر نہیں رکھیں گے بلکہ ان کی نظر اطاعت و انقیاد پر ہوگی، اور ایسا کرنے پر انھیں مورد الزام قرار دینا بھی دشوار ہے۔ وہ لبرل فریق کے گماشتے ہیں اور اس حیثیت سے انھیں اس روش پر چلنا چاہیئے جو سرخیل کی مرضی ہو۔ لبرل فریق کے عام لوگ کارروائی (الف)، کارروائی (ب)، کارروائی (ج) کے خواہاں ہیں۔ یہ پرفن و چابکدست مہتممان اندراج بہت ہی مصروف بکار لوگ ہیں، وہ کہیں گے کہ "صاحب ہمارا شقہ یہ ہے، اگر آپ

ہماری طرف سے پارلیمنٹ میں جانا چاہتے ہیں، تو آپ کو اس شقے کے موافق چلنا چاہئیے۔ یہ شقہ مسٹر لائڈ کے نام نکلا ہے، وہ پہلے ریلوے میں کام کرتے تھے مگر جب سے لوگوں نے یہ نیا طریقہ رائے دہی منظور کیا ہے ہمنے انھیں اپنے کام میں لگا لیا ہے، یہ ایک قابل وثوق شقہ ہے، اس پر قائم رہے اور بس، یہی آپ کے لیے ٹھیک ہے" (از روئے نظریہ)، اس خود ساختہ اصول کے بموجب ارکان کا ایک گروہ جمع ہو جائے گا۔ یہ فریقانہ اطواق وسلاسل میں جکڑا ہو گا اور یہ بندشیں اس وقت کی تمام بندشوں سے بدرجہا زیادہ سخت ہوں گی۔

جو شخص بھی یہ امید رکھتا ہو کہ عوام کی منتظم ومنضبط کارروائی کے مقابلے میں عوام کی ادھر ادھر کی بھولی بھٹکی کارروائی کچھ کام دے سکتی ہے، اُسے چاہئیے کہ امریکہ کے انتخاب صدر جمہوریہ کی کارروائی کو نظر غور سے دیکھ لے، (وہاں) تجویز تو یہ تھی کہ عام باشندگان ملک جس مدبر کو سب سے بہتر سمجھتے ہوں اس کے لیئے رائے دیں مگر کوئی بھی ایسا نہیں کرتا۔ لوگ اس ٹکٹ پر رائے دیتے ہیں جو "بزنگ" تیار کر دیتی ہے اور "بزنگ" ایک طرح کا نیابتی جلسہ ہے جو رائے پر رائے دیتا رہتا ہے تا آنکہ وہ ان تمام معروف ومعلوم افراد کو ساقط کر دیتا ہے جن کی نسبت بہت کچھ معلومات حاصل ہے اور کسی ایسے غیر معروف شخص پر اتفاق کر لیتا ہے جس کے خلاف کوئی بات معلوم نہیں ہوتی، اور اس لیئے اس پر کوئی اعتراض ہی نہیں ہو سکتا۔ "حلقہ گری" کیلیئے انگلستان میں یہ "بزنگ" یا اس کے ہم مثل کوئی اور شے اس سے بدرجہا بدتر ہو گی جتنی امریکہ میں "صدر گری" کے لیئے ہو چکی ہے، کیونکہ اہم موقع پر امریکی قوم کسی ایک بڑے شخص پر رائے قائم کر سکتی ہے جسے وہ جانتی ہو مگر انگریزی قوم ۶۵۸ بڑے آدمیوں کی نسبت رائے قائم کر کے ان کا انتخاب نہیں کر سکتی۔ قوم اپنے بہت سے آدمیوں کو نہیں جانتی اور اگر جانتی بھی ہو تو وہ عیاریوں کے مشکلات میں پھنس کر غلط راستے پر پڑ جائے گی۔

لیکن اگرچہ ایک عام رائے دہندہ کسی موثر حلقہ انتخاب میں اس صورت میں شامل ہو سکتا ہے اور ایک عام امیدوار کسی حلقہ انتخاب تک اسی حالت میں پہنچ سکتا ہے جب یہ دونوں اپنی جانب کے سیاسی صناعان انتخاب کے احکام کی

اطاعت کریں، پھر بھی کچھ رائے دہندے اور کچھ ارکان ایسے ہوں گے جو ان دونوں سے بالکل آزاد ہوں گے، ملک انگلستان میں ایسی منتظم جماعتیں موجود ہیں جو بہت جلد اپنے حلقہائے انتخاب کی ایک خاص تعداد مرتب کریں گی۔ اس تجویز کی اشاعت کو تین ماہ بھی نہ گزریں گے کہ ہر ایک گرجا انتقالی رائے کا ایک دفتر بن جائیگا۔ کلیسائے انگلستان اس کے سمجھنے میں نسبتہً بہت سست اور اس سے کام لینے میں نسبتہً بہت کم چالاک ہوگا مگر پھر بھی وہ اس کام کو سیکھ جائیگا۔ منحرفین لبرل فریق کے نہایت زبردست اور بہت قابل قدر جزو ہیں مگر اس اختیاری تجویز کے تحت میں وہ اس کے جزو نہ ہوں گے بلکہ وہ ایک جداگانہ و آزاد عنصر بن جائیں گے۔ ہم اس وقت قضیات کو ایک حلقے میں جمع کرنے کی تجویز کرتے ہیں، مگر اس وقت یہ لوگ عبادت گاہوں کو مجتمع کرنے کی تجویز کریں گے۔ اس وقت صورت حال یہ ہوگی کہ تھیوسٹاک، وڈسٹیفنس وغیرہ کی بینیٹیسٹ (اصطباغی) جماعت مل کر پارلیمنٹ کے لیئے ایک قائم مقام منتخب کرسکے گی۔

اس دلیل کی پوری قوت کا اندازہ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ اس سابقہ حجت کی طرف عود کیا جائے کہ پارلیمنٹ کے ارکان کا حصۂ کثیر ایسا ہونا چاہیئے جس کے خیالات معتدل ہوں، ورنہ وہ ایک غیر اعتدال پسند وزارت کا انتخاب کرلیگا اور بڑا شدداد قوانین بنانے لگیگا۔ مگر جو تجویز پیش کی گئی ہے، اسکے بموجب یہ ایوان فریقانہ مدبروں سے مرکب ہوگا، جن کا انتخاب ایک فریقانہ مجلس کرے گی، وہ اس مجلس کی زنجیروں میں جکڑے ہوں گے، (اور فریقانہ زیادتیوں کے پابند ہونگے) انگلستان کے ہر ایک سیاسی مذہب کے خصوصیات کے نمایندے ہوں گے اور اسلیئے حد اعتدال سے بڑھے ہوئے نمایندے ہوں گے۔ پس اعتدال پسند اور منصف مزاج اشخاص کی ایک سنجیدہ و فہمیدہ جمعیت کے بجائے ہر قسم کے اشتداد کا ایک معجون مرکب تیار ہو جائے گا۔

بظاہر یہ معلوم ہوگا کہ میں اس تجویز کا مضحکہ کر رہا ہوں، مگر میں ابھی اسکی بدترین حد کو نہیں پہنچا ہوں، یہ ارکان اگرچہ ناقص ہوں گے، لیکن پھر بھی اگر وہ اپنے حال پر

چھوڑ دیئے جائیں یعنی اگر انھیں ایک آزاد پارلیمنٹ میں حکومت کے خطرات سے
رو در رو ہونا پڑے، تو یہ گہری ذمہ داری ان کی حالت میں اصلاح اور ان میں
رواداری پیدا کردے گی مگر وہ بجال خود چھوڑ کے نہیں جائیں گے۔ ایک اختیاری
حلقۂ انتخاب، تقریبًا مطلق العنان حلقہ ہوگا، بہترین صورت میں بھی اگر سچے خیال
کے کچھ لوگوں نے کسی رکن کو اپنی صداقت کے شائع کرنے کے لیئے منتخب کیا ہوگا
تو وہ یہ دیکھتے رہیں گے کہ وہ رکن اس صداقت کو شائع بھی کرتا ہے یا نہیں۔ ان ارکان
کی مثال جماعت منحرفین کے پادریوں کی سی ہوگی، اس جماعت کا اجتماع اس بنا
پر ہوتا ہے کہ عقیدۂ (الف) پر اس جماعت کی بابت سب لوگ متفق الخیال ہیں
اور واعظ کا کام یہی ہے کہ وہ عقیدۂ (الف) کا وعظ کہے، اگر وہ ایسا نہ کرے تو
وہ برطرف کردیا جائے گا۔ فی الحال ارکان اس وجہ سے آزاد ہیں کہ انتخاب کنندگان
کسی خیال پر زیادہ راغب نہیں ہیں، کوئی حلقۂ انتخاب ایسا نہیں ہے جو سیاسیات
میں کوئی حتمی و قطعی مسلمہ عقیدہ رکھتا ہو۔ قانون نے حلقہائے انتخاب کو
جغرافی تقسیم پر مرتب کیا ہے اور ان کا ارتباط باہمی عقیدے کے کسی گہرے
اتحاد پر مبنی نہیں ہے۔

خاص خاص مسلمات کے متعلق ان کے ذہن میں کچھ مبہم سا رجحان ہوتا
ہے اور بس، مگر ایک اختیاری حلقۂ انتخاب ایک کلیسا کے مثل ہوگا اور اسکے
مخصوص عقائد ہوں گے۔ وہ اپنے نمایندے کو اپنے احکام کا قاصد اور
اپنے عزائم کا وکیل بنائیگا، جیسا کہ منحرفین کی جماعت میں ہوتا ہے۔ کمتر ایسا
ہوتا ہے کہ کوئی جلیل القدر پادری خود جماعت پر حکمران ہوجائے، ورنہ سو میں
ننانوے پادریوں پر جماعت ہی حکمران ہوتی ہے، پس اسیطرح یہاں بھی شاذ و نادر
کوئی مشہور و ممتاز رکن اپنے انتخاب کنندگان پر حاوی ہوجائیگا ورنہ عام طور پر
انتخاب کنندہ ہی ارکان پر حاوی ہوں گے۔

غرض ایک اچھے خود اختیاری حلقۂ انتخاب کے ارکان اپنے حلقۂ انتخاب
کی عمدگی ہی کی وجہ سے بہت بُری طرح اُس کے حلقہ بگوش ہوجائیں گے اور ایک
خراب خود اختیاری حلقۂ انتخاب کے ارکان اپنے حلقے کی خرابی کی وجہ سے اور بھی زیادہ

زنجیروں میں جکڑ جائیں گے۔ ان حلقہائے انتخاب کے بنانے والے اس مطلق العنانی
کے مرکز کو خود اپنے ہاتھ میں رکھیں گے۔ امریکہ میں ارباب سیاسیات کی ایک تقسیم
"تاربازوں اور سنے نوازوں میں کی گئی ہے۔ اختیاری تدبیر کے تحت میں "
رکن پارلیمنٹ محض ایک ہنگامی بین بجانے والا یا بے اثر سنے نواز ہوگا۔ اور
"حلقہ گر" پردے کے پیچھے سے تار کھینچنے والے یعنی دائمی مطلق العنان ہوں گے،
وہ پارلیمنٹ کے ارکان کو لکھیں گے کہ "آپ کا انتخاب "لبرل ٹکٹ" پر ہوا
تھا، اور اگر آپ اس ٹکٹ سے ہٹ گئے تو پھر آپ کا انتخاب نہیں ہو سکیگا، اور
ایک معمولی طبیعت کے شخص کے لیئے کوئی مرافعہ نہ ہوگا۔ اس کے لیئے اپنے
واسطے کوئی حلقۂ انتخاب بنا لینا اس سے زیادہ قرین قیاس نہ ہوگا کہ ایک
موتس کور اپنے لیئے ایک سیارہ بنا لے۔ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ہفت سالہ
میعاد کی پارلیمنٹ کے لیئے اس قسم کی قید و بند بیکار ہوگی، جس رکن کا انتخاب
سات برس کے لیئے ہو گیا ہوگا وہ ایک راستباز صادق العزم حلقۂ انتخاب
کے تعرضات یا پوشیدہ چابکدستوں کے لعن طعن سے بے نیاز ہو سکتا ہے مگر
حلقہائے انتخاب کے خود ساختہ طور پر بن جانے کے بعد پارلیمنٹ کا عہد مختصر ہی ہوا کریگا۔
صادق العزم حلقہائے انتخاب جلد جلد انتخاب کا تقاضا کریں گے اور اسے حاصل
کریں گے، وہ اسے پسند نہ کریں گے کہ اپنے استحقاق سے ایک مدت دراز
کے لیئے محروم ہو جائیں۔ وہ اس بات سے غصے میں آجائیں گے کہ ایسے حالات
و واقعات کے تحت میں جن کا انتخاب کے وقت کسی کو خیال تک بھی نہ تھا،
ان کے استحقاق سے اُن کے منشا و مرضی کے خلاف کام لیا جائے۔ ہفت سالہ
میعاد کی پارلیمنٹ ایک سیاسی دور میں منتخب ہوتی، دوسرے سیاسی دور میں قائم رہتی اور تیسرے
سیاسی دور میں برطرف کیجاتی ہے۔ جو جماعت انتخاب کنندہ قانوناً و جبراً جمع کی جاتی ہے اس
تغیر کو برداشت کر لے جاتی ہے کیونکہ ان میں مجموعی صداقت عزم نہیں ہوتی۔ وہ
اس کی پرواہ نہیں کرتی کہ جو اختیار اُس نے عطا کیا ہے وہ کسی ایسے طریق سے
کام میں لایا جائے جسے اُس نے پہلے نہ سمجھا ہو مگر پر اشواق رایوں کا خود ساختہ
گروہ انتخاب کنندگان جسے ایک تبلیغی حلقۂ انتخاب کہنا چاہیئے، وہ اس پر اعتراض

کرنے کو اپنا معینہ و قطعی فرض سمجھیگا اور پر فطرت چابکدست عیار زبان سے کچھ نہ کہیں گے اور اندر ہی اندر اور بھی زیادہ اعتراض کریں گے۔ یہ دونوں مل کر سالانہ طریق انتخاب قائم کر لیں گے اور نہایت بیدردی کے ساتھ اپنے ارکان پر حکمران ہو جائیں گے۔

اس لیئے اختیاری تجویز جب اس آسان طریق پر کام میں لائی جائیگی تو وہ پارلیمنٹ کی خارجی آزادی، اور اس کے باطنی اعتدال دونوں کے منافی ہو گی اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں پارلیمنٹی حکومت کے امکان محض تک کے لیئے بھی یہی دونوں امور شرط لازمی ہیں۔ یہ ظاہری ہے کہ یہی اعتراضات اس تجویز کے زیادہ پیچیدہ اشکال کے اصول پر بھی عائد ہوں، جب تعرض خود اصول اولین سے ہے تو پھر جزئیات کا انبار پر انبار لگانا بیکار ہے۔ اگر مذکورہ بالا استدلال درست ہے تو جبری حلقۂ انتخاب لازمی و ضروری، اور اختیاری حلقۂ انتخاب موجب تباہی و بربادی ہیں۔ رایوں کا جواز انتقال کوئی صحت افزا مدد نہیں بلکہ برباد کن بدعت ہے۔

میں نے مسٹر ہیر کی تجویز اور متجاوز الحد عمومی تجویز پر صرف اسی وجہ سے بحث نہیں کی ہے کہ ان میں سے اول الذکر میں اعلیٰ ذہنی دلچسپی موجود ہے اور ثانی الذکر کے عمل میں آجانے کے امکان کی وجہ سے دلچسپ ہے بلکہ اس وجہ سے بھی اس پر بحث کی ہے کہ پارلیمنٹی حکومت کی لازمی شرائط میں سے کم از کم دو شرطیں اس سے واضح و عیاں ہو جاتی ہیں۔ لیکن علاوہ ان لازمی شرائط کے جن کی ضرورت پارلیمنٹی حکومت کے کسی کام کو انجام دینے کے قبل پیش آجاتی ہے کچھ اور بھی مزید لوازم ہیں، جو حسن و خوبی کیساتھ کام انجام دینے کے لیئے ضروری ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، کسی دارالعوام کے خوش اسلوبی کیساتھ کام کرنے کے لیئے لازمی ہے کہ وہ پانچ فرائض کو عمدگی کے ساتھ انجام دے، اس کے لیئے ضروری ہے کہ وہ عمدگی کے ساتھ وزارت کا انتخاب کرے، عمدگی کے ساتھ قانون بنائے، عمدگی کے ساتھ قوم کو تعلیم دے، عمدگی کے ساتھ قوم کی مرضی کو ظاہر کرے، معاملات کی طرف عمدگی کے ساتھ قوم کی توجہ منعطف کرے۔

اس بحث میں بجائے خود ایک دشواری ہے یعنی "عمدگی" و "خوبی" کا مفہوم کیا ہے؛ اس کا تصفیہ کرنے والا کون ہے؟ آیا اس کے لیئے فلسفیوں کی کوئی اسم واری جماعت بنے گی، آیندہ کے لیئے کوئی خیالی نسل ہوگی یا کوئی اور خارجی صاحب امر ہوگا؟ میرا جواب یہ ہے کہ نہ فلسفی کی ضرورت ہے نہ اخلاف کی نہ کسی خارجی صاحب امر کی بلکہ اس کا فیصلہ کرنے والی خود وہی انگریزی قوم ہے جو فی المکان وفی الزمان موجود ہے۔

آزاد حکومت، کے معنی حکومت خود اختیاری کے ہیں، یعنی قوم پر قوم ہی کی حکومت ہو۔ اس قسم کی بہترین حکومت وہ ہے جسے قوم بہترین سمجھے۔ ایک مسلط کردہ حکومت (جیسی کہ ہندوستان میں انگلستان کی حکومت ہے) بہت ممکن ہے کہ بہتر ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ محکوم نسل کے بہ نسبت ایک بلند تر نسل کی نمایندگی کرتی ہو مگر یہی امر اس کا باعث ہے کہ وہ ایک آزاد حکومت نہیں ہے۔ آزاد حکومت وہ ہے جسے تابع قوم رضامندانہ طور پر منتخب کرے، کسی کمزور و البطار رکھنے والی قوم کے اتفاقیہ جمع ہو جانے سے جس قسم کی آزاد حکومت کا کوئی امکان ہو سکتا ہے وہ عمومی حکومت ہے۔ جہاں ایک شخص دوسرے کو نہ جانتا ہو، نہ اس کی فکر کرتا ہو، نہ اس کی کچھ وقعت کرتا ہو، وہاں سب مساوی درجے کے لوگ ہوں گے۔ کسی ایک شخص کی رائے دوسرے شخص کی رائے سے زیادہ زوردار نہیں ہو سکتی، مگر جیسا کہ واضح ہو چکا ہے احترام پسند قوم کی اپنی خاص ہیئت ترکیبی ہوتی ہے، یہاں بتراضی عامہ یہ طے شدہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ چند اشخاص دوسری قوموں سے زیادہ دانشمند ہیں اور بتراضی عامہ ان چند اشخاص کی رائے انکے تعدادی تناسب کے اعتبار سے بدرجہا زیادہ وقیع سمجھی جاتی ہے۔ اس قسم کی خوش نصیب قوموں میں ہم رایوں کا اندازہ بھی کر سکتے ہیں اور انھیں شمار بھی کر سکتے ہیں مگر جو قومیں اتنی خوش نصیب نہیں ہیں انہیں ہم صرف رایوں کا شمار کر سکتے ہیں لیکن آزاد قوموں میں جن رایوں کا جسطرح اندازہ یا شمار کیا جاتا ہے، اسکے مطابق فیصلہ ہوجاتا ہے۔ ایک کمل آزاد حکومت وہ ہے جو انھیں رایوں کے مطابق مکمل طور پر فیصلہ کر دیتی ہے۔ غیر مکمل حکومت وہ ہے جو غیر مکمل طور پر فیصلہ کرتی ہے اور خراب حکومت وہ ہے جو خراب طور پر فیصلہ کرتی ہے۔ اس نظم سلطنت کا معیار رائے عامہ پر ہے، یہ وہ بہترین رائے ہے جسے اپنی موجود الوقت عادات احترام کے بموجب قوم

اگر اس رائے کے مطابق چلتی ہے تو اپنی قسم کی ایک اچھی حکومت ہے، اور اگر وہ اس رائے سے انحراف کرتی ہے تو وہ خراب حکومت ہے۔

اس قاعدے کے موافق اگر جانچ کی جائے تو دارالعوام اپنا مقررہ کام اچھی طرح انجام دیتا ہے۔ وہ حکمرانوں کا انتخاب اسی طرح کرتا ہے جس طرح انگریز اس انتخاب کے ہونے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس تقریر و تحریر کے زمانے میں اس کا حال بہت جلد معلوم ہو جاتا ہے۔ میں نے ایک بہت بڑے لبرل مدبر کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "وہ وقت آرہا ہے، جب ہمیں شکایات کے متعلق اشتہار دینا پڑیگا"[۱] اس سے بڑھ کر اور شکایت کیا ہوگی کہ جس وزارت سے قوم متنفر ہو اُسے پارلیمنٹ مقرر کرے اور برقرار رکھے۔ فوراً ہی ایک لیگ "مخالف حکومت صدر" کے نام سے قائم ہو جائیگی اور مخالف قانون غلہ کی لیگ کو جیسی قوت اور کامیابی حاصل ہوئی اس سے زیادہ فوری قوت و کامیابی اُسے حاصل ہو جائیگی۔

فی الواقع یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ پارلیمنٹ کا انتخابی کام بری طرح سے انجام پاتا ہے کیونکہ وہ مضبوط حکومتوں کا انتخاب نہیں کرتی، اور یہ یقینی ہے کہ جب رائے عامہ نے کسی معینہ روش کے متعلق قطعی طور پر تصفیہ نہ کر دیا ہو اور نتیجۃً پارلیمنٹ کے اندر فریقوں کی حالت قریب قریب یکساں ہو تو پھر شخصی طمع و تلون کی وجہ سے پارلیمنٹ نہایت ہی کثرت سے اپنے مقرر کردہ اشخاص میں تغیر کرنے لگے گی اس پر کبھی اتنا اثر نہ پڑیگا کہ وہ کسی شخص پر بھروسہ و اعتماد کرے سب کے سر پر برطرفی کا اندیشہ مسلط رہیگا مگر میرا خیال ہے کہ لارڈ پامرسٹن کے دوسرے دور حکومت کے تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان اندیشوں میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ جب قوم کی نظر انتخاب صحیح طور پر کسی مدبر پر جم جاتی ہے، تو پارلیمنٹ کی نگاہ بھی اسی پر پڑتی ہے، ۱۸۵۹ء کی پارلیمنٹ کے فریقوں کی تقسیم ایسی مساویانہ تھی کہ بظن غالب کسی پارلیمنٹ میں اس سے زیادہ مساوی تقسیم نہ ہو سکیگی۔ لبرلوں میں بہت سے لوگ لارڈ پامرسٹن کو پسند نہیں کرتے تھے اور انھیں اکھاڑ پھینکنے کے لیئے وہ بہت خوشی سے شریک عمل

---

[۱] یہ ۱۸۵۸ء میں کہا گیا تھا۔

ہو جاتے مگر پارلیمنٹ کے اندر وہی اثر کام کر رہا تھا جو اس سے باہر قوم میں اپنا زور دکھا رہا تھا۔ دونوں فریقوں کے اعتدال پسند اشخاص کو اس امر کا اطمینان تھا کہ لارڈ پامرسٹن کی حکومت بہترین حکومت تھی، اور اس لیئے اگرچہ دونوں فریق کے غیر اعتدال پسند اشخاص اس سے متنفر تھے مگر ان اعتدال پسندوں نے اسکی حکومت کو قائم رکھا۔ پس ایک نازک فیصلہ کن مثال ہمیں ایسی مل گئی ہے کہ کوئی حکومت جسے (بالفاظ بندہ) "عنصر مشترک" کی تائید حاصل ہو یعنی غیر مائل فریقین۔ مماثل طبائع کے افراد اس کے موئید ہوں وہ برسر اقتدار رہیگی خواہ مختلف فریقین برابر ہی برابر کیوں نہ ہوں یا جیسا کہ خزانے کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ کثرت رائے غیر مرئی سی ہو۔ اگر خوش قسمتی سے اپنے فہم و فراست اور جاذب قلوب کے ذریعے سے کابینہ پارلیمنٹ کے متوسط الخیال حصۂ عظیم پر قابو حاصل کرے تو پھر چھوٹی چھوٹی سازشوں کی بحث و پڑاو رمبتذل تفرقہ اندازوں کی حیلہ سازیوں کے باوجود وہ قائم و برقرار رہیگی۔

بہر حال بحیثیت مجموعی، میرا خیال یہ ہے کہ پارلیمنٹ کا انتخابی کام اسی خوبی سے انجام پاتا ہے جس خوبی سے رائے عامہ اس کی انجام دہی کی خواہشمند ہوتی ہے۔ اور اگر ہم اس معیار کو ترقی دینا چاہتے ہیں تو ہمیں پہلے اس انگریزی قوم کو ترقی دینا چاہیئے جو اس معیار کو عائد کرتی ہے۔ پارلیمنٹ کے تشریعی کام کے بیشتر حصے کے متعلق بھی میرے خیال میں یہی کہنا درست ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ انگریزوں کے وضع قوانین کا طریقہ قابل استکراہ ہے اور اس طریقے کے طے کرنے کی کل بھی لائق تنفّر ہے، تمام ایوان کی ایک مجلس جو کسی طولانی مسودۂ قانون کی دقیق دفعات پر ایک ایک کر کے بحث کرے یا بحث کرنے کی کوشش کرے وہ ایک پر از مشقت مگر گراں محنت کی پست مثال ہے۔ یہ یقینی ہے کہ یہ مجلس کچھ دفعات اس قانون میں داخل کر دے گی مگر یہ دفعات ویسی ہی ہوں گے جن کی نسبت کسی جج نے یہ کہا تھا کہ "معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ دفعہ مجلس وضع قانون کے دل میں از خود آسمان سے نازل ہو پڑی ہے"۔ ایسے موقعوں پر مجلس عام کے ذریعے سے حکومت کا کام کرنا، حکومت کے پوشیدہ نقائص کو آشکارا کر دیتا اور حکومت پر اُس کے لازمی قیود کا اثر

باقی نہیں رکھتا ہے، مگر انگریزوں کی مجلس وضع قوانین کے جوہر اصلی کو اُس کے عوارض سے علحدہ کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں دو قابل لحاظ نقائص سے قطع نظر کر کے پارلیمنٹ قوانین کو اسی طرح پر منظور و نافذ کرتی ہے جس طرح قوم کی مرضی ہوتی ہے۔

تیس برس قبل ایسا نہیں تھا۔ قوم اپنی ادارات سے ارفع و اعلی ہو گئی تھی اور ان ادارات نے اُسے پست کر رکھا تھا۔ قوم کی حالت اُس مرکی سی تھی جو لڑکے کا لباس پہنے ہو۔ ہر ایک اعضاء و جوارح کو زیادہ جگہ کی ضرورت اور ہر ایک کپڑے کے از سر نو بنانے کی حاجت تھی۔ لارڈ الڈن نے اپنے وقت کی زبان میں کہا تھا کہ "وائے بر ما" اگر مجھے اپنی زندگی دوبارہ شروع کرنا پڑے تو میں ایک ایجیٹیٹر (شورش انگیز) کے طور پر اپنی زندگی شروع کروں گا"۔ اس ژرف نگاہ بڈھے نے یہ دیکھ لیا تھا کہ بہترین زندگی اُس شخص کی تھی جو پرانی دنیا پر جا بیجا اعتراض کرتا ہے، اگرچہ وہ خود اس دنیا سے محبت کرتا، اس پر اعتماد کرتا اور اس کے سوا کسی اور دنیا کا تصور قائم نہ کر سکتا ہو۔ اب اس زمانے میں ایجیٹیشن (شورش انگیزی) سے بدتر کوئی تجارت نہیں ہے، کوئی شخص اگر کسی امر کے متعلق شکایت کرنا چاہتا ہو تو اُسے مشکل سے سننے والے مل سکیں گے۔ اب اس زمانے میں مذکورہ بالا مستثنیات کو چھوڑ کر، پارلیمنٹ کے خیال و روش میں نہ صرف عام قسم کا وہ اعتدال پایا جاتا ہے جو پارلیمنٹی حکومت کے امکان کے لیے شرط لازمی ہے بلکہ وہ قطعی مدارج، وہ حتمی اعتدال بھی اس میں موجود ہے جو عام قوم کو نہایت ہی گوارا ہے۔ قوم نہ صرف پارلیمنٹی حکومت کو برداشت کرتی ہے بلکہ وہ پارلیمنٹی حکومت کو پسند کرتی ہے، لیکن پارلیمنٹ اگر اعتدال سے ہٹ گئی ہوتی تو ایسا نہ ہوتا۔ ملک میں اطمینان کا ایک خیال پیدا ہو گیا ہے کیونکہ ملک کا اکثر و بیشتر حصہ یہ محسوس کرتا ہے کہ جو شے اس کے حسب حال تھی ٹھیک وہی شے اُسے مل گئی ہے۔

یہ مستثنیات دو ہیں، اول، یہ کہ پارلیمنٹ زمیندارانہ اغراض رکھنے والوں کی رایوں کی طرف ضرورت سے زائد مائل رہتی ہے۔ قانون وبائے مواشی اس نقص کی ایک صریحی اور کھلی ہوئی مثال ہے۔ اس مسودے کے جزئیات اچھے ہوں یا

یا بُرے اور اس کی حکمت عملی عاقلانہ ہو یا غافلانہ مگر جس عجلت کے ساتھ یہ مسودہ
دارالعوام میں مختلف مدارج طے کرتے ہوئے منظور ہوا، اس سے مطلق العنانی
کا رنگ صاف جھلک رہا تھا۔ کپڑے، کی تجارت یا شراب کی تجارت اپنے
انتہائی خطرے کی حالت میں بھی اس طریقے پر ایسی مدد نہیں حاصل کر سکتی تھی،
دارالعوام نہ کسی قسم کے وقفے کے سننے کا روادار تھا اور نہ کسی دلیل کی پروا
کرنا چاہتا تھا۔ ارکان کی سب سے بڑی تعداد اپنی آمدنی کے لیئے ڈر رہی تھی،
انگلستان کی سرزمین، صوبوں کی طرف سے بہت سے ارکان کا انتخاب سالانہ
کر کے پہنچتی ہے، یہ ارکان دستور سلطنت کے رو سے ان صوبوں کو دیے گئے
ہیں۔ لیکن حیرت کی بات ہی یہ ہے کہ زمیندارانہ اغراض رکھنے والے لوگ
دوسرے طبقے والوں کو کوئی جگہ نہیں دیتے مگر دوسرے طبقے والوں سے بہت
جگہیں لے لیتے ہیں۔ انگلستان کے آدھے قصبات سے زیادہ کی نمایندگی،
مقتدر زمیندار کرتے ہیں اور جب لگان کا مسئلہ پیش آتا ہے تو وہ اُن لوگوں
کے بہ نسبت جنھوں نے انھیں بھیجا ہے خود اپنا خیال زیادہ کرتے ہیں۔ دارالعوام
کے اندر تعداد کے لحاظ سے زمیندار، معززین، دوسرے ہر ایک طبقے سے بدرجہا
زیادہ ہیں۔ ان میں باہمی گہرے روابط بھی زیادہ ہیں، ایک ہی مدارس میں ان سب نے
تعلیم پائی ہوتی ہے وہ بچپن ہی سے ایک دوسرے کے خاندان کے نام جانتے
ہیں، ان کی ایک ہی سوسائٹی (معاشرت) ہے، وہ ایک ہی طرح کے لوگ
ہیں، وہ ایک ہی طرح کی عورتوں سے شادی کرتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے تجار
و صناع اراکین، ایک مخلوط سی نسل ہیں، کسی کی تعلیم کہیں ہوئی کسی کی کہیں اور
کوئی ایسا ہے جس کی مطلق تعلیم ہی نہیں ہوئی، بعض تاجر ایسے ہیں جن کی یہ دوسری
پشت ہے اور وہ نے خود ساختہ آدمیوں کو اپنی موروثی جگہ میں دخیل سمجھتے ہیں،
کچھ خود ساختہ لوگ ہیں جو موروثی دولت رکھنے والوں کو (جسے نہ انھوں نے
پیدا کیا ہے، نہ ترقی دیتے ہیں) یہ سمجھتے ہیں، کہ اُن کے نہ دماغ ہے نہ اُن کی کوئی
منزلت ہے، ان نو دولتوں سے وہ اس وجہ سے پست ہیں، کہ ان کے
دماغ نہیں ہے اور امراء سے اس وجہ سے پست ہیں کہ ان کا کوئی رتبہ نہیں ہے

تاجروں میں اتحاد کا کوئی رابطہ نہیں ہے، نہ باہم ربط وضبط کی عادت ہے۔ انکی بیویوں کو اگر سوسائٹی میں داخل ہونیکا شوق ہوتا ہے تو اپنے خاوندوں کے سے لوگوں کی بیویوں سے ملنا پسند نہیں کرتیں بلکہ وہ برتر لوگوں سے ملنا چاہتی ہیں یعنی وہ اُن لوگوں کی بیویوں سے ملنا چاہتی ہیں جنکے پاس زمینداری تو یقینی ہو اور خدا مدد کرے تو خطابات بھی ہوں، جو لوگ پارلیمنٹ کی ہیئت ترکیبی کو مجرد کتابوں میں نہیں پڑھتے ہیں بلکہ لندن کی مادّی دنیا میں اُسے دیکھتے ہیں اُنکو زمیندار طبقے کے بہت زیادہ قوی ہونے پر تعجب نہیں ہوتا بلکہ تعجب اس پر ہوتا ہے کہ وہ بالکل مطلق العنان کیوں نہیں ہے۔ میرا یقین ہے کہ اگر یہ طبقہ یا یوں کہیئے کہ اُس کے قائم مقام چالاک ہوتے تو وہ مطلق العنان بن جاتے مگر اُس نے ایک دائمی تدبیر یہ کر رکھی ہے کہ وہ کچھ بلند سے ہوں۔ صوبے نہ صرف زمینداروں کا انتخاب کرتے ہیں (جو ایک طبعی اور غالباً دانشمندانہ بھی ہے)، بلکہ وہ اپنے ہی صوبے کے زمیندار کا انتخاب کرتے ہیں جو محال ہے۔ زراعت پیشہ لوگوں کے دماغوں میں آزادانہ تجارت کی بو نہیں ہوتی۔ ہر ایک صوبہ اس امر کو ممنوع قرار دیتا ہے کہ دوسرے صوبے سے قابل اشخاص کی "درآمد" ہو سکے یہی وجہ ہے کہ بولنگبروک اور ڈزریلی کے سے طلیق اللسان بد اعتقاد، خوش اعتقاد ٹوریوں کی رہبری کے قابل بن جاتے ہیں۔ انھیں ایسے لوگ چاہئیں جن کی بہت بڑی زمینداری ہو، اور اس قسم کے لوگ تقریر نہیں کر سکتے، اور اس لیئے وہ طلیق اللسان اشخاص جو اس فریق پر ہنستے ہیں وہی سرگروہی کے لیئے آموجود ہوتے ہیں۔ زمیندارانہ طبقے کو اس سے بہت زیادہ اثر حاصل ہے جتنا ہونا چاہیئے مگر وہ اس اثر کو اسطرح رائگاں کرتا ہے کہ خاص موقع کے سوا (جیسا کہ وبائے مواشی کے وقت ہوا) اس اثر کی اہمیت دوسرے درجے کی ہوجاتی ہے۔

اسی بات کو کم وبیش دوسری طرح پر یوں کہہ سکتے ہیں کہ پارلیمنٹ کی ہیئت ترکیبی ایسی ہے کہ ملک کے جو صوبے ترقی پذیر ہیں، اُنھیں تو حد سے کم اور جو صوبے ایک حال پر قائم ہیں اُنھیں حد سے زیادہ، اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ قدیم زمانے میں انگلستان کا جنوبی حصہ نہ صرف سب سے زیادہ خوش سواد حصہ تھا بلکہ سب سے بڑا حصہ بھی تھا۔ انگریزوں میں جب طریق نیابت کی بنیاد قائم ہوئی ہے اسوقت ڈیونشائر ایک بہت بڑا اجری صوبہ تھا، سمرسٹ شائر اور ولٹشائر بہت بڑے

صنعتی صوبے تھے۔ شمالی صوبوں کے سخت موسم کے ساتھ وہاں کی آبادی بھی کم تھی اور لوگوں میں دہقانیت و درشت مزاجی بڑھی ہوئی تھی۔ ۱۸۳۲ء کے قبل پارلیمنٹ میں جو غلبہ عظیم ٹرنٹ سے جنوب کے انگلستان کو حاصل تھا اور اس قدر قطع و برید کے بعد اب بھی کسی قدر حاصل ہے، اس زمانے میں یہ غلبہ دولت و علم کے حقیقی غلبے کے ہمقدم تھا۔ موجودہ مقابلہ کس قدر اُلٹ گیا ہے، اسے ہم سب جانتے ہیں۔ اور حالت یوماً فیوماً اور بدتر ہوتی جاتی ہے۔ زمانۂ حال کی تجارت کی کیفیت یہ ہے کہ جنکے پاس زیادہ ہے انہیں اور زیادہ دیا جائے اور جن کے پاس کم ہے اُن سے اور لے لیا جائے۔ حرفت وہیں جاتی ہے جہاں حرفت موجود ہو کیونکہ وہیں اور صرف وہیں اُسے اپنی مدد و معاون حرفتیں مل سکتی ہیں۔ ایک بڑی تجارت کو چھوٹے شہر سے بڑے شہر کی طرف منتقل کرتی جاتی ہے کیونکہ اس سے خریداروں کو بڑے شہر میں خریداری کا موقع ملتا ہے۔ سال بسال شمال زیادہ اہم ہوتا جاتا ہے اور جنوب کی اہمیت گھٹتی جاتی ہے۔ (شمال کو کم و بیش نئی حرفتی دنیا کے مرادف سمجھنا چاہیئے اور جنوب تو وہی قدیم ایام کا لعنیذ بقیہ ہے)۔ انگریزوں کے موجود الوقت پارلیمنٹی نظام پر یہ بڑا اعتراض ہے کہ یہ گزشتہ عظمت کے مقامات کو بہت زیادہ اختیار دیتا اور موجودہ عظمت کے مقامات کو ان کے مساوی اختیار دینے سے انکار کرتا ہے۔

میں ایسا سمجھتا ہوں (اگرچہ یہ عام خیال نہیں ہے) کہ اصلاح پارلیمنٹ کیلئے جو شور مچا ہوا ہے اُس کی بہت بڑی وجہ یہی عدم مساوات ہے۔ بڑے بڑے سرمایہ دار اور اُن کے ساتھ مسٹر برائٹ اور اُن کے احباب یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ مزدوری پیشہ اشخاص کے لیئے زیادہ اختیارات طلب کرنے میں راستی و صداقت سے کام لے رہے ہیں مگر فی الحقیقت وہ خود اپنے لیئے مزید اختیار کے خواہاں ہیں، اور یہ بالکل طبعی اور بالکل مناسب ہے۔ وہ اسے انگیز نہیں کر سکتے اور انہیں انگیز کرنا بھی نہیں چاہئے کہ ایک دولتمند و قابل کارخانہ دار ایک ادنیٰ سے ناقص الفہم زمیندار سے کم وقعت سمجھا جائے۔ سیاسی مساوات کے جو خیالات مسٹر برائٹ پیش کرتے ہیں وہ اتنے ہی قدیم ہیں جتنے خود سیاسیات کے تصورات قدیم ہیں، اور ان تصورات کی پہلی سعی میں اُن کی تردید ہو چکی ہے مگر با ایں ہمہ جب تک

سیاسی نظم معاشرت قائم ہے یہ خیالات بھی قائم رہیں گے کیونکہ ان کی بنیاد انسانی فطرت کے ناقابل فسخ اصول پر قائم ہے۔ آڈمنڈ برک، ہندوستانیوں کی بابت کہا کرتا تھا کہ ((ان میں ایک ایک شخص جنگجو بن (انقلابی) ہے کیونکہ وہ اپنی موجودہ اہمیت کو اپنی واقعی دولت کے ہمپایہ نہیں سمجھتا،، جب تک کوئی ایسا بچین طبقہ موجود ہے جسے اُس کے جائز اختیارات نہیں حاصل ہیں، وہ ضرور اس خیال کا دیوانہ وار حامی بن جائیگا اور آنکھ بند کر کے اس پر یقین کرنے لگیگا کہ تمام لوگوں کو ایک ہی سے اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔

میں یہ نہیں خیال کرتا ہوں کہ مزدور پیشہ طبقات کی موثر نمایندگی کا نہ ہونا پارلیمنٹی نمایندگی میں ((اس خصوص،، کے لحاظ سے کوئی نقص ہے۔ رائے عامہ کے قائم کرنے میں مزدور پیشہ طبقات کا حصہ بمنزلہ نفی کے ہے اور اس لیئے پارلیمنٹ میں ان کے اثر کا فقدان پارلیمنٹ کی رائے عامہ کے مطابق ہونے پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ وہ نمایندگی میں نظر انداز کر دیئے گئے ہیں مگر جس شے کی نمایندگی ہوتی ہے اسمیں بھی وہ ساقط ہیں۔

میرا یہ بھی خیال نہیں ہے کہ پارلیمنٹ میں اعیانی جماعت کے لوگوں کی تعداد کے زیادہ ہونے سے پارلیمنٹ کی رائے عامہ سے مطابق ہونے میں، کوئی خلل پڑتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ امیر خاندانوں کے اخلاف اور اُن کے قریبی رشتہ دار پارلیمنٹ میں اتنے ارکان داخل کرتے ہیں، جو اس تعداد سے بدرجہا زیادہ ہوتے ہیں جو ان خاندانوں کی تمام قوم کے تناسب سے ہونا چاہیئے مگر میں یہ یقین نہیں رکھتا کہ ان خاندانوں میں کوئی مجسم خصوصیت، یا کوئی عام رائے ایسی موجود ہے جو دوسرے زمیندار شرفا کی خصوصیت و رائے سے مختلف ہو۔ ان کی وہی رائیں ہیں جو اس زمیندار جماعت کی ہیں جس میں وہ پیدا ہوئے ہیں۔ انگلستان کا طبقہ رؤسا کبھی کوئی علیحدہ ذات نہیں بنا ہے اور اب بھی وہ کوئی علیحدہ ذات نہیں ہے، وہ کوئی ایسی بات قائم نہ رکھیگا جسے دوسرے زمیندار شرفا قائم نہ رکھنا چاہیں اور اگر زمیندار شرفا میں سے کچھ لوگوں کو پارلیمنٹ میں بھیجنا ہے تو انسب یہ ہوگا کہ اس میں کچھ لوگ بلند رتبے کے بھی ہوں۔ انگریز جب تک

دوسرے ادارات قائم رکھنا چاہتے ہیں جن میں سے ایک تو معظم و محتشم ہو اور اس مقصد سے کہ وہ افراد کثیر پر حکمرانی کرے، اُس وقت تک انگریزوں کو یہ فکر رکھنا ضروری ہے کہ یہ دونوں ادارات ایک دوسرے سے اچھی طرح موزونیت رکھتے ہوں، اور یہ امر پوشیدہ رہے کہ کس جگہ سے ایک شروع ہوتا ہے اور دوسرا ختم ہوتا ہے - یہ مقصد کس حد تک اس طرح پورا کیا جاتا ہے کہ انگلستان کے دستور سلطنت میں (اس تنظیم کے) نمائشی حصے کو کچھ ذیلی اختیارات دے دیے گئے ہیں مگر اسے اس سے بھی برابر کی مدد ملتی ہے کہ نظم سلطنت کے کارآمد حصے میں رئیسانہ عنصر بھی قائم رکھا جاتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ طبعی احساس احترام، دونوں کو محفوظ و مامون رکھتا ہے - "حلقہائے انتخاب" میں طبقۂ اعیان ایک قوت ہے - کوئی شخص جو آنریبل، یا بیرونٹ، یا اس سے بھی بہتر یہ کہ شاید واقعی ارل ہو (خواہ آئرستانی ارل ہی کیوں نہ ہو) انتخاب کنندوں میں آدھے آدمی اس کے حامی و مداح بن جاتے ہیں، اگر دیگر حالات یکساں ہوں تو اس کے مقابلے میں ایک کارخانہ دار کے لڑکے کو کوئی توقع کامیابی کی نہیں ہو سکتی - قوم کے احترامی احساس کی حقیقت کا امتحان اس سے ہو سکتا ہے کہ جس طبقے کا احترام کیا جاتا ہے جب اُسیں اور دوسرے لوگوں میں وسیع آزادانہ انتخاب کا موقع آپڑتا ہے تو واقعتاً اس طبقے کے کتنے لوگ منتخب ہوتے ہیں -

اس لیئے ان دو خفیف نقائص کے سوا جن کا میں نے ذکر کیا ہے (اور جنھیں باوجود خفیف ہونے کے ناقابل التفات نہیں کہہ سکتے)، پارلیمنٹ بحیثیت انتخاب کنندہ جماعت عاملانہ و مجلس وضع قوانین دونوں اعتبارات سے ملک کی قائم شدہ رائے سے کافی طور پر قطعی مطابقت رکھتی ہے - علیٰ ہذا القیاس مستثنیات کو چھوڑ کر، جب قوانین کے بجائے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ قوم کی رائے کو الفاظ میں بہت خوبی سے ادا کرتی ہے - غیر ملکی معاملات میں جس کے لیئے ہم قانون نہیں بنا سکتے، انگریزی قوم دنیا کے نازک واقعات کے متعلق خواہ وہ ڈنمارک، اطالیہ، امریکہ کے ہوں، جو کچھ خیال کرتی ہے یا یہ خیال کرتی ہے کہ وہ خیال کرتی ہے بلا بحث اسکے کہ یہ خیال مبنی بر دانشمندی ہو یا نہ ہو، وہی عاقلانہ یا غیر عاقلانہ خیال کمال خوبی کیساتھ پارلیمنٹ میں ظاہر کیا جائیگا - اگر میں یہ فقرہ کہہ سکوں تو کہوں گا کہ پارلیمنٹ نغمہ نوازی کا

فرض خوب ہی ادا کرتی ہے۔ وہ قوم کے مخصوص دلی جذبات کو اپنے مخصوص الفاظ میں شد و مد سے ادا کر دیتی ہے، اور اس سے زیادہ کارآمد کام شاید ہی کوئی دوسرا وہ کر سکتی ہو۔ اب یہ کہ آزاد حکومت یورپ میں اس درجہ نایاب اور امریکہ میں اس درجہ بعید ہے، آزاد انگریزی قوم کی رائے، خواہ وہ ناکمل، غلطی آمیز اور عاجلانہ ہی رائے کیوں نہو، پھر بھی نہایت ہی بے بہا شے ہے۔ ممکن ہے کہ وہ نہایت غلط ہو مگر یہ یقینی ہے کہ وہ اپنی صنف میں فرد ہے، اور اگر وہ صحیح ہے تو یہ یقینی ہے کہ اس میں بڑی ہی عظمت و وسعت کے معاملات داخل ہوں گے کیونکہ بعیدی امور میں کوئی آزاد قوم جن معاملات کو دیکھتی پاجاتی ہے وہ صرف اول ہی درجے کے معاملات ہوتے ہیں۔ انگریزی قوم سے وہ صدہا چھوٹی چھوٹی باتیں نظرانداز ہو جائیں گی جنھیں بڑا اعظم سے دفتری ارباب حکومت ضرورت سے زیادہ خوبی کے ساتھ جانتے ہیں مگر انگریزی قوم اگر کوئی اہم صداقت ایسی دیکھے جس پر ارباب حکومت کی نظر نہیں پڑی ہے، تو وہ اہم صداقت دنیا کو بہت کچھ مدد پہنچائیگی۔

لیکن اگر ان طریقوں میں اور ان مستثنیات کو چھوڑ کر، پارلیمنٹ اپنی روش اور اپنی تقریر سے رائے عامہ کی اچھی حامل اور اُس کی اچھی مظہر ہے تو اُس کے ساتھ ہی میں یہ بھی اعتراف کرتا ہوں کہ میرے خیال میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ رائے عامہ کے بلند کرنے میں وہ اسی حد تک کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ پارلیمنٹ کا تعلیمی کام وہ کام ہے جیسے وہ بہت بری طرح انجام دیتی ہے۔ غالباً خاص اسی موقع پر اس نقص کو مبالغے سے دکھانا ایک امر طبعی ہے (جہاں تک پارلیمنٹ کا تعلق ہے) تمام پارلیمنٹ کے معلموں میں سب سے بڑا معلم، قوم کا صدر المدرسین ملک کو مدارج عالیہ پر لیجانے والا وزیراعظم کو ہونا چاہیئے۔ مباحث کے لہجے کو بلند خواہ پست کر دینے کے لیئے اسے ایسا اثر، ایسا اقتدار اور ایسی سہولت حاصل ہے جو کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہے مگر لارڈ پامرسٹن نے برسوں بالاستقلال اپنی قوت سے یہ کام لیا ہے کہ پارلیمنٹ کی کارروائیوں کے لہجے کو پست و متبدل تو نہیں مگر سبک ضرور کر دیا ہے، ان کے انتقال کے بعد ان کے بہت بڑے مداحوں میں سے ایک شخص نے ان کی نسبت ایک قصہ بیان کیا ہے جس کی پوری اہمیت کو شاید اُس نے سمجھا نہیں ہے۔ لارڈ پامرسٹن جب پہلی مرتبہ

ایوان کے سرگروہ بنائے گئے تو اُن کے نمائشی اطوار بالکل ہی مقبول نہیں ہوئے، اور بعضوں نے ان کی ناکامیابی کی پیشین گوئی کردی، مگر ایک پرانے رکن نے کہا کہ "نہیں وہ بہت جلد ہم سب کو اپنی ہی سطح پر کھینچ لائیگا، ایوان بہت جلد اس ماہر کے انداز کو کیننگ کی طباعی اور پیل کی سنجیدگی سے زیادہ پسند کرنے لگیگا" مجھے یہ ڈر ہے کہ ہمیں یہ اقرار نہ کرنا پڑے کہ یہ پیشین گوئی بالکل پوری ہو گئی۔ کوئی وزیر اعظم جو اس قدر ہر دل عزیز اور اس قدر با اثر رہا ہو، ایسا نہیں گزرا ہے جس کی اعلیٰ تعلیم کی یاد عوام کے دماغوں میں اس قدر کم باقی رہ گئی ہو۔ اب سے بیس برس بعد جب پامرسٹن کی یاد دلوں سے زائل ہو رہی ہوگی اور لوگ ان کے حالات پڑھا کریں گے تو اُس وقت یہ نہ ہو سکیگا کہ کسی ایسی صداقت عظیم کی طرف اشارہ کیا جائے جس کی انھوں نے تعلیم دی ہو، کوئی ایسی مشخص روش بتائی جائے جو انھوں نے قائم کی ہو، نہ کچھ ایسے الفاظ ہوں گے جنھوں نے اُن کے زمانے میں لوگوں کو مسحور کر لیا ہو اور جنھیں بعد کے زمانے میں لوگ بخوشی فراموش نہ ہونے دیں مگر ہم یہ کہہ سکیں گے کہ "وہ ایک نفیس طینت کے شخص تھے، اُن کے خیال میں استحکام و سنجیدگی تھی، ان میں عدم صداقت کی ایک جھلک سی معلوم ہوتی تھی مگر ہم ہمیشہ یہ جان لیتے تھے کہ ان کا منشا کیا ہے۔ ایک خوش وضع شخص کے لباس میں وہ ایک حکمراں کا دماغ رکھتے تھے"، آیندہ نسلیں ان بڈھوں کے ذکر مذکور کو مشکل سے سمجھیں گی مگر ہم اس وقت ان الفاظ کے اثر کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ دارالعوام نے جب اس قسم کے مدبر کے انداز کو اختیار کر لیا ہے اس وقت سے اُس نے قوم کو معمول کی بنسبت زیادہ ناقص طور پر تعلیم دی ہے اور اسے معمول سے کم بلندی کی طرف اُبھارا ہے۔

لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ صحیح مبصر، اصولی و عمومی طور پر یہ فیصلہ کرے گا کہ دارالعوام عام قوم کو اس قدر نہیں سکھلاتا جس قدر وہ سکھلا سکتا ہے یا جس قدر کہ عام قوم جاننے کی خواہشمند ہے، میں اس کا خواہاں نہیں ہوں کہ بہت ہی مجرد بہت ہی فلسفیانہ اور بہت ہی سخت مسائل پارلیمنٹ میں بیان کیے جائیں۔ وہاں جو تعلیم ہو وہ عام پسند ہونا چاہیئے، اور عام پسند ہونے کے لیئے ضروری ہے کہ وہ

مادی تجسیمی اور مختصر ہو۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ وہ بلند ترین صداقت معلوم کی جائے جسے قوم برداشت کریگی اور اُسی کا وعظ و نصیحت ہو۔ یہ یقینی ہے کہ لارڈ پامرسٹن نے اس کا وعظ نہیں کہا، بلکہ انھوں نے ایک ایسے عقیدے کا وعظ کہہ کر جو انگریزوں کے معیار سے دوسرے درجے پر تھا، اُنھیں کسی قدر پستی کی طرف مائل کر دیا۔ یہ عقیدہ اتنا پست نہیں تھا کہ انگریز اس سے بہت زیادہ منقبض ہو جاتے مگر اتنا پست ضرور تھا کہ جس دنیاداری میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں تھی اُسے اور بڑھا کر اور اصول اور فلسفے کی الفت کو کم کر کے جس میں کسی کی ضرورت نہیں تھی، انگریزوں کو نقصان پہنچایا۔

یہ صحیح ہے کہ کسی دوسری جمعیت کے مباحثے کے مقابلے میں، انگریزی پارلیمنٹ کے مباحثے بہت اعلیٰ درجہ تعلیم دہ ہیں۔ امریکی کانگریس کے مباحثوں میں تعلیمی خوبی کچھ یوں ہی سی ہے۔ صدارتی حکومت کی یہ خاص خرابی ہے کہ وہاں کے مباحثوں سے تعلیمی خوبی جاتی رہتی ہے۔ اس حکومت پر مجلس وضع قوانین کسی مباحثے کا اثر بہت کم پڑتا ہے کیونکہ وہ جماعت عاملانہ کو نکال نہیں سکتی اور مجلس جو کچھ فیصلہ کرتی ہے جماعت عاملانہ اُسے محو کر سکتی ہے۔ فرانسیسی ایوان کسی ایسی شہنشاہی کے موزوں تھے جو مطلق العنانانہ اختیار کی خواہاں ہو مگر اس نام کی شرمندگی نہ لینا چاہتی ہو۔ یہ مجلسیں شہنشاہی کے دشمنوں کے اس قول کے کامل طور پر صحیح ہونے کی مانع ہو جاتی ہیں کہ یہاں آزاد تقریر نہیں ہوتی ہے۔ چند اجازت یافتہ معترضین اپنی فصاحت و بلاغت سے ہوا میں گونج پیدا کر دیتے ہیں اور ہر شخص جانتا ہے کہ یہ فصیح البیانی اکثر صحیح ہوتی اور ہمیشہ رائگاں جاتی ہے۔ انگریزی پارلیمنٹ کے مباحث دنیا میں اتنی جگہ گھیر لیتے ہیں جو ان ضمنی مجلسوں کے لیے ممکن نہیں ہے، مگر میرا خیال ہے کہ کوئی شخص اگر اہم مسائل کی ان بحثوں کو جو پریس کے اعلیٰ حصے میں ہوتی ہیں پارلیمنٹ کی بحثوں سے مقابلہ کرے گا تو اسے یہ محسوس ہوگا کہ (باوجود تمام مبالغہ آمیزی کے)، تقریر کے بہ نسبت تحریر میں زیادہ قوت

ف۱ اس کا تعلق فی الواقع حکومت شہنشاہی کی مجلسوں سے ہے۔

اور اعلیٰ معنیٰ پائے جاتے ہیں۔ اس قوت کی عوام قدر کرتے ہیں اور اس معنی کا سننا وہ پسند کرتے ہیں۔

اب سے چند برس پہلے "سٹرڈے ریویو" نے یہ لکھا تھا کہ پارلیمنٹ کی قابلیت ایک "مخصوص قابلیت" ہے، اس کے دروازے پر ایک تفریقی محصول کم از کم دو ہزار پاؤنڈ سالانہ کا لگا ہوا ہے۔ لہذا دار العوام جو صرف ان دماغوں کی نمایندگی کرتا ہے جن کے ساتھ جائداد بھی شامل ہو وہ اس مجلس وضع قوانین کی قابلیت دماغی کو نہیں پہنچ سکتا جو صرف دماغی قابلیت ہی کی بنا پر منتخب ہوئی ہو خواہ اس کے ساتھ جائداد ہو یا نہ ہو، مگر میں ایک لمحے کے لیئے خالص دماغی نمایندگی کے دیکھنے کا خواہشمند نہیں ہوں، یہ تو اس مضمون کے دعوائے خاص ہی کے خلاف ہوگا۔ میں اس پر قائم ہوں کہ پارلیمنٹ کو انگریزی قوم کی عام رائے کا مجسمہ ہونا چاہیئے، اور یہ یقینی ہے کہ یہ رائے قوم کے دماغ سے زیادہ قوم کی جائداد کی بنا پر متعین ہوتی ہے۔ وہ "زائد از ضرورت عیار لوگ" جو "بوہیمیا" میں رہتے ہیں، ان کا اثر پارلیمنٹ میں اس سے زیادہ نہ ہونا چاہیئے جتنا اثر اُن کا انگلستان میں ہے، اور اس سے کم تو شاید ہی ہو سکے۔ میرا خیال ہے کہ صرف بہت بڑے حذف و اسقاط کے بعد ملک اس سے کچھ ہی زیادہ "دماغ" کو قبول کر سکے اور نیز یہ کہ پارلیمنٹ میں ایک طرح کی امیرانہ کاہلی کا اظہار ہوتا ہے اس میں کچھ قطع و برید کی جا سکتی ہے مگر صرف کچھ زیادہ نہیں۔

پارلیمنٹ کا صرف ایک فرض جس پر رائے دینا باقی ہے وہ اطلاعی فرض ہے جسے میں اس نام سے ابھی ابھی ذکر کر چکا ہوں۔ یہ فرض جو پارلیمنٹ یا پارلیمنٹ کے ارکان سے تعلق رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ خاص خاص طبقات کے خیالات، شکایات اور خواہشات کو قوم کے سامنے پیش کرے۔ اُسے اس فرض سے خلط ملط نہ کرنا چاہیئے جسے میں تعلیمی فرض کہہ چکا ہوں اس میں شک نہیں کہ عملی زندگی میں یہ دونوں ایک دوسرے کے اندر دائرہ سائر ہیں لیکن یہی حال اُن بہت سی چیزوں کا ہے جنھیں تعریف و تحدید میں علیحدہ علیحدہ کرنا نہایت اہم ہے، دو چیزوں کے واقعات کا اکثر ایک ساتھ دستیاب ہونا اُن کو تصور میں علیحدہ کرنے کے لیئے باعث اعتراض

ہونے کے بجائے ایک مزید وجہ ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ایک ساتھ نہیں دستیاب ہو سکتے، اور اگر ہم نے ان کے علٰحدہ کرنے کی مہارت نہیں پیدا کرلی ہے تو ہم حیرانی میں پڑجاتے ہیں تعلیمی فرض صحیح تصورات کو قوم کے سامنے پیش کرتا ہے اور یہ اُس کے اعلیٰ ترین دماغوں کا فرض ہے۔ اظہاری فرض صرف خاص تصورات کو اپنے ساتھ لاتا ہے اور یہ صرف خاص خاص دماغوں کا فرض ہے۔ ہر طبقے کے اپنے تصورات، خیالات اور ضروریات ہیں، اور بعض دماغوں میں یہ خیالات کالنقش فی الحجر ہوتے ہیں۔ اس قسم کے فرقیانہ تصورات وہ تصورات نہیں ہیں جن کے ذریعے سے کوئی فیصلہ کن قوم اپنے کام کو منتظم کرے اور نہ وہ خطیب جو اپنے خیالات میں سرمست ہوں حکمت عملی کے لیئے بہترین رہنما ہوسکتے ہیں۔ مگر ان خطیبوں کی تقریروں کو سننا اور ان تصورات کو زیرنظر رکھنا چاہیئے۔ زمانۂ جدیدہ کا بڑا اصول صرف یہی نہیں ہے کہ ہر شے سے رواداری برتی جائے بلکہ ہر شے کی جانچ بھی کی جائے۔ موجودہ زمانے کی سائنس کو اب یہ درجہ بہت ہی موٹی، بہت ہی بھدی اور بہت ہی غیر امید افزا چیزوں ہی کی جانچ پڑتال کرنے سے حاصل ہوا ہے۔ ایک بہت بڑے ماہر کیمیا کا قصہ ہے کہ وہ کہا کرتا تھا کہ اُسے اپنی نصف شہرت اس طرح پر حاصل ہوئی کہ تجربات کے بعد جو چیزیں پھینک دی جاتی ہیں وہ اُن کی جانچ کیا کرتا تھا۔ خود تجربے کا نتیجہ تو ہر شخص جانتا تھا مگر ان تجربات کے فضلات میں، بہت سے حقیر واقعات اور بہت سے غیر معلوم تغیرات ایسے ہوتے تھے جن سے ایک ایسے شخص کو جو ان کے دیکھنے کی قابلیت رکھتا تھا مشہور زندگی کے انکشافات کا پتا چلتا تھا۔ یہی حال نظرانداز طبقات کے خیالات خاص کا ہے۔ ان میں صداقت کے ایسے عناصر ہوسکتے ہیں کہ وہ مختصر ہی کیوں نہ ہوں مگر یہی وہ عناصر ہیں جن کی ہمیں اس وقت ضرورت ہے کیونکہ اور امور کو ہم پہلے ہی سے جانتے ہیں۔

یہ اصول انگریزوں کے آبا و اجداد کو اچھی طرح معلوم تھا۔ انھوں نے کوشش یہ کی تھی کہ مختلف حلقہائے انتخاب یا ان میں سے اکثر میں ایک خصوصیت پیدا کریں، اُنکی خواہش یہ تھی کہ جہاز رانی کی تجارت، اُون کی تجارت، کتاں کی تجارت، ہر ایک کا ایک نمایندہ ہو۔ یعنی، غیر فریقی پارلیمنٹ قبل اس کے کہ وہ قومی فیصلے کا اعلان کرے، اسے یہ جان لینا چاہیئے کہ

قوم کے ہر ایک فریق کا کیا خیال ہے۔ یہی اس کی صحیح وجہ ہے کہ کیوں مزدوری پیشہ طبقات کو نیابت کیوں حصہ دینا چاہیئے۔ کم از کم اتنا تو ضرور ہے کہ اس داخلہ مزید سے جہاں تک پارلیمنٹ کی ہیئت ترکیبی کی ترقی کا سوال ہے یہ دلیل صحیح ہے۔ شہروں کے کاریگروں میں بہت سے خیالات بہت سے احساسات جمع ہو گئے ہیں، ان میں ایک خاص طرح کی ذہنی زندگی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کا یقین یہ ہے کہ اُن کے کچھ اغراض و مقاصد ہیں جن کے متعلق غلط خیالات قائم ہیں، یا ان سے بے پروائی برتی جاتی ہے کہ وہ کچھ باتیں ایسی جانتے ہیں جو دوسرے نہیں جانتے، پارلیمنٹ کے خیالات وہ خیالات نہیں ہیں جو اُن کے ہیں، اُنھیں یہ موقع ملنا چاہیئے کہ وہ پارلیمنٹ کو یقین دلانے کی کوشش کریں، اُن کے خیالات اسی طرح بیان ہونا چاہیئے جیسے دوسرے طبقات کے خیالات بیان ہوتے ہیں۔ ان کے وکیلوں کی باتیں اسی طرح سننا چاہئیں جیسے دوسرے لوگوں کے وکیلوں کی باتیں سنی جاتی ہیں۔ قانون اصلاح کے قبل اس مقصد کے لیئے ایک مسلمہ کل موجود تھی۔ وسٹ منسٹر کارکن اور دوسرے ارکان عام رائے (یا ایسی رایوں سے جو بمنزلہ عام رائے کے ہیں)، منتخب ہوتے تھے۔ یہ ارکان اپنے وقت میں مزدوری پیشہ طبقات کی شکایات و خیالات کو (یا جن امور کو ان کے شکایات و خیالات سمجھا جاتا تھا، اُنھیں) بیان کرتے تھے۔ یہ اسی واحد و غیر مسترخی رائے دہی کا اثر ہے جو ۱۸۳۲ء میں جاری کی گئی ہے کہ دیگر مشکلات کے ساتھ یہ مشکل بھی لاحق ہو گئی ہے۔

جب تک اس قسم کا تغیر نہیں ہوگا، دارالعوام اسی طرح ناقص رہے گا جیسے دارالامرا اُس وقت تھا وہ درست [illegible] نہیں معلوم ہوگا، جب تک امرا خود اپنے ایوان میں نہیں آتے، ہم کاغذ پر تو ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ ایک اچھا نظر ثانی کرنے والا ایوان ہے مگر یہ دشوار ہے کہ اس کتابی بحث کا کوئی اثر بھی ہو سکے۔

بعینہ اسی طرح، جب تک ایک بڑا طبقہ، جو سیاسی مقامات میں مجتمع ہے اور جس کی نسبت یہ معلوم ہے کہ اُس کے کچھ سیاسی خیالات و خواہشات ہیں، وہ پارلیمنٹ میں اپنے ایسے وکیلوں کی مدد سے محروم ہے جن کی طرف انگلیاں اُٹھیں، اور جن پر نگاہیں پڑیں، اس وقت تک ہم کاغذ پر تو یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ انگریزوں کی نیابت کافی ہے مگر دنیا اس کا یقین نہیں کرے گی۔ اٹھارھویں صدی کی ایک مثل یہ ہے کہ

سیاسیات میں "مرئی ظواہر، حقائقِ اعظم "(نہیں)" یہ حجت بالکل بیکار ہے کہ مزدوری پیشہ طبقات کے کچھ شکایات ہی نہیں ہیں یا ان کے لیئے جو کچھ ممکن ہے وہ متوسط طبقات نے کر دیا ہے، اور اس قسم کی صدہا دلیلیں ہیں جن کے دُہرانے کی مجھے ضرورت نہیں ہے کیونکہ، اخبارات انھیں چھاپتے رہتے اور ہم انھیں ازبر بیان کر سکتے ہیں، مگر جب تک کہ "مرئی ظواہر" میں ایک "ظہیر" یہ ہے کہ کاریگروں کے ضروریات کو بیان کرنے والے بدیہی و مستقل نمایندے نہیں ہیں، اس وقت تک "حقیقتِ عظمیٰ" یہی رہیگی کہ بدولی پھیلی رہے۔ تیس برس قبل یہ ثابت کرنا عبث تھا کہ گیٹن اور اولڈ سیرم قابلِ قدر نشستیں ہیں اور وہ اچھے ارکان منتخب کرتی ہیں، ہر شخص کہتا تھا کہ یہ کیسے، وہاں تو آدمی ہی نہیں۔ اسی طرح اب ہر شخص کو کہنا چاہیئے کہ "ہمارا انیابتی طریقہ نامکمل رہیگا کیونکہ ایک بہت بڑے طبقے کی طرف سے گفتگو کرنے کے لیئے کوئی رکن موجود ہی نہیں ہے"۔ غیر آباد حلقہائے انتخاب کی نسبت جو شور مچایا گیا ہے اُس کا جواب یہی تھا کہ اُن کے اختیارات آباد حلقہائے انتخاب کی طرف سے منتقل کر دیے جائیں یہی حال اس شکایت کا ہے کہ کاریگروں کی طرف سے ارکان نہیں ہیں، اسے بند کرنیکا طریقہ یہی ہے کہ انھیں ارکان دید یے جائیں، یعنی نمایندوں کی ایک ایسی جماعت قائم کر دی جائے جس کا انتخاب کاریگروں نے کیا ہو، اور بقول کارلائل جن کا یہ یقین ہو کہ "اگر کوئی چیز مفید ہے تو وہ چیز دستکاری ہے"۔

باب (۶)

تغیرات وزارت

انگلستان کے نظم سلطنت سے متعلق ایک غلطی ایسی ہے جسکا ظہور وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ صورت حالات جس طرح اکثر واقع ہوتی رہتی ہے (اگرچہ اس وقوع میں کوئی نظم و ترتیب نہیں) ان سے بالطبع اس غلطی کی طرف اشارہ ہوتا رہتا ہے اور جس تیقن کے ساتھ یہ واقعات پیش آئے ہیں اُسی تیقن کے ساتھ وہ غلطی بھی پے درپے وقوع پذیر ہوتی رہتی ہے۔ حکومت کے ساتھ پارلیمنٹ اور بالخصوص دار العوام کا تعلق انگریزی نظام سلطنت کی مختص خصوصیت ہے، اور ایک واقعہ جو اکثر وقوع پذیر ہوتا رہتا ہے اُس کی نسبت بھی بعض اشخاص بہت حیرانی میں پڑ جاتے ہیں۔

وہ واقعہ وزارت کا تغیر ہے، تمام کارکنان حکومت ایک ساتھ نکل جاتے ہیں۔ تمام جماعت عاملہ بدل جاتی ہے، یعنی کم از کم اس جماعت کے تمام سرگروہ ایکساتھ بدل جاتے ہیں، اور ایسے تغیر کے متعلق بعض خیال پرست اشخاص ضرور یہ شور مچائیں گے کہ یہ عادت احمقانہ ہے، وہ کہیں گے کہ "کوئی شک نہیں کہ مسٹر گلیڈ اسٹن اور لارڈ رسل نے اصلاح کے متعلق غلطی کی ہو، اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مسٹر گلیڈ اسٹن کو دار العوام میں غصہ آیا ہو مگر ان میں کوئی ایک یا دونوں واقعے حکومت کے تمام عملی صیغوں کے سرگروہوں کے بدلنے کا باعث کیوں ہوئے"۔ ۱۸۵۸ء میں جو واقعہ پیش آیا اس سے زیادہ محال کیا ہو سکتا ہے۔ لارڈ پامرسٹن نے اپنی زندگی بھر میں پہلی مرتبہ ز انداز عادت خودنمائی دکھائی، انھوں نے حماقت آمیز سوالوں کا درشتی کے ساتھ جواب دے دیا، انھوں نے کابینہ میں ایک ایسے امیر کو داخل کر لیا جس کا ایک عورت کے ساتھ ایک بدنام کن مقدمے میں کچھ تعلق تھا۔ انھوں نے یا ان کے وزیر خارجہ نے فرانس کے کسی ایک مراسلے کا جواب مراسلے کے ذریعے سے نہیں دیا بلکہ اپنے سفیر سے زبانی جواب دینے کیلیے

کہہ دیا، اور پھر ان خفیف امور یا زیادہ سے زیادہ ان منفرد غیر انتظامی غلطیوں کی وجہ سے تمام صیغہ ہائے نظم و نسق کے نئے سر گروہ بنائے گئے، مجلس امداد غربا کا نیا افسر، وزارت داخلہ کا نیا افسر، نظارت نافعہ کا نیا افسر مقرر ہوا، یقیناً یہ لغو سی بات معلوم ہوتی ہے اب سوال یہ ہے کہ یہ اعتراض اچھا ہے یا برا، عام الفاظ میں یہ کہنا چاہیئے کہ انگلستان کا اس طرح پر اپنے ارباب حکومت کا بدل دینا قرین عقل ہے یا نہیں۔

اس طریق عمل سے تین بڑی خرابیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اول تو یہ کہ اس سے دفعتہً واحدۃً نئے اور نا آزمودہ کار اشخاص انگلستان کی حکمت عملی کے رہبر و صدر بن جاتے ہیں۔ کچھ تھوڑے ہی زمانہ پہلے لارڈ کرینبورن[1] کے ذہن میں جسطرح یہ خیال نہ رہا ہوگا کہ وہ کبھی دلال بن جائیں گے، اسی طرح اُن کے ذہن میں یہ خیال بھی نہ آیا ہوگا کہ اب وہ وزیر ہند ہوا چاہتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی معاملات کے متعلق توجہ نہیں کی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اُسے چلالے جائیں گے کیونکہ وہ ایک ایسے قابل تعلیم یافتہ شخص ہیں کہ وہ ہر ایک کام کو چلا سکتے ہیں، مگر یہ معاملات ایسے نہیں ہیں کہ اُن کے دل و دماغ میں بسے ہوئے ہوں۔ نہ یہ ایسے مسائل ہیں جن پر وہ غور و خوض کے عادی رہے ہوں، نہ یہ ایسے امور ہیں جن پر وہ بالطبع غور کرتے ہوں اور یہ غور و فکر اُن کے لیئے لابدی ہو۔ لیکن چونکہ لارڈ رسل اور مسٹر گلیڈاسٹن نے "اصلاح" کے متعلق دار العوام کو رضامند نہ رکھا صرف اسلیئے لارڈ کرینبورن وزارت ہند پر متمکن کر دیئے گئے۔ ایک ایسا شخص جسے معاملات ہند کا مطلق کوئی تجربہ نہ ہو وہ تمام شہنشاہی ہند پر حکمرانی کر رہا ہے، اور اگر انگلستان کے تمام اعلےٰ عہدہ دار ایک ساتھ بدل جائیں تو نہایت کثرت کے ساتھ ایسا ہونا لازمی ہے۔ اگر ایک ساتھ بیس عہدے خالی ہو جائیں تو شاید کبھی بھی ایسا نہ ہوگا کہ بیس آزمودہ کار قابل و ہوشیار اشخاص ان عہدوں کے لیئے تیار مل جائیں۔ کسی جماعت حکمراں کے تیار کرنے کی دشواری چینیوں کی چیستان کے جوڑ ملانے کی

[1] اب وہ لارڈ سالسبری ہیں، جسوقت یہ لکھا گیا تھا اُسوقت وہ وزیر ہند تھے، حاشیہ طبع دوم۔

مشکل سے بہت کچھ مشابہ ہے، آپ جس جگہ میں جو چیز دیکھنا چاہتے ہیں وہ جگہ ان کے مناسب حال نہیں ہوتی، اور کسی وزارت کی ترتیب درست کرنا کسی چیستان کے جوڑ بٹھانے سے زیادہ دشوار کام ہے، کیونکہ جن وزرا کو جن جگہوں پر نصب کرنا منظور ہے، وہ اس پر معترض ہو سکتے ہیں اور چیستان کے اجزا ایسا نہیں کر سکتے۔ ۱۸۴۵ء میں لارڈ جان رسل کی مجوزہ حکومت میں اگر لارڈ پامرسٹن وزیر خارجہ ہوتے تو لارڈ گرے اس میں شامل نہ ہوتے۔ لیکن چونکہ لارڈ پامرسٹن بہر نوع وزیر خارجہ ہوتے اس لیئے یہ حکومت وجود میں نہ آئی۔ ایسے واقعات کہ صرف ایک شخص کے انکار کر دینے سے کسی حکومت کا قیام رک گیا ہو، واقعات نادرہ میں سے ہیں، مگر ایسے انکار کو موثر بنانے کے لیئے ایک ساتھ واقع ہونے والے بہت سے حالات کا ہونا ضروری ہے، البتہ ایسے واقعات بہت عام ہیں کہ متعدد انکاروں سے کسی حکومت میں دقت لاحق ہو جائے یا وہ بالکل ہی غارت ہو جائے اور ایسا تو تقریبًا کبھی بھی نہیں ہوتا کہ وزارت کا مرتب کرنے والا عہدوں پر اُن لوگوں کو نصب کر سکے جنھیں وہ پسند کرتا ہو، خواہان منصب اشخاص میں کچھ لوگ ہمیشہ ایسے ہوتے ہیں جن کی نخوت، جن کی تمنائیں، جن کی ضد اس قدر بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ جس جگہ انھیں جانا چاہیئے اسی جگہ وہ نہیں جاتے۔

ماسوا اس کے، اسی طریق سے نہ صرف یہ ہوتا ہے کہ نئے وزرا کو وقوف نہیں حاصل ہوتا بلکہ اس کی وجہ سے موجود الوقت وزرا بھی لاپروا رہتے ہیں، اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہو کہ ایسے واقعات کی وجہ سے جن پر اُسے کوئی قابو نہیں حاصل ہے، ایسی غلطیوں کی وجہ سے جن میں اس کی کوئی شرکت نہیں ہے، رائے کے ایسے تغیرات کی وجہ سے جن کا تعلق اسباب و علل کے دوسرے نتائج سے ہے، اُسے درمیان ہی میں اپنے کام سے دست کش ہونا پڑیگا (اور بہت اغلب ہے کہ وہ پھر کبھی اس کام پر واپس نہ آئے۔) تو اس حالت میں اُس شخص کو اپنے کام سے جو دلچسپی ہونا چاہیئے وہ نہیں ہو سکتی۔ کوئی نیا شخص جو تازہ بتازہ کسی عہدے پر مقرر ہو، اُسے چاہیئے کہ اپنے کام کے سمجھنے میں ہمہ تن غرق ہو جائے مگر واقعہ یہ ہے کہ انگلستان میں اس طرح دل و جان سے اپنے کام میں مستغرق ہو جانے کے سامان

بالکل ہی موجود نہیں ہیں۔ اس کے فریق اور حالات سیاسیہ کی آخری موج نے اسے اس جگہ پر لا ڈالا ہے اور ممکن ہے کہ دوسری موج اسے وہاں سے بہا لے جائے۔ ان غیر موزوں حالات میں بھی نوعمر اور پُرشوق اشخاص اپنے عہدے کے کام میں گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں مگر اکثر اشخاص اور بالخصوص معمر اشخاص شاید ہی ایسا کرتے ہوں۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ بہت سے گرم و سرد زمانہ چشیدہ وزرا اپنے عہدے کے کاموں سے زیادہ ان نیرنگیوں کے درپے رہتے ہیں، جو انھیں بناتی اور بگاڑتی ہیں۔

آخری امر یہ ہے کہ وزرا کے فوری تغیر سے بہت آسانی کے ساتھ ملک کی حکمت عملی میں ضرر رساں تغیر واقع ہو سکتا ہے۔ کاروبار کے اکثر بلکہ تقریباً تمام ہی معاملات میں ایک اوسط درجے کی قابلیت کے شخص کا علی الاتصال قائم رہنا اعلیٰ درجے کی قابلیت والوں کی بے ہنگام آمد و شد سے بہتر ہے، مثلاً اب اس زمانے میں کہ فنون سائنس کی ترقی سے آلات جنگ میں انقلاب ہو رہا ہے۔ بری و بحری جنگ کی تیاریوں کے سرگروہ اعلیٰ کا جلد جلد بدلتے رہنا نہایت گراں قیمت اور نہایت ہی مضر ہے نئے ایجادوں کا لائق و قابل انتخاب کرنے والا شخص غالباً برسوں تجربہ حاصل کرنے کے بعد کسی حد تک معقول رائے پر پہنچ سکیگا مستقل و باقاعدہ تجربہ کرنے والے قابل اشخاص کی فطرت میں یہ بات داخل ہوتی ہے کہ وہ اس قسم کے مشکلات کو اگر بالکل معدوم نہ کر سکیں تو اُسے کم ہی کر دیں۔ مگر افسران اعلیٰ کے جلد جلد بدلتے رہنے سے اس قسم کی سہولت میسر نہیں آ سکتی۔ یہ لوگ دوسرے کے تجربے سے کچھ سیکھتے نہیں ہیں۔ اگر ایسا ہی ہو تو آپ یہ بھی توقع کر سکتے ہیں کہ ایک خلیفۂ مکتب، سابق کے خلیفۂ مکتب کے تجربے سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ برسوں کے کام کا سب سے زیادہ گراں قدر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہن میں ایک نازک ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جو از خود بلا ارادہ غلطیوں کا احساس کر لیتا ہے۔ مگر یہ ملکہ ذاتی تجربے کی ایک ایسی نعمت ہے جسے ایک سے دوسرے کی طرف منتقل نہیں کر سکتے، اور کوئی جانے والا وزیر اسے اپنے جانشین کی طرف ویسے ہی منتقل نہیں کر سکتا، جیسے کہ بڑا بھائی اُسے چھوٹے بھائی کی طرف منتقل کر سکے غرض اس طرح یہ وزیروں کے جلد جلد بدلتے رہنے سے ایک طرح کی

متلون و ناقابل ترتیب حکمت عملی پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ بہت ہی ہیبت ناک دلائل ہیں، مگر میرے خیال میں ان دلائل کے جواب میں یا ان نقائص کے کم کرنے کے طور پر چار باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ ان پر ذرا سا غور کرنے سے یہ واضح ہو جائیگا کہ پارلیمنٹی حکومت کے لیئے وزیروں کا اس قسم کا تغیر لازمی و لابدی ہے، تمام انتخابی حکومتوں میں اس قسم کی کوئی نہ کوئی صورت واقع ہو کر رہیگی۔ اور صدارتی حکومتوں میں تو اس سے بدتر صورتیں وقوع پذیر ہوں گی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ طریقہ عمدہ نظم و نسق کے خلاف واقع ہو بلکہ اس کے برعکس، اس قسم کی کوئی نہ کوئی طرز اچھے نظم و نسق کی شرائط اولیہ میں سے ہے۔ انگریزی نظم و نسق کی صریحی خرابیاں پارلیمنٹی حکومت کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ انگلستان کی سیاسی و معاشری حالت اور اطراف و جوانب کے شدید نقائص کا نتیجہ ہیں۔ اسے ایک لفظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ یہ خرابیاں موجودہ حالات کی وجہ سے نہیں پیدا ہوتیں بلکہ ان امور کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں جو ہمارے ادارات میں مفقود ہیں۔

پہلے مرحلے کے متعلق یہ کہنا ہے کہ جو لوگ وزرا کے انتخاب کو پارلیمنٹ سے آزاد کرنا چاہتے ہیں، انھوں نے اس امر پر کما حقہ غور ہی نہیں کیا ہے کہ پارلیمنٹ ہے کیا شئے، پارلیمنٹ اگر کچھ ہے تو یہی کہ وہ کچھ سست سے اشخاص کا ایک بڑا جلسہ ہے۔ آپ جس قدر زیادہ اُسے اختیار دیتے جائیں گے، اُسی نسبت سے وہ ہر چیز کے متعلق دریافت کرے گی۔ ہر چیز کو طے کرے گی اور ہر موقع بے موقع دخل در معقولات کرتی رہیگی۔ ایک معمولی مطلق العنان حکومت میں خود سر بادشاہ کے اختیارات اُسکی جسمانی قابلیت اور اُس کے مشاغل عیش و عشرت سے محدود ہوتے ہیں۔ وہ صرف ایک ذات واحد ہے، اس کے دن کے بارہ ہی گھنٹے ہوتے ہیں، اور وہ (حکومت کے) بے کیف کام میں ان بارہ گھنٹوں کے ایک قلیل حصے سے زائد صرف کرنے پر مائل نہیں ہوتا۔ باقی حصص کو وہ دربار، حرم یا بزم کیلیئے محفوظ رکھتا ہے۔ وہ دنیا کا سرتاج ہوتا ہے۔ اور دنیا کی تمام مسرتیں اُس کے سامنے دست بستہ حاضر رہتی ہیں۔ اکثر و بیشتر یہ ہے کہ سیاسی معاملات کا ایک بہت ہی قلیل حصہ ایسا ہوتا ہے جس کے سمجھنے کی ضرور اسے فکر ہوتی ہے۔ اور

زیادہ حصہ ایسا ہوتا ہے جس کی نسبت وہ یہ جانتا ہے کہ وہ انھیں کبھی سمجھ نہ سکیگا۔ (اور یہ تیز فہمی نسل شاہی کا ایک ادراک خاص ہے)۔ مگر پارلیمنٹ کثیر التعداد افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ جو کسی جہت سے بھی دنیا کے سرتاج نہیں ہوتے۔ جب آپ ایک مادی وغالب پارلیمنٹ قائم کرتے ہیں، تو آپ ملک کی حکمرانی ایک ایسے مطلق العنان کو حوالے کرتے ہیں جسے غیر محدود وقت میسر ہے، جس کے عجب ونخوت کی کوئی حد نہیں ہے، جسے غیر محدود وسعت نظر حاصل ہے، یا کم از کم یہ کہ اسے ایسی وسعت نظر حاصل ہونے کا یقین ہے، اُس کی مسرت کام اور اُسکی زندگی عمل ہے۔ پارلیمنٹ کے عجائب وغرائب کی کوئی حد نہیں ہے۔ سر رابرٹ پیل نے ایک مرتبہ یہ چاہا کہ کسی ایک رات میں اُن سے جس قدر سوالات ہوئے ہیں اُن کی ایک فرد تیار کر لی جائے، معلوم ہوا کہ ان سوالات کا تعلق کم وبیش پچاس معاملات سے تھا، اور ہزار معاملے اور بھی ایسے تھے جو بسہل جحت ان میں بڑھائے جاسکتے تھے۔ جوں ہی زید سے نجات ملتی ہے فوراً ہی عمر کا سلسلۂ سوالات شروع ہو جاتا ہے۔ بعض اشخاص اس وجہ سے استفسار کرتے ہیں کہ انھیں حصول معلومات کا واقعی شوق ہوتا ہے یا یہ کہ جس امر کے متعلق وہ سوال کرتے ہیں ان کی اصلاح وترقی کی اُنھیں واقعی خواہش ہوتی ہے، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنا نام اخباروں میں دیکھنا چاہتے ہیں، کچھ لوگ اپنے باخبر حلقۂ انتخاب پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ وہ مستعد کار رہتے ہیں، بعض آگے بڑھنا اور حکومت میں کوئی جگہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، بعض ایسے چھوٹے چھوٹے خیالات کے جمع ہو جانے کے باعث سوال کرتے ہیں جن کا تجربہ وہ خود نہیں کر سکتے، یا اس وجہ سے سوال کرتے ہیں کہ اُنھیں کچھ نہ کچھ پوچھنے کی عادت ہوتی ہے۔ ان سب سوالات کا مناسب جواب دینا ضروری ہے۔ یہ کہا جاتا کہ ڈاربی گریفیتھ نے لارڈ پامرسٹن کی پہلی حکومت کو برباد کر دیا، اور اس میں شک نہیں کہ اپنی فتح کے نشۂ مستی میں وزیر موصوف نے جس مسرت میز تمرد کے ساتھ متین وسنجیدہ اشخاص کو جواب دیا اس سے اُس کے پارلیمنٹی اقتدار کو صدمہ پہنچ گیا۔ ایک شے ایسی ہے جس کے ساتھ سبک برتاؤ کو کوئی گوارا نہیں کریگا، اور وہ اپنی ذات خاص ہے۔ اسی طرح ایک شے

ایسی بھی ہے جس کی تخفیف یا تذلیل کو کوئی صاحب اقتدار جمیعت کبھی روا نہ رکھے گی اور وہ خود اسی جمیعت کا اقتدار ہے۔ موجود الوقت وزیر کو نظم و نسق کی تمام شاخوں کا محاسبہ پارلیمنٹ میں دینا ہوگا، اسے یہ بتانا ہوگا کہ وزارت جو کچھ کرتی ہے وہ کیوں کرتی ہے اور جو نہیں کرتی وہ کیوں نہیں کرتی۔

سرکاری صیغے جن امور سے سب سے زیادہ ہراساں رہتے ہیں وہ صرف گاہ بگاہ کے استفسار پر ہی ختم نہیں ہو جاتے، ہو سکتا ہے کہ پچاس ارکان کسی ایک خاص روش کے لیے زور دے رہے ہوں جس کا اثر کسی صیغے پر پڑتا ہو اور دوسرے پچاس ارکان کسی دوسری روش کے لیے سرگرم ہوں۔ اور وہ سب لوگ اس صیغے کے اجرائے کار کو اپنے درمیان میں تقسیم کر لیں، اس کے پسندیدہ اغراض کو تباہ کر ڈالیں اور دونوں جانب کی اغراض میں سے کسی ایک کے اغراض پر بھی بالتسلسل اُسے عمل پیرا نہ ہونے دیں۔ یہ طریق کار بہت ہی سادہ ہے۔ ہر ایک محکمہ وقتاً فوقتاً یہ سمجھتا ہے کہ وہی گرداب بلا میں پھنس گیا ہے، کوئی ظاہری اور ممکن ہے کہ کوئی حقیقی غلطی، عوام کو نظر آجائے اور بس وہ معاندیار لیمنٹی اشخاص جو اس محکمے پر اپنا اثر ڈالنا چاہتے ہیں، اس سے چمٹ جاتے ہیں، وہ تقریریں کرنے، کاغذات کے لیے تحریکیں پیش کرنے اور اعداد و شمار جمع کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ اعلان کرنے لگتے ہیں کہ وہ یہ محکمہ جس روش پر چل رہا ہے یہ روش کسی دوسرے ملک میں ممکن نہیں ہے۔ یہ ازمنۂ وسطیٰ کی کارروائی ہے، اس میں روپے کا بے اندازہ صرف اور جانوں کا اتلاف ہوتا ہے، امریکہ میں اس کے خلاف عمل ہوتا ہے، پرشیا میں اس کے خلاف عمل ہوتا ہے۔ انکے عقب میں اخبارات اپنے طرز عمل کے اعتبار سے چل نکلتے ہیں۔ انتظامی لغزشوں کی یہ نکتہ چینیاں، عوام کی مسرت کا باعث ہوتی ہیں۔ ان کے متعلق مضامین کا لکھنا، ان کا پڑھنا، اُن پر گفتگو کرنا، سب آسان ہوتا ہے۔ وہ بنی نوع انسان کی خودنمائی کے لیے موجب مسرت ہوتے ہیں۔ ہم جب ان مضامین کو پڑھتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ وہ خدا کا شکر ہے کہ میں اس جیسا شخص نہیں ہوں، میں نے کریمیا میں سبز کافی نہیں بھیجی تھی۔ وہ میں نے

عام بندوقوں کے لیئے خاص قسم کے بڑے کارتوس یا توڑہ دار بندوقوں کے لیئے عام قسم کے کارتوس نہیں بھیجے، وہ میں تو روپیہ پیدا کرتا ہوں۔ اور وہ ناکارہ وزیر سرکاری روپے کو برباد کرتا ہے " ادہر محکمے کی حمایت کا حال یہ ہوتا ہے کہ نہ کوئی اس کی پروا کرتا ہے نہ اسے پڑھتا ہے۔ پہلی مرتبہ کان میں پڑنے پر تو ضرور یہ خیال صحیح نہ معلوم ہوگا۔ فریق مخالف کو اعتراض کا موقع منتخب کرنے کے لیئے غیر محدود وسعت حاصل ہے۔ اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس غرض کے لیے کوئی ایسا واقعہ پسند کرے جس میں بظاہر حالات راستی محکمہ کی جانب ہو۔ جس واقعے کا سب سے زیادہ اثر پڑے گا وہ ہمیشہ کوئی اس قسم کا واقعہ ہوگا کہ کوئی نہ کوئی قابل مذمت کام ہوا ہے۔ یا فلاں فلاں اشخاص مر گئے ہیں، یہ یا وہ توپ کام نہیں دیتی، یہ یا وہ جہاز سفر نہیں کرتا۔ خوش گپی کے لیئے جتنی تحریریں شایع ہوتی ہیں، سب مخالفانہ پہلو لیئے ہوئے ہوتی ہیں، اور تعریف جو کچھ بھی ہوتی ہے، ہی سست اور دھیمی ہوتی ہے۔ اگر پارلیمنٹ میں اس قسم کے محکمے کا کوئی باضابطہ سرکاری حمایت کنندہ نہو تو پھر اس سے زیادہ بے بس کوئی شے نہیں ہو سکتی۔ دار العوام کی بھڑیں اُس سے چمٹ جائیں گی، وہ دیکھیں گی کہ انھیں نیش زنی کے لیئے ایک شے مل گئی ہے، اور وہ خود مامون و مصئون ہیں۔ کیونکہ وہ شے اس نیش زنی کے جواب میں اُنھیں ڈنک نہیں مار سکتی۔ شکایت کا چھوٹا سا تخم جڑ پکڑ لیتا ہے تا آنکہ بڑھتے بڑھتے ایک پوری فصل تیار ہوجاتی ہے۔ فوراً ہی موجودالوقت وزیر کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، وہ نظم و نسق کا افسر اعلےٰ ہوتا ہے اور اگر غلطیاں واقع ہوں، تو اس پر لازم ہے کہ اُن کی درستی کرے۔ فریق مخالف کا سرگروہ یہ کہتا ہے کہ " میں اس معاملے کو معزز و محتشم وزیر خزانہ پر چھوڑتا ہوں، وہ کام کرنیوالے شخص ہیں۔ اُنھوں نے جو آل کار سوچا ہوگا اس سے مجھے اتفاق نہیں ہے مگر وہ وسائل و ذرائع کے اختیار کرنے پر کلیتہً قادر ہیں، وہ جو کرنا چاہتے ہیں وہی کرتے ہیں، پس میں اُن سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ دیکھیں کہ آیا یہ بے وجہ کی غلطیاں یہ جاہلانہ ناقابلیت ملکی خدمات میں روا رکھنے کے قابل ہیں یا نہیں؟ اگر میں محکمے ہی کے کاغذات سے دکھاؤں تو مجھے امید ہے کہ معزز مشار الیہ میری

گفتگو کو گوش توجہ سے سنیں گے،، وغیرہ وغیرہ۔ ایسی حالت میں وزیر کو کیا کرنا چاہیئے، اُس نے اس معاملے کو کبھی سنا نہیں اُسے اسکی کچھ ایسی فکر بھی نہیں ہے۔ حکومت کے بعض مدبرین کو اس محکمے کی مخالفت میں دلچسپی ہے، ایک موقر شخص جسے عقلمند سمجھا جاتا ہے وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہا ہے کہ ‌"بس اب حد ہو گئی،، وزیر خزانہ، اس سے یہ کہتا ہے کہ دارالعوام بے چین ہے، بہت سے لوگ متزلزل ہو رہے ہیں، زید نے کل یہ کہا کہ اسے مسلسل چار راتیں ایسی ہی دلدل میں گزارنا پڑی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ خود میرا خیال یہ ہے کہ اس محکمے میں کچھ ڈھیل سی پڑی ہوئی ہے۔ شاید کسی قسم تحقیقات بہتر ہوگی،، وغیرہ وغیرہ، اس پر وزیر اعظم اُٹھتا اور کہتا ہے کہ ‌"ملکہ معظمہ کے ارکان حکومت نے اس نہایت ہی اہم معاملے پر بڑے ہی غور و فکر سے کام لیا ہے، وہ اس کہنے کے لیئے تیار نہیں ہیں کہ ایسے پیچیدہ معاملے میں محکمہ غلطی سے کلیۃً بری ہے، یہ ضرور ہے کہ اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے میں (وزیر اعظم) ان تمام بیانات سے اتفاق نہیں کرتا، یہ صاف ظاہر ہے کہ بہت سے پیش کردہ الزامات خود ایک دوسرے کے نقیض ہیں، اگر زید سہ شنبہ کے روز سبز کافی کھانے کی وجہ سے مر چکا ہے تو یہ صاف ظاہر ہے کہ اس کے بعد والے پنجشنبہ کو اُسے ناکافی طبی امداد کی شکایت نہیں ہو سکتی ہے۔ بہر حال ایک ایسے پیچیدہ معاملے میں جو عام تجربے سے اس قدر بعید ہو میں کوئی قطعی رائے نہیں دوں گا اور اگر معزز رکن کو اس امر سے اطمینان ہو سکے کہ اس معاملے کی تفتیش اس ایوان کی ایک ذیلی مجلس کے ذریعے سے ہو تو میں (وزیر اعظم) اس تجویز سے موافقت کرنے کے لیئے تیار ہوں "

ممکن ہے کہ دور افتادہ محکمہ وزارت پر اعتماد نہ کرکے اپنا کوئی دوست تیار کرے، مگر یہ اُس کی بڑی خوش قسمتی ہوگی اگر اسے اتفاق سے کوئی موقع شناس دوست مل جائے۔ اس قسم کے معاملات میں پڑنے کے لیئے جو لوگ سب سے زیادہ تیار رہتے ہیں وہ فیاض طبع نو آموز ہوتے ہیں۔ وہ نہایت ہی نیک ارادہ، نہایت ہی متین، نہایت ہی معزز ہوتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی کسیقدر سست بھی ہوتے ہیں ان کے الفاظ اچھے ہوتے ہیں مگر بندش الفاظ سے جو دلائل منتج ہوتے ہیں وہ کمزور ہوتے ہیں۔ اس قسم کا شخص دارالعوام کے

آزمودہ کاروں کا مدمقابل نہیں ہوسکتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے، یہ اُس کی بخیہ اُدھیڑ کر رکھ دیتے ہیں، یہ لوگ یہ ظاہر کرتے یا کہتے ہیں کہ اس شخص کو واقعات کے متعلق غلطی ہوئی ہے۔ اس پر وہ شخص جھلایا ہوا اُٹھتا ہے اور بجائے اس کے کہ اپنے بیان کی تشریح کرے۔ اپنی زود کاری میں غلطیاں کرجاتا ہے، صحیح کاغذ اسے نہیں ملتا، وہ پہلے گرجاتا ہے پھر گھبرا جاتا ہے، اس کے بعد اُس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اور آخر کار بیٹھ جاتا ہے، غالباً وہ دار العوام پر یہ اثر چھوڑ جاتا ہے کہ محکمے کے دوستوں کو شکست ہوگئی، اور دنیا جس وقت خواب سے بیدار ہوتی ہے ٹائمز اُسے یہی راگ سناتا ہے۔

بعض ارباب فکر نے بالطبع یہ خیال پیش کیا ہے کہ افسران محکمہ جات کو اپنی سرکاری حیثیت سے دار العوام میں تقریر کا حق ہونا چاہیئے۔ مگر اس طریقے کی جب جانچ کی گئی تو وہ اس جانچ میں پورا نہیں اُترتا۔ گیز و خود اپنے تجربے سے کہتا ہے کہ اس قسم کا طریقہ کارآمد نہیں ہے۔ ایک عظیم الشان عمومی جمعیت کی ایک مخصوص خصوصیت ہوتی ہے، اس کے خاص امتیازات، میلانات و خیالات ہوتے ہیں، اور ان خیالات میں سے ایک خیال یہ بھی ہوتا ہے کہ خود اُس کے ارکان، جنھیں وہ روزانہ دیکھتی ہے، جن کے اوصاف کو وہ جانتی ہے، جن کی طبیعتوں کا وہ اندازہ کرسکتی ہے، اُنھیں پر وہ سب سے اعتماد کرسکتی ہے ایک باہر سے آئے ہوئے دفتردار کی تقریر اُس کے لیئے ایک ناموزوں سی شے ہے۔ یہ مقرر ایک بیرونی شخص ہوگا۔ وہ شک و شبہہ کے ساتھ تقریر کرے گا، اور اُس کی تقریر کے ساتھ اُس کا کوئی اعزاز و منصب نہ ہوگا، اکثر تو تقریر کے وقت اس کی حالت ایک صید مجروح کی سی ہوگی، دار العوام کے تمام گیدڑ اس پر ٹوٹ پڑیں گے، اُس کا امتحان شروع ہوجائیگا۔ اُسے سوالات کے جواب دینا ہوں گے، اُس سے اعداد و شمار دریافت کیئے جائیں گے اور پھر اُن کی تفصیلات پر اُس سے جرح ہوگی، اُس نے جو کچھ کہا ہوگا اُس کا تمام اثر اس قال اقول کے اندر انبار کے نیچے دب جائیگا۔ علاوہ ازیں شاذ و نادر ہی ایسا ہوگا کہ اس قسم کا شخص، اعلی قابلیت کے ساتھ تقریر

کر سکے، وہ ایک مسل خواں کی طرح سے گفتگو کرے گا۔ اُس کے عادات و اطوار دفتر
کے پر سکون فضا میں قائم ہوئے ہوں گے۔ وہ سرخ فیتے، سکوت اور ماتحتوں کی عزت و
وقعت کا عادی ہوگا۔ بہت مشکل ہے کہ اس قسم کا آدمی ایک عام جلسے کے شور و شغب
کے سامنے ٹھیر سکے۔ وہ بدحواس ہو جائیگا اور جو کچھ نہ کہنا چاہیئے کہہ ڈالے گا۔
وہ لال پیلا ہو جائیگا، وہ سمجھے گا کہ وہ ایک طرح کا مجرم ہے۔ اُسے مودب ماتحتوں
کے خوشامدانہ ادب و احترام کے عادی ہونے کے بعد شور و شغب اور ہنگامے
سے سابقہ پڑیگا۔ اور اُس پر پھبتیاں اُڑیں گی۔ پریشان ہو کر وہ گھبرا جائیگا۔ دارالعوام کو
جیسی کراہت اُس سے ہوگی ویسی ہی طبعی نفرت اُسے دارالعوام سے ہو جائیگی۔ وہ
ایک ناقابل مقرر ہوگا اور اُسے مخالف سامعین کے سامنے تقریر کرنا پڑیگی۔

اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک بیرونی عہدہ دار جو پارلیمنٹ کے سامنے
تقریر کر رہا ہو وہ صرف اپنے عمدہ دلائل ہی سے پارلیمنٹ کے ارکان پر اثرانداز ہو سکتا
ہے۔ ان دلائل کی پشت پناہی کے لیئے اُس کے پاس اپنے موافق آرا کا وزن
نہیں ہوگا۔ یہ یقینی ہے کہ اُس پر حملہ کرنے والوں کی ایک مستعد کار قلیل جماعت یا
دوسرے لوگوں کے ساتھ اُس کی مسلسل جنگ جاری رہیگی۔ اہم و جدید معاملات
کے متعلق کسی محکمے کی اصلاح و ترقی کا طبعی طریقہ، محکمے سے باہر کے تجاویز ہیں کیسی
محکمے کے بدترین دشمن بظاہر درست نظر آنے والی غلطیاں ہیں جو نہایت بدیہی واقعات
سے ذہن میں آجاتی ہیں، اور جنھیں صرف نیم عیاں واقعات غلط ثابت کرتے ہیں۔
اچھے اور بُرے دونوں خیالات کے متعلق یہ یقینی ہے کہ اُن کے حامی پہلے اخبارات
میں پیدا ہوں گے اور اس کے بعد پارلیمنٹ میں، ان خیالات کے مقابلے میں
ایک مستقل دفتردار کو صرف دلائل سے کام لینا پڑیگا۔ پارلیمنٹی حکومت کا سرگروہ
یعنی وزیر، اس کی پروا نہ کریگا۔ وزیر آپ ہی آپ ان خیالات کا اظہار کرے گا کہ
یہ مستقل الخدمت اصحاب، خود اپنی فکر کریں، میں ان کے لیئے پریشانی میں نہیں
پڑ سکتا، میری طرف صرف تھوڑی کثرت رائے ہے اور وہ بھی بہت متزلزل ہے، جن
لوگوں کو میں نے مقرر نہیں کیا ہے ان کی خاطر سے میں اپنے دشمن نہیں پیدا کرنا
چاہتا، انھوں نے میرے لیئے کچھ نہیں کیا۔ اور میں ان کے لیئے کچھ نہیں کر سکتا۔"

اگر یہ مستقل دفتر دار اس سے خواہانِ امداد ہوگا تو وہ مزین، مطلا عبارت میں یہ سامعہ نوازی کریگا کہ "اگر یہ محکمہ یہ ثابت کر دکھائے کہ اس کا سابقہ انتظام مفاد عامہ کے حسب ضرورت رہا ہے اور پارلیمنٹ کو اس سے اطمینان ہوجائے، تو یقیناً مجھے زیادہ کوئی اس محکمے کا رہین احسان نہ ہوگا، مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ میں دوشنبہ کے دن پارلیمنٹ میں موجود بھی ہوں گا یا نہیں، لیکن اگر اپنی خوش قسمتی سے میں وہاں ہوا تو میں نہایت ہی توجہ کے ساتھ آپ کے سرکاری بیان کو سنوں گا"۔ غرض اس مستقل ملازم سرکاری کی حالت یہ ہوگی کہ ذہین اشخاص اُس کے چٹکیاں لیں گے، شریر الطبع اشخاص اُس کی درگت بنائیں گے۔ اور پارلیمنٹ کے جدت طراز اُسے ہلاک کر کے چھوڑیں گے۔

سرکاری محکمہ جات پارلیمنٹ کی غیر منقطع دست درازی سے اسی طرح بچے ہوئے ہیں اور صرف اسی طرح بچ سکتے ہیں، کہ اُن کے لئے کوئی ایسا پارلیمنٹی سرگروہ مقرر ہوجائے جو موجود الوقت وزارت اور پارلیمنٹ کے حکمراں فریق کیساتھ گہرے تعلقات سے وابستہ ہو، پارلیمنٹی سرگروہ ایک محافظ کل ہے۔ وہ خود اور اُس کے وہ احباب جنھیں وہ اپنے ساتھ لاتا ہے، دارالعوام اور ملک کے دخل درمعقولات کرنے والوں اور ہاہو مچانے والوں کے مقابلے میں محکمے کے لئے سپر بن جاتے ہیں۔ جب تک یہ صورت ہو کہ کسی دفتر کی روش ہر دو ایوانہائے پارلیمنٹ سے کسی ایک ایوان کی اتفاقیہ رایوں کے بموجب ہمہ وقت بدلی جاسکتی ہے، اس وقت تک کسی روش کے مسلسل قائم رہنے کی کوئی ضمانت نہیں ہوسکتی غالباً انگلستان کی توپیں اور اُس کے جہاز اسوقت بہت اچھی حالت میں نہیں ہیں، لیکن اگر ایسا ہو کہ کسی خاص قسم کی توپ کے تیس چالیس حامی پارلیمنٹ میں کوئی تحریک پیش کر کے محکمے کو زک دے سکیں اور اپنے مجوزہ جہاز یا مجوزہ توپیں رائج کرا دیں تو حالت اور بد سے بدتر ہوجائے گی۔ اگر چالیس پچاس ارکان اس قومی دستور سے اپنے مہملات کے پورے کرنے میں کامیاب ہوجائیں تو پھر بہت جلد ایسی کمپنیاں جیسے "بلیک بریچ آرڈنیس کمپنی" اور "ایڈمینٹائن شپ کمپنی" کے نمایندوں کو پارلیمنٹ میں جگہ مل جائے مگر الحال محکموں کے پارلیمنٹی افسر اعلیٰ کی وجہ سے یہ نتیجہ

پیدا نہیں ہونے پاتا۔ فریق مخالف جوں ہی حملے کا آغاز کرتا ہے وہ اپنی موافقت کے ذرائع پر نظر دوڑانے لگتا ہے، وہ اس مضمون کا مطالعہ کرتا ہے، اپنے دلائل مرتب کرتا ہے۔ اعداد و شمار کے طومار باندھ دیتا ہے، جن سے اُسے یہ امید ہوتی ہے کہ اُن کا کوئی اثر پڑیگا۔ دار العوام اُسے اچھی طرح جانتا بلکہ غالباً اُسے بہت پسند کرتا ہے۔ کم از کم اُس کی بات پر توجہ تو ضرور ہی کرتا ہے، وہ ان معدودے چند مقرروں میں سے ہوتا ہے جنکی تقریریں ارکان دار العوام سنتے رہتے اور ان پر لحاظ کرتے ہیں۔ اُسے یہ یقین ہے کہ اُس کی بات بالضرور سنی جائے گی، اور اسے یہ بھی یقین ہے کہ اس معاملے کی بہتر سے بہتر مدافعت جو وہ کرسکتا ہے کریگا۔ پھر اپنی تقریر مرتب کر لینے کے بعد وہ وزیر خزانہ کے پاس پہنچتا ہے اور چپکے سے یہ کہتا ہے کہ آپ جانتے ہوں گے ان لوگوں نے سہ شنبہ کو میرے خلاف ایک تحریک پیش کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنے لوگوں کو وہاں لاویں گے، بہتوں کے سروں پر سودا سوار ہے، اور یہ لوگ اگرچہ ایک ذرہ برابر بھی ایک دوسرے سے اتفاق نہیں کرتے، مگر اس محکمے کی مخالفت میں سب یکزبان ہو گئے ہیں وہ سب تحقیقات کے لیے رائے دیں گے" وزیر اس کے جواب میں کہتا ہے۔ "وہ آپ کہتے ہیں، سہ شنبہ؟ (کاغذ دیکھ کر) نہیں، میرے خیال میں سہ شنبہ کو یہ تحریک نہ پیش ہوگی، اُس روز تو ہگنز، تعلیمات کے متعلق بحث کرے گا، اور وہ بہت وقت لگا دیگا، بہر حال انتظام ہو جائیگا" وزیر کے پاس سے نکل کر وہ اِدھر اُدھر دوسروں کے پاس پہنچتا ہے اور کسی سے کچھ کسی سے کچھ کہدیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب محکمے کے مخالف تحریک پیش ہوتی ہے تو خزانے کے بنچ (یعنی حکام عاملہ) کے عقب میں باوقار نشین اصحاب کی صف کی صف جمی ہوتی رہتی ہے۔ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی ترقی کن شخص جو سب سے بے تعلق سامنے کی طرف نیچے کی کسی بنچ پر بیٹھا ہوتا ہے، اسی معاملے کی موافقت کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ محکمے کو تسلیس رایوں سے کامیابی ہو جاتی ہے اور کام اپنی روش پر چلتا رہتا ہے۔

یہ مقابلہ کوئی خیالی تصویر نہیں ہے۔ کسی بے واسطہ وغیر مصئون حاکم کے ذریعے سے سرکاری محکموں کے نظم و نسق کے چلانے کا تجربہ بارہا کیا گیا ہے اور ہمیشہ ناکامیاب رہا ہے۔ پارلیمنٹ ہمیشہ اس میں رخنے ڈالتی رہی ہے، تا آنکہ اُسنے

ناممکن العمل بنا دیا ہے، اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال قانون امداد غربا کی ہے۔ اس قانون کا نظم و نسق اس وقت بھی کچھ بہت اچھی حالت میں نہیں ہے مگر یہ کہنا داخل مبالغہ نہ ہوگا کہ اس میں جو کچھ بھی خوبی ہے وہ صرف اسیطرح سے برقرار رہی ہے کہ اسے دار العوام میں ایک سرکاری فریقیانہ محافظ مل گیا ہے۔ اگر یہ تدبیر نہ کی گئی ہوتی تو اہل انگلستان قانون امداد غربا کی پرانی غلطیوں میں پھر مبتلا ہو گئے ہوتے اور اس پر اس زمانے کے بڑے بڑے شہروں کی دنائت و ناقابلیت کا اضافہ مزید ہو گیا ہوتا۔ سب کچھ مقامی انتظام کے اوپر چھوڑ دیا گیا ہوتا۔ پارلیمنٹ مرکزی مجالس کے کاموں میں مداخلت کرتی رہتی تا آنکہ انھیں بیکار کر دیتی۔ اور مقامی حکام مطلق العنان ہو جاتے۔ نئے قانون امداد غربا کا پہلا انتظام کمشنروں (ماموریں) کے ذریعے سے ہوا، اور لوگ انھیں ایوان سمرسٹ کے تین بادشاہ کہا کرتے تھے۔ یہ یقینی ہے کہ طریق کار کا تجربہ ناقابل اطمینان لوگوں کے ہاتھوں سے نہیں ہوا۔ اس نازک وقت میں انگلستان کے نہایت ہی مستند کار اور بہترین منتظموں سے ایک شخص مسٹر چیڈوک، اس محکمے کا معتمد اور اسکی روح رواں تھا۔ کمشنروں (ماموریں) میں ممتاز درجہ سر جارج لیوئس کو حاصل تھا جنہیں غالباً مردم شناسی کا مادہ اس زمانے کے تمام منتظموں سے بڑھا ہوا ہے، مگر دار العوام نے کمیشن کو اپنی روش پر چلنے نہ دیا۔ مدت تک اس کے مخالفوں کی مدافعت اس وجہ سے ہوتی رہی کہ انگلوں نے اس کمیشن کو قائم کیا تھا، اور بحیثیت فریق کے وہ اُس کی حفاظت اپنا فرض سمجھتے تھے۔ نئے قانون کا آغاز ایک طرح کی ذہنی تحریک سے ہوا، اور جب تک یہ ذہنی جوش ختم نہ ہو گیا اس وقت تک اس محکمے کا نظم و نسق خلاف معمول قوت سے پائے چوبیں کے سہارے پر کھڑا کیا جاتا رہا مگر بعد میں کمشنروں کو اُن کی لازمی کمزوری کے حوالے کر دیا گیا، تمام معاملات کی پشت پناہی کے لیے ارکان موجود تھے۔ نگران کمشنروں (ماموریں کی پشت پناہی کے لیے) کوئی رکن نہ تھا۔ دیہاتوں کے متولی یہ پسند کرتے تھے کہ اس صیغے کی مدد سے مزدوریوں میں اضافہ ہو جائے، شہروں کے متولی نگرانی سے متنفر اور روپیہ خرچ کرنے سے دل برداشتہ تھے۔ آخر کمیشن کو برطرف کرنا پڑا اور ایک پارلیمنٹی سرگروہ کا اضافہ کیا گیا، نتیجہ ہنوز مکمل

نہیں ہے۔ مگر قدیم طریق میں جو کچھ واقع ہوا ہوتا اُس کی نسبت اس میں حیرت انگیز ترقی ہو گئی ہے، نیا طریقہ اس وجہ سے خوبی کے ساتھ نہیں چلا کہ مرکزی حکام کو ضرورت سے کم اختیار دیا گیا ہے، لیکن سابق طریق میں تو مرکزی حکومت کے اختیارات اس طرح کم ہوتے جارہے تھے کہ اس وقت تک اُس کے قبضے میں کوئی اختیار ہی باقی نہ رہتا، اور اگر پارلیمنٹ کے مواجہ میں سرجارج لیوئس اور مسٹر چیڈوک کسی بیرونی حملے کو استوار نہ رکھ سکتے تو پھر ان سے کم درجے کی فہم و استقامت کے لوگوں کا ذکر ہی بیکار ہے۔

ان دلائل سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ایک اچھی پارلیمنٹی حکومت کے لیئے ایک ایسے تبدل پذیر پارلیمنٹی سرگروہ کی ضرورت کیوں ہے جو وزارت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہے۔ خوش قسمتی سے کچھ ایسے طبعی سامان موجود ہیں کہ اس قسم کے سرگروہ لامحالہ پیدا ہوجائیں گے۔ فریقانہ نظم کی وجہ ایسا ہونا یقینی ہوجاتا ہے چونکہ امریکہ میں ایک وقت معینہ پر صدر جمہوریہ کا انتخاب بالضرور ہوتا ہے اور دوسرے چھوٹے چھوٹے انتخابات بھی ہمیشہ پیش آتے رہتے ہیں اس لیئے وہاں فریقانہ نظم تمام جگہوں سے زیادہ پر زور طور پر منضبط ہے اور اُس کا اثر عہدوں پر بہت ہی بہت نا کب پڑتا ہے۔ صدر جمہوریہ کے ہر ایک تغیر کے ساتھ ہر ایک عہدے پر از سر نو تقررات ہوتے ہیں۔ کم از کم یہ کہ ہر ایک ایسے تغیر کے وقت جب کوئی نیا فریق برسر اقتدار ہوجاتا ہے ضرور ہی ایسا ہوتا ہے انگلستان کیطرح نہ صرف نہایت اعلیٰ مناصب ہی میں تغیر ہوتا ہے بلکہ نیچے درجے کے عہدہ دار بھی بدل جاتے ہیں۔ حکومت وفاقیہ کے مالی کاموں کا معیار اب اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ کم از کم اس صیغے میں تو نہایت ہی اغلب ہے کہ آیندہ اعلیٰ قابلیت کا ایک مستقل عنصر ہمیشہ برقرار رہے، نو کرور اشرفی سالانہ کا جمع کرنا، اور اس کا خرچ کرنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ اور آئے دن کے بدلنے والے عملے سے یہ کام انجام نہیں پاسکتا مگر اہل امریکہ نے اس وقت تک صرف یہی نہیں کیا ہے کہ انگریزوں کی طرح دفتری حکومت کے سرگردگان کو بدلتے رہتے ہیں بلکہ انھوں نے کسی قسم کا پائدار دفتری اقتدار قائم ہی نہیں ہونے دیا ہے لیکن اس قسم کا تجربہ کرنے کے لیئے

اہل امریکہ کو ایسی سہولتیں حاصل ہیں جو کسی اور قوم کو میسر نہیں ہیں، اس تمام قوم میں نظم ونسق کی قوت موجود ہے، اور قانون پیشہ "ماہر مالیات" منتظم افواج وغیرہ عہدوں کے لیئے بیاپے جس قدر افراد حقیقی طور پر موزوں ہوتے ہیں، ان کی تعداد حیرت انگیز ہے۔ تمام عہدہ داروں کے تغیر سے یورپی ممالک کو جس درجہ خوف ہونا چاہیئے اس درجہ خوف کرنے کی انھیں کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ یقین ہے کہ وہاں ان کی جگہوں کے پُر کرنے والے یورپ سے بہتر موجود ہیں، اور انگریزوں کی طرح انھیں یہ خوف دامنگیر نہیں رہتا کہ خدمت سے سبکدوش ہونے والے اپنے وسط زندگی میں بیکسی میں مبتلا ہو جائیں گے، انھیں آئندہ کی کوئی امید نہ رہے گی اور گزشتہ کا کوئی صلہ نہ ملے گا کیونکہ (سبب جو کچھ بھی ہو مگر) امریکہ میں مواقع کا کوئی حد و شمار نہیں ہے، اور انگلستان میں جو شخص قافلے سے چھوٹ جانے سے برباد ہو جاتا، وہاں اُسے بہت جلد دوسرا رفیق طریق مل جاتا ہے۔ یہ اغلب ہے کہ اہل امریکہ اس انتظامی سیلاب عام کے طریقۂ سابقہ میں کسی حد تک تغیر کریں گے لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ امریکہ ہی کی حکومت ایک ایسی آزاد حکومت ہے جہاں تک دستور انگلستان کے دستور کا مقابلہ کر سکتا ہے تو پھر اس حکومت میں اس طریقے کا فی نفسہ موجود ہونا ہی اس امر کا داعی ہے کہ پارلیمنٹی حکومت میں جیسے بڑے تغیرات ہوتے ہیں اہل انگلستان ان کے لیئے تیار ہو جائیں۔ اور انھیں صبر کے ساتھ برداشت کریں۔

میرے خیال میں یہ دلائل تقریباً ہر شخص کو معقول و قطعی معلوم ہوں گے، مگر اس موقع پر بہت سے لوگ اس کا جواب اس طرح دیں گے کہ "آپ اس امر کو ثابت کرتے ہیں جس سے ہمیں انکار نہیں ہے، یعنی یہ مسلسل تغیر پارلیمنٹی حکومت کا ایک لازمی عنصر ہے مگر آپ نے وہ امر ثابت نہیں کیا جس سے ہم انکار کرتے ہیں یعنی یہ تغیر ایک اچھی شے ہے۔ پارلیمنٹی حکومت میں جن امور کی ہمیں فکر ہے انھیں میں سے ایک امر یہ بھی ہو سکتا ہے مگر ہمارا دعوی تو یہ ہے کہ یہ ایک "نقص" ہے" میرے خیال میں اسکے جواب میں یہ تو نہیں ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ایک دائمی مکمل نظم و نسق کیلئے ٹھیک یہی تغیر لازمی و ضروری ہے۔ مگر یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اسی کے مثل یا اسی قسم کا کوئی تغیر ضروری ہے۔

انگلستان میں اس وقت ایک طرح کا میلان دفتری حکومت کی طرف پایا جاتا ہے کم از کم یہ کہ انشا پردازوں اور باتیں بنانے والوں کا تو یہی خیال ہے۔ انگریزی قوم کے دلوں میں جو خیالات راسخ ہو گئے ہیں، اُنھیں تو وہ آسانی سے نہیں بدلتے مگر ان میں بہت سے غیر راسخ خیالات بھی ہیں۔ یہ یقینی ہے کہ یورپ میں کسی اہم واقعے کے پیش آنے سے کسی نہ کسی قسم کے تغیر کی کھٹک سی پیدا ہو جاتی ہے عین اُسی زمانے میں اہل پرشیا کی ظفرمندی سے (جن کی نسبت یہ یقین کیا جاتا ہے کہ وہ بدرجۂ اتم ایک دفتری قوم ہے) دفتری حکومت کی نسبت ایک طرح کی وقعت سی پیدا ہو گئی ہے، حالانکہ چند برس پہلے اُسے بالکل غیر ممکن خیال کیا جاتا۔ مجھے یہ ادعا نہیں ہے کہ میں پرشیا دی دفتری حکومت کی نسبت خود اپنے علم و واقفیت کی بنا پر تنقید کروں، وہ یقیناً ایسا ادارہ نہیں کہ غیر ملکی اُس کی بارگاہ تک پہنچ کر خوش ہوں، سیاحوں کا اُسے گوارا سمجھنا اور بات ہے۔ لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ انگریز اگرچہ ایک لمحے کے لیئے دور سے اس پرشیا دی دفتری حکومت کی گونہ مدح سرائی کرنے لگے ہیں مگر خود پرشیا کے اندر نہایت ہی ذہین و آزاد خیال لوگ ملک کے لیئے اُسے مستقلاً پسند نہیں کرتے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہاں کی ایک سیاسی جماعت یعنی ترقی پسند فریق کے دو اغراض کیا تھے؟ انگریز واقعہ نگاروں میں مسٹر گرانٹ ڈف سب سے زیادہ صحیح و فلسفیانہ انشا پرداز ہیں اُنھوں نے ان اغراض کی جس طرح تصویر کھینچی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

اول۔ ایک آزاد طریق کا اجرا جو ایمانداری کے ساتھ نظم و نسق کے تمام جزئیات میں حاوی ہو، جس سے غرض یہ ہو کہ جب کوئی بد دماغ یا متعصب عہدہ دار حکومت کے حریت آمیز ارادوں کی مخالفت کرنے لگتا ہے، اس وقت جیسے لغویات اکثر وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ نہ واقع ہوں۔"

دوم یہ کہ" ان مجرم عہدہ داروں کو جو فی الحال فرانس کے مانند عام شہریوں سے ہر طرح پر تصادم بر پا رکھتے ہیں گویا از سر تا پا مسلح اشخاص غیر محفوظ طریقوں سے لڑ رہے ہوں انھیں عدالت میں لانے کا کوئی آسان طریقہ نکالا جائے۔" ایک ایسا طریق جس کی خود اہل ملک میں سے نہایت ہی طبّاع و ذہین حریت پسند اشخاص

معقولیت کے ساتھ ایسے سخت اعتراضات پیش کرتے ہوں، اس طریقے کا کسی غیر ملک میں نقل کرنا ایک پرخطر امر ہے۔

فی الحقیقت دفتری حکومت کے نقائص بہت اچھی طرح معلوم ہیں، یہ حکومت کی ایک ایسی شکل ہے جس کا دنیا میں بارہا تجربہ ہو چکا ہے اور مدتہائے مدید سے انسانی طبیعت جیسی کچھ چلتی آرہی ہے اگر ایسی ہی رہی تو یہ ثابت کرنا آسان ہے کہ مدت مدید کے بعد حکومت دفتری کے نقائص کیا ہوں گے۔

یہ ایک لابدی نقص ہے کہ دفتری حکومت کے ارکان کام کے نتیجے کی نسبت کام کے ایک معینہ ضابطے کے بموجب انجام پانے کا زیادہ خیال کریں گے یا بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ " وہ کام کے اصل مقصد کی نسبت اس کے ظاہری اشکال کو بہت زیادہ اہم سمجھیں گے " ان کی تمام تعلیم اور اُن کی عمر بھر کی عادت اُنھیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے وہ نوعمری ہی میں ملازمت سرکاری کے کسی خاص صیغے سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ برسوں وہ اُس کی ظاہری صورتوں کے سیکھنے سمجھنے میں مشغول رہتے ہیں، اس کے بعد پھر برسوں ان ظاہری صورتوں کو ادنے ادنے معاملات پر عاید کرنا سیکھتے ہیں۔ ایک پرانے انشا پرداز نے یہ فقرہ کہا ہے کہ یہ لوگ کاروبار کے درزی ہیں، وہ کپڑے کاٹتے ہیں، مگر یہ کپڑے کسی جسم پر ٹھیک نہیں اُترتے "جن لوگوں کی تربیت اس طرح پر ہوئی ہو اُن کے لیئے لازمی ہے کہ وہ انجام دہی کار کے ضوابط کو وسائل نہیں بلکہ اصل غایت سمجھیں یعنی جس پیچ در پیچ کل کے وہ خود ایک پرزے ہیں اور جس سے انھیں اعزاز دیرینہ حاصل ہے وہ اس کل کو ایک کام چلانے والے اور قابل تبدیل اوزار کے بجائے اُسے ایک مہتم بالشان نتیجۂ حاصلہ سمجھیں، مگر ایک معجون مرکب دنیا میں کبھی ایک غلطی ہوتی ہے، کبھی دوسری۔ جن وسائل سے کل تمہیں بہترین مدد مل سکی ہے ممکن ہے کہ وہی وسائل اگلے دن تمھارے لیئے سب سے زیادہ دقت کے باعث ہو جائیں، ہو سکتا ہے کہ کل تمہیں ایک دوسرے کام کی ضرورت پیش آجائے اور ایک دن پہلے تک کے کام کے لیئے تم نے جس قدر ذرائع و وسائل جمع کیئے ہوں وہ اب نئے کام کے لیئے سد راہ بن جائیں۔ اس وقت روشیا کے فوجی نظام کے متعلق

ہر طرف حیرت و استعجاب کے ترانے بلند ہو رہے ہیں لیکن یہی انتظام ساٹھ برس تک محض ظاہری شکل کے خلاف سبق دیتا رہا ہے۔ ہم سب نے یہ قول سنا ہے کہ "فریڈرک اعظم نے معرکۂ جینیا میں ہزیمت پائی"۔ اس نے اپنے ضروریات اور اپنے زمانے کے مطابق ایک اچھا نظام قائم کیا تھا، مگر زمانہ بدل گیا اور آنکھ بند کرکے اسی فوجی نظام کی تقلید ہوتی رہی، اور جب اسے نئے حریفوں سے مقابلہ پڑا تو نتیجہ یہ ہوا کہ فریڈرک کے اس قائم کردہ نظام نے اُس کے ملک کو برباد کیا۔ اس وقت مردہ ظاہر پسند پرشیاوی نظام کا مقابلہ اس "زندہ فرانسیسی نظام سے کیا گیا جو نئی آتش انگیز عمومیت سے فوری طور پر ظہور پذیر ہو گیا تھا۔ اب جو پرشیاوی نظام موجود ہے وہ اسی رفعت عمل کا نتیجہ ہے، اور اُس کے پیشرو کی تاریخ اس امر کی خبر دیتی ہے کہ اس نظام کی بھی آئندہ تاریخ کیا ہوگی۔ اس وقت اُس نظام کی جو مدح سرائیاں ہو رہی ہیں وہ اس سے بڑھ کر نہیں ہیں جو فریڈرک کے نظام کی اُس کے زمانے میں ہوتی تھیں اور تجربہ یہ سکھاتا ہے کہ کوئی دفتری حکومت جس کے دماغ میں اپنی دفعتہً کامیابی کی ہوا بھر گئی ہو اور جو خود اپنے کمال پر متحیر رہی ہو وہ دنیا کی حکومتوں میں سب سے زیادہ غیر ترقی کن تہی باطن حکومت ہے۔

اس طرح پر صرف یہی نہیں ہوتا کہ دفتری حکومت کیفیت کے اعتبار سے حکمرانی کی کمی کیطرف مائل ہو جاتی ہے بلکہ کمیت کے اعتبار سے وہ حکمرانی کی بیشی کیطرف مائل ہو جاتی ہے۔ تربیت یافتہ عہدہ دار درشت خو، غیر تربیت یافتہ عوام سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ وہ یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ عوام بلید الطبع، جاہل و لاپرواہ ہیں، وہ خود اپنے مقصد کا اظہار نہیں کر سکتے اور کسی کام کے کرنے کے قبل اُنکے لیئے ضروری ہے کہ وہ دفتر سے اجازت لے لیں۔ تحفظ تجارت ہر ایک عہدہ دار کا طبعی و خلقی عقیدہ اور آزاد تجارت ایک خارجی تصور اور اُسکے خیالات کے بالکل مغائر ہے، اور بہت مشکل ہے کہ اسے زندگی میں جذب کیا جا سکے۔ یہ امر بہت آسانی سے نظر آسکتا ہے کہ ایک کامل و ماہر نقاد جو آزادانہ و مستعدانہ زندگی کا عادی ہو وہ کس طرح پر ایسے عہدہ داروں کا خاکہ کھینچے گا۔

چنانچہ مسٹر لینیگ لکھتے ہیں کہ "مذہب، تعلیم، قانون، پولس عام و خاص

کاروبار کی ہر ایک شاخ، ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل کرنے بلکہ ایک ہی حیطۂ اختیار کے اندر بلکہ ایک ہی پیرش سے دوسرے پیرش کو جانے کی شخصی آزادی یعنی امور معاشرت میں ہر ایک خیالی وحقیقی تصفیہ، چھوٹے یا بڑے پیمانے پر تجارت یا حرفت کی کسی صنف میں مشغول ہونے کی آزادی، غرض وہ تمام امور جن میں ایک متمدن سوسائٹی (نظم معاشرت) کے اندر جسم وعقل اور سرمائے سے کام لیا جا سکتا ہے ان سب کو ایک ایک کر کے عہدہ داروں کے تقرر مدد معاش کے لیے قابو میں کر لیا گیا، انھیں دفتر کے اندر مجتمع کر لیا گیا، ان کی نگرانی ہونے لگی، ان کے لیے اجازت نامے کی شرط لگا دی گئی، اُن کا معائنہ اور اُن کی رپورٹ (اطلاع) ہونے لگی اور عہدہ داروں کا ایک غول کا غول (جو تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے اور جسے سرکار سے تنخواہ ملتی ہے) اس میں مداخلت کرنے لگا، اور پھر ان سب باتوں کے بعد ان کے فرائض کا کوئی نفع ذہن میں نہیں آتا۔ تاہم وہ بالکل بے کار نہیں ہیں کہ تنخواہ لیتے ہوں اور کوئی کام نہ کرتے ہوں، بلکہ وہ ایک طرح کے نیم فوجی انضباط کے تحت میں ہیں مثلاً بویریا میں اعلےٰ ملکی عہدہ دار اپنے ماتحت عہدہ دار کو ادائے فرض میں غفلت کرنے یا ملکی عہدہ داروں کے ضوابط کے خلاف کسی ارتکاب جرم کی وجہ سے، خود اُسی کے مکان میں اُسے نظر بند کر سکتا ہے۔ ورٹمبرگ میں کوئی عہدہ دار اپنے افسر اعلیٰ کی اجازت کے بغیر عقد نہیں کر سکتا۔ والٹیئر نے کسی جگہ لکھا ہے کہ "حکومت کا حسن یہ ہے کہ قوم کے دو تہائی اشخاص سے جس قدر ممکن ہو وہ بقیہ ایک تہائی کے فائدے کے لیے کریں"۔ جرمنی کے نظام عہدہ داری پر یہ قول بالکل ہی چسپاں ہے۔ وہاں عہدہ دار قوم کی نفع رسانی کے لیے نہیں ہیں بلکہ قوم عہدہ داروں کی نفع رسانی کے لیے ہے۔ عہدہ داری کی یہ تمام کل جس کے بے شمار ادنےٰ و اعلیٰ افراد ہر ضلع میں ہوتے ہیں، جس کے ہر ایک صیغے میں محرروں اور امیدواروں کا ایک عملہ بھرا ہوتا ہے جو ملازمت، تقرر یا ترقی پر نظر لگائے رہتے ہیں، غرض اس تمام کل کا مقصود یہ ہے کہ برّ اعظم کی نئی معاشرتی حالت میں وہ تخت شاہی کا ایک نیا سہارا ہو جائے، یہ ایک نیم الطبقہ ہے جن کو ہر طرح کے عام و خاص معاملات میں مختلف طرح کی مداخلت کے سرکاری فرائض

کی وجہ سے قوم سے تعلق ہوتا ہے مگر وہ اپنے اغراض و مقاصد کے لیئے شاہی قوت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ عہدہ دار طبقہ سے مقصود یہ تھا کہ وہ امیروں شریفوں، سرمایہ داروں، اور بڑے زمینداروں کے طبقے کے ہم مرتبہ ایک طبقہ بن جائے تاکہ اُن کے انفرادی وزن واثر کی کمی کو زیادتی تعداد سے پورا کیا جائے بیان کیا جاتا ہے کہ فرانس میں لوئس فلپ کے اخراج کے وقت ملکی ملازموں کی تعداد ۸۰۷۱۳۱ تھی، یعنی اہل قلم کی یہ فوج اہل سیف کی فوج سے دو چند تھی جرمنی میں تناسب آبادی کے لحاظ سے یہ طبقہ لازماً زیادہ ہے۔ فوج کے آزادانہ کاموں پر جبری فوجی خدمت کے بہ نسبت فوج محافظ ملک کے نظام سے اور زیادہ قیود عائد ہوتے ہیں۔ اور اس کے انتظام کے لیئے زیادہ عہدہ داروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیم جاگیرانہ اختیارات عدالتی واشکال قانونی کی وجہ سے ضابطہ نپولین کی بہ نسبت زیادہ تحریر اور زیادہ پیچیدہ نقشوں وغیرہ کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے"

دفتری حکومت کے لیئے یہ خیال کرنا یقینی ہے کہ بنی نوع انسان کی قوتوں کو آزاد چھوڑنے کی بہ نسبت اُسپر یہ زیادہ واجب ہے کہ وہ سرکاری قوت، سرکاری کام اور سرکاری ارکان میں وسعت دے۔ یہ حکومت کی مقدار کو بڑھادیتی اور اس کے ساتھ ہی اُسکی صفات کو گھٹادیتی ہے۔

صحیح یہ ہے کہ ایک ذی مہارت دفتری حکومت یعنی جس کے ارکان کو اوائل عمر ہی سے اسی خاص شغل کی تربیت ہوئی ہو، وہ اگرچہ بظاہر علمیت کے دعوے کرتی ہو مگر کام کے صحیح اصول وفن سے وہ بالکل مغائر ہوتی ہے۔ یہ فن ابھی قواعد مسلمہ کے تحت میں منضبط نہیں ہوا ہے مگر بہت سے تجربے ہو چکے ہیں اور سوسائٹی میں اُس کے علم وواقفیت کا بہت کچھ چرچا پھیلا ہوا ہے۔ اس کے نہایت ہی حتمی اصولوں میں سے دو ایک اُصول یہ ہیں کہ کامیابی کا انحصار خصوصی وغیر خصوصی قوائے دماغی کے مناسب امتزاج پر ہے۔ خصوصی سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی نظر وسائل و ذرائع پر ہوتی ہے، اور غیر خصوصی وہ ہیں جو غایت ومقصود کو دیکھتے ہیں۔ لندن کے سرمایۂ مشترک کے بڑے بڑے بنکوں کی کامیابی اسی امتزاج کے کام میں لانے کی ایک مثال ہے۔ اور یہ بنک زمانہ حال کے کاروبار میں

سب سے زیادہ تعجب انگیز کامیابی پر پہنچے ہوئے ہیں ان بنکوں کا انتظام ایک بورڈ (مجلس) کے ذریعے سے ہوتا ہے جس کے بیشتر افراد کو کاروبار کی تربیت نہیں حاصل ہوتی۔ اور ان کے ساتھ ایسے مخصوص تربیت یافتہ عہدہ داروں کی ایک جماعت شریک کردی جاتی ہے جنھوں نے اپنی ساری زندگی بنک ہی کے کام میں گزاری ہے۔ ان مخلوط بنکوں نے ان پرانے بنکوں کو بالکل شکست دیدی ہے جو کلیتہً و خالصتہً ساہوکاروں پر ہی مشتمل ہیں۔ یہ ثابت ہوگیا ہے کہ ناظموں کی اس مجلس کو پرانے ساہوکاروں کے بہ نسبت (جنھوں نے بنک کے ذریعوں کے سوا اور کسی طرف سے عام زندگی پر کبھی نظر ڈالی ہے) نشیب و فراز کا زیادہ علم ہوتا ہے، ان میں تجارتی طبقے کی ضروریات کا درک زیادہ ہوتا ہے یعنی وہ یہ جانتے ہیں کہ کب قرض دینا چاہیئے اور کب نہ دینا چاہیئے۔

یورپ کی نہایت ہی کامیاب ریلوں کے انتظامات بھی بالکل اسی طرح انجنیروں اور ریلوے منتظموں کے ذریعے نہیں بلکہ سرمایہ داروں کے ذریعے سے چلے ہیں، جن میں اور کچھ نہیں تو ایک خاص طرح کی کاروباری مہارت ضرور ہوتی ہے۔ یہ سرمایہ دار ماہر منتظموں کی خدمات کو بالکل اسی طرح خرید تے اور کام میں لاتے ہیں جس طرح ایک ناواقف مختار عام ماہر بیرسٹر کی خدمات کو خریدتا اور کام میں لاتا ہے اور یہ سرمایہ دار ان مختلف قسم کے خصوصی اشخاص کی نسبت جو انکے تحت میں کام کرتے ہیں خود بہت ہی بہتر و بہتر انتظام کرتے ہیں اور وہ ان مختلف خصوصیتوں کے جامع ہوتے ہیں، اور اُسے صاف ظاہر کردیتے ہیں کہ کہاں پر ایک کے اختیارات ختم اور دوسرے کے شروع ہوتے ہیں، اور پھر اس میں بڑے بڑے معاملات کے متعلق اپنی وسیع واقفیت کا اضافہ کردیتے ہیں یہ واقفیت کسی خصوصی شخص کو حاصل نہیں ہو سکتی اور اس کا حصول صرف مختلف النوع کاموں کے ہی ذریعے سے ہوتا ہے مگر وہ ہادی و رہبر دماغ جو تعمیم کے عادی ہوتے ہیں اور مختلف النوع مواد سے کام لیتے ہیں ان کا نفع تمام تر ان کی بلند حیثیت پر منحصر ہے۔ ان کو نیچے کی سطح پر کیا بلکہ درمیانی سطح پر بھی نہ ہونا چاہیئے، انھیں سب سے اونچی جگہ پر ہونا چاہیئے۔ ایک سوداگر کا محرر بنک کی میز پر پہنچ کر بالکل بچہ بن جائیگا لیکن یہ نہایت ہی اغلب ہے کہ

خود وہ سوداگر بنک کے اجلاس میں عمدہ صاف و نافع صلاح دے سکے۔ سوداگر کا محرر کسی ریل کے دفتر میں پہنچ کر بھی بھنور میں پھنس جائیگا مگر خود وہ سوداگر ڈائرکٹروں کے بورڈ میں بظن غالب معقول صلاح دے سکیگا (اگر یہ کہنا روا ہو تو میں کہوں گا کہ) مختلف قسم کے کاروبار کی چوٹیاں، پہاڑوں کی چوٹی کی طرح اپنے زیریں حصوں کی بہ نسبت زیادہ یکساں ہوتی ہیں؛ صریحی اصول تقریباً ہر جگہ ایک ہی ہے۔ نیچے کی سطحوں کے رنگ برنگ کے زرخیز جزئیات ہی ایک دوسرے سے اس درجہ مغائر ہوتے ہیں مگر اس امر کے جاننے کے لیئے کہ چوٹیاں سب ایک ہی سی ہیں سفر کی ضرورت ہے، جو لوگ ایک پہاڑ پر رہتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا پہاڑ دوسرے تمام پہاڑوں سے بالکل مختلف ہے۔

پارلیمینٹی حکومت پر اس اصول کا اطلاق بہت ہی صاف و واضح ہے اس سے معاً یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ کسی دفتر پر اس دفتر سے باہر کے اعلیٰ افسر کی بیرونی دخل دہی باعث خرابی نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس اس دفتر کی تکمیل کے لیئے شرط لازمی ہے۔ اگر دفتر کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنے آپ میں غرق ہو کر اپنی ہی ترقی و وسعت میں لگا رہے گا اور بالکل ایک اصطلاحی شے ہو جائے گا۔ یہ ایسا ہو گا کہ ذرائع کے در پے ہو کر اصلی اغراض کو نظرانداز کر دیا جائے، تنگ خیالی کی وجہ سے اس میں ناکامی ہوگی۔ اسے اس کا تو بہت شوق ہو گا کہ معلوم ہو کہ کام چل رہا ہے مگر اصلی کام کی انجام دہی میں وہ بالکل سست ہو گا۔ ایک بیرونی افسر اعلےٰ اس قسم کی غلطیوں کی اصلاح کے لیئے نہایت ہی موزوں ہے۔ وہ مستقل افسر سے جو ظاہری قواعد و ضوابط میں خوب ماہر ہوتا اور اپنے گزشتہ کارناموں کی یاد میں پھولا رہتا ہے، یہ کہے گا کہ "صاحب آپ مجھے سمجھائیے کہ اس ضابطے سے مقصود زیر نظر میں کس طرح سے کام نکلتا ہے۔ فطری بات تو یہ ہے کہ قرض دہندہ اپنی تمام خواہشات کو ایک کاغذ پر لکھ کر ایک محرّر کے سامنے پیش کرے، آپ اس سے کہتے ہیں کہ پانچ کاغذوں پر لکھ کر پانچ محرروں کے سامنے پیش کرے،" کسی وقت وہ یہ کہے گا کہ "آپ پر یہ واضح نہیں ہوتا کہ اس ضابطے کی اصل غایت دنیا سے معدوم ہو چکی ہے، جب ہم لکڑی کے جہازات

بناتے تھے اس وقت آتش زدگی کے خیال سے اس قسم کی احتیاطیں بالکل بجا تھیں، مگر اب جبکہ ہم لوہے کے جہاز بناتے ہیں،" وغیرہ وغیرہ۔ اگر ایک نیچے درجے کا محرر اس قسم کے سوالات کرے تو اُس کو جھڑک دیا جائے گا۔ ان سوالات کا جواب تو کسی دفتر کا افسر اعلیٰ ہی پا سکتا ہے۔ اُسی کی اور صرف اُسی کی یہ حیثیت ہے کہ وہ دفتر کے خار و خاشاک کو عقل و دماغ کے شیشۂ آتشی کے نیچے رکھ کر جلا دے۔

جس ملک میں کاروبار کے تغیرات سب سے زیادہ ہوتے ہوں، وہاں اس قسم کے تازہ بتازہ طبیعتوں کی وسیع اہمیت بہت ہی بڑھ جاتی ہے۔ ایک مردہ وافسردہ زرعی ملک میں یہ ہوسکتا ہے کہ وہاں ایک غیر مبدل "دفتر" سالہا سال تک حکومت کرتا رہے اور اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اگر کسی عقلمند شخص نے ابتدائے کار میں اس دفتر کو صحیح طور پر ترتیب دیدیا ہو تو وہ مدتہائے دراز تک صحیح طور پر چلتا رہیگا لیکن اگر ملک ترقی کن، اور زوردار اور تغیر پذیر ہے تو بہت جلد یا تو دفتر میں ترقی کی سخت ضرورت لاحق ہو جائے گی اور یا وہ بالکل ہی غارت ہو جائیگا۔

پارلیمنٹی افسر اعلےٰ کے سودمند ہونے کے متعلق اس تصور سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ عام خیال کس قدر غلطی پر مبنی ہے کہ اُسے دفتر کا منتظم اعلیٰ سمجھا جاتا ہے، متوفی سر جارج لیوس اس مضمون کی تشریح کی طرف بہت مائل رہا کرتے تھے۔ ان کے لیئے حصول واقفیت کا ذریعہ مہیا تھا۔ اُن کی پرورش ہی مستقل ملازمان ملکی کی حیثیت سے ہوئی تھی، وہ ایک نہایت ہی کامیاب وزیر خزانہ تھے، نہایت ہی کامیاب وزیر داخلہ تھے اور مرتے دم وہ وزیر جنگ تھے۔ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ "وزیر کابینہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اپنے محکمے کے معمولات انجام دے بلکہ اُس کا کام یہ ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ یہ معمولات صحیح طور پر انجام پاتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ اس سے زیادہ کچھ کرتا ہے تو وہ غالباً نقصان پہنچا دیگا۔ وزیر اس قسم کا جو کام کرنا چاہتا ہو اُسے دفتر کا مستقل عملہ بہتر طریق پر انجام دے سکتا ہے اور اگر وہ نہیں کر سکتا ہے تو اُسے برطرف

کردینا چاہیئے۔ وہ تو ایک اُڑتی ہوئی چڑیا ہے کہ آئی اور نکل گئی وہ ان لوگوں سے مقابلہ نہیں کرسکتا جن کی ساری عمر دفتر کے اندر ہی چکر کاٹنے میں بسر ہو گئی ہو۔ پارلیمنٹی سرگروہ کے لیئے جس حد تک ایک تیز نظر ناقد اور ایک دانشمند اصلاح کنندہ ہونا ضروری ہے، سر جارج لیوئس اُس کا ایک کامل نمونہ تھا۔

مگر ہر اعتبار سے وہ کامل نہیں تھا بلکہ دوسرے اعتبارات سے وہ اوسط درجے پر بھی نہیں تھا۔ ایک ایسا شخص جس کا دل و دماغ تر و تازہ ہو ایک ایسے شخص کے ساتھ شریک کار ہو جاتا ہے جو دفتر ہی میں غرق رہتا ہو تو اُس سے نہ صرف اصلاح کا فائدہ حاصل ہوگا بلکہ ایک نیا جوش بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی اہم موقع پر جس شے کی حاجت ہوتی ہے سرکاری محکمہ اس کی طرف سے بالکل بے حس ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ موقع ہی نکل جاتا ہے۔ قبل اس کے کہ کانٹے کی تول کا کام کرنے والا مصروف کار دفتر کسی نمایاں فرض کی نسبت کوئی خیال قائم کرے عوام کے دلوں میں مبہم طور پر اس کی قدر و منزلت قائم ہو جاتی ہے۔ کم از کم جنگ کریمیا کے زمانے میں ڈیوک نیوکیسل ضرور ہی اس خصوصیت کے شخص تھے اُنھوں نے اپنے محکمے میں جوش پیدا کر دیا، اگرچہ اس جوش کے پیدا ہونے کے بعد ان کا محکمہ کچھ کام نہ کرسکا، ایک کامل پارلیمنٹی وزیر وہ ہوگا جو سر جارج لیوئس کے ذخیرہ کردہ فہم و فراست، اُن کے نکتہ چین احساس اور تنہائی پسند عادت کے ساتھ ڈیوک نیوکیسل کی جوش انگیز قابلیت کو جمع کرے۔

جب ہم پارلیمنٹی عہدے کے صحیح مفہوم کو سمجھ لیں گے تو پھر ہم فوراً یہ محسوس کریں گے کہ ایک موزوں حد تک عہدہ داروں کے بدلتے رہنے میں کوئی غلطی نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس یہ طریقہ مفید ہے۔ اگر اس پارلیمنٹی عہدہ دار کا فرض یہ ہے کہ بیرونی دنیا کے اس ادراک اور بیرونی جوش و خروش کا نمائندہ بن کر انھیں (دفتر کی) اندرونی دنیا سے ملادے تو پھر ضرور ہے کہ وہ اکثر بدلتا رہے کوئی شخص بھی بیرونی احساس و ادراک کا کامل نمائندہ نہیں ہے۔ یہ فرانسیسی مقولہ بالکل صحیح ہے کہ وہ ایک شخصیت ایسی ہے جو تالے ران سے زیادہ قابل

اور نپولین سے زیادہ لایق ہے اور وہ ملک کی اجتماعی کیفیت ہے۔ مختلف النوع احساس و ادراک کسی ایک فرد واحد میں مجتمع و مرکوز نہیں ہوتا۔ اس سے بھی کمتر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص واحد ایک پارلیمنٹی وزیر کی تنقید و جوش انگیزی دونوں فرضوں کو پورے طور پر نباہ لے جائے۔ اغوائی قوت اور حاذ مانہ عقل دو بالکل ہی مخالف چیزیں ہیں اور شاذ و نادر ہی ایک ہی شخصیت میں جمع ہوتی ہیں۔ ماسوا اس کے پارلیمنٹی وزیر کی فطری طبیعت اگر کامل بھی ہو، تو بھی دفتر کے ساتھ زیادہ دنوں تک وابستہ رہنے سے اُس کی سودمندی زائل ہو جاتی ہے۔ یہ لازمی ہے کہ وہ دفتر کے طریقوں کو اختیار کرے گا، دفتر ہی کے خیالات اُس کے ذہن میں بس جائیں گے اور وہ ویسی ہی زندگی بسر کرنے لگیگا۔ رنگ ساز جو رنگ رنگیں گے ان کا ہاتھ بھی ویسا ہی ہو جائیگا۔ اگر پارلیمنٹی وزیر کا فرض یہ ہے کہ وہ دفتر کے لیئے ایک بیرونی شخص کی حیثیت سے ہو تو ہمیں اُس منصب کے لیئے ایسے شخص کو منتخب نہ کرنا چاہیئے جو اپنے عادات و خیالات اور طرز زندگی کی وجہ سے اسی آب و ہوا کا عادی ہو چکا ہو۔

اس امر کے توقع کرنے کی ہر ایک وجہ موجود ہے کہ پارلیمنٹی وزیر ایسا شخص ہوگا جس میں بہت کافی ذہانت و قابلیت ہوگی، مختلف علوم سے اُسے بہت کافی واقفیت ہوگی، مختلف امور کے تجربے اُسے بہت کافی حد تک حاصل ہوں گے اور اس طرح وہ دفتری احساس و ادراک کے مقابلے میں موثر طور پر عام احساس و ادراک کی نمایندگی کر سکیگا۔ اکثر کابینی وزرا جنہیں متعدد محکمے تفویض ہوتے ہیں، اعلیٰ قابلیت کے لوگ ہوتے ہیں۔ میں نے ایک وسیع التجربہ بلند پایہ مدبر کو (جو اس وقت بقید حیات موجود ہیں) یہ کہتے سنا ہے کہ ان کو اپنے وقت میں صرف ایک مثال اس کے خلاف معلوم ہے اور ایسا ہونے کے لیے بہترین تحفظ موجود ہے۔ ایک معقول کابینی وزیر کو تمام دنیا کے مقابلے میں اپنے محکمے کی حمایت کرتا ہے۔ اور اگرچہ دور سے دیکھنے والے اور تیغ قلم سے کام لینے والے انشا پرداز اس وصف و منزلت کو گھٹا کر دکھاتے ہیں مگر یہ ایک بہت ہی مشکل کام ہے۔ اگر کسی بے وقوف شخص کو علی الاعلان عظیم الشان معاملات کی توضیح و تشریح کرنا پڑے، متجسس سوالات کا علانیہ جواب دینا پڑے، قابل و زیرک مخالفوں کے خلاف بر سر عام بحث کرنا پڑے، تو بہت جلد یہ معلوم ہو جائیگا کہ

وہ بیوقوف ہے۔ پارلیمنٹی حکومت کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ حقیقی نالائقی ظاہر ہی ہو کر رہتی ہے۔ بہرنوع ان تمام اشکال حکومت میں جن کے طرز حکومت کا انگلستان کے طرز حکومت سے مقابلہ ہے۔ کوئی حکومت بھی ایسی نہیں ہے جس میں کم وبیش انگلستان کی سی موثر کارروائی اس بارے میں ہوتی ہو کہ زمرۂ اہل دفتر سے باہر کا کوئی اچھا شخص اس غرض سے کہ زیر مقرر ہوتا ہو تا کہ وہ اہالی دفتر کے ایک ڈھرے پر چلنے والے کاموں کی اصلاح کرے اور انھیں آگے بڑھائے۔ دنیا کی موجودہ حالت میں حکومت کی صرف چار اہم شکلیں ہیں۔ پارلیمنٹی، صدارتی، موروثی اور انقلابی۔ ان میں سے میں یہ دکھا چکا ہوں کہ حکومت کی صدارتی شکل جس طرح اس وقت امریکہ میں رائج ہے وہ کسی ماہرانہ دفتری حکومت سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ہر ایک نئے فریق کے عزل ونصب کے وقت طبقۂ عہدہ دار بدل جائے تو پھر دفتر کے کسی اچھے نظام کا قائم رہنا ناممکن ہے۔ امریکہ میں اگر اس وقت کے بہ نسبت اور زیادہ عہدہ دار بھی مستقل کر دیئے جائیں تب بھی بہت بڑی تعداد ہمیشہ بدلتی رہے گی۔ تمام معاملے کا انحصار ایک انتخاب یعنی رئیس جمہوریہ کے پسند کیئے جانے پر ہے۔ اسی تہلکہ انگیز معرکے پر تمام امور کی فتح وشکست معلق ہے۔ میں جس شے کو سرپرستانہ رشوت کہنا چاہتا ہوں اُس کے استعمال میں اس تصادم کے منتظمان کار کو انتہائی امکانی سہولت حاصل ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ حقیقت نفس الامری ہے کہ رئیس جمہوریہ جس شخص کو جو جگہ چاہے دے سکتا ہے، اور جب اُس کے احباب زید سے یہ کہتے ہیں کہ وہ اگر ہمیں کامیابی ہوگی تو بجر، یوٹیکا کے ڈاک خانے سے نکال دیا جائیگا اور تم وہاں مقرر ہو جاؤ گے" تو زید کو اس کا یقین ہو جاتا ہے اور اس یقین میں وہ حق بجانب ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ کا کوئی ایک رکن قطعی طور پر کسی جگہ کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ اسے مختلف تقررات کا موقع نہ ملے۔ ممکن ہے کہ اُس کا فریق کامیاب ہو جائے اور وہ پھر بھی بے بس رہے۔ ممالک متحدۂ امریکہ میں فریقانہ شدت میں اسوجہ سے اور زیادتی ہوگئی ہے کہ ہر ایک معرکے پر غیر معمولی اہمیت مجتمع ہو جاتی ہے اور رشوت کے طور پر جگہوں کے وعدوں کے پورے کر دینے کی قوت بہت بڑھ گئی ہے کیونکہ فاتح جسے جو چاہے دے سکتا ہے۔

عہدہ داروں کے انتخاب کے معاملے میں صدارتی حکومت میں صرف یہی ایک نقص نہیں ہے۔ رئیس جمہوریہ میں، پارلیمنٹی حکومت کا خاص اجتماع ضدین تو موجود ہے مگر اس کا اصلاحی وصف مفقود ہے۔ ہر ایک فریقانہ تغیر کے بعد (انگلستان کی طرح) رئیس جمہوریہ اپنے خاص خاص موئیدین کو خاص خاص عہدے تقسیم کر دیتا ہے مگر اُسے سرفرازی کا ایک نہایت نادر موقع حاصل ہوتا ہے۔ وزیر تو دفتر میں گھس جاتا ہے، عامۃ الناس کے سامنے اُسے کچھ کام انجام دینا نہیں پڑتا۔ برسوں اس اظہار کی نوبت ہی نہیں آتی کہ وہ عاقل ہے یا احمق۔ پارلیمنٹ کی کھلی ہوئی جانچ کے ذریعے سے قوم یہ بتا سکتی ہے کہ کون پارلیمنٹی رکن کیسا ہے، مگر کوئی شخص جیسے کسی صدارتی وزیر سے واقعی کام نہ پڑے یا اُسے کوئی ایسا ہی خاص موقع حاصل نہ ہو تیقن کے ساتھ یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ وزیر کیسا ہے۔

حکومت کی موروثی شکل کی بحث میں، وزیر کا معاملہ اور بھی بدتر ہے۔ ممکن ہے کہ موروثی بادشاہ کمزور طبیعت کا شخص ہو، وہ عورتوں کے زیر اثر ہو محض بچوں کے سے خیالات سے وہ کسی وزیر کا تقرر کر دے اور ناممکن العمل وہموں کی وجہ سے اُسے برطرف کر دے۔ اس کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ موروثی بادشاہ میں یہ قابلیت (ضرور) ہوگی کہ وہ اچھا وزیر اعظم منتخب کرے، مگر اس کے برعکس ہزاروں بادشاہ لاکھوں ناقص وزرا کا تقرر کر چکے ہیں۔ آمری یا انقلابی قسم کی حکومت سے میری مراد اس نہایت ہی اہم قسم حکومت سے ہے جس میں بادشاہ اور مطلق العنان بادشاہ منتخب ہوتا ہے۔ علمی نظر سے تو بالیقین یہ توقع ہوتی ہوگی کہ اس قسم کی بے ہنگام انتخابی مشین اُس وقت تک دوسرے درجے میں شمار ہونے کے قابل ہوگئی ہوگی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ جلیل القدر قوم انقلابی و پارلیمنٹی حکومتوں کے درمیان زیر و زبر ہو رہی ہے اور اب حکومت کی انقلابی صورت کے تحت میں ہے اور یہ وہ سب سے زیادہ جلیل القدر قوم (جسے شاید بسمارک کے کارناموں کے بعد براعظم کی دو سب سے زیادہ جلیل القدر قوموں میں سے ایک کہنا چاہیئے) یعنی فرانس اپنے حکمراں کا انتخاب پیرس کی سڑکوں پر کرتا ہے۔ خوشامدی یہ خیال

ظاہر کریں گے کہ یہ عمومی شہنشاہی موروثی ہوجائیگی مگر بارکیہ ہین مصر جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوسکتا - اس حکومت کا تصور یہ ہے کہ شہنشاہ قوم کی اہلیت وقابلیت، قوم کے عزم دوامی، اور قوم کے ادراک واحساس سب کی نمایندگی کرتا ہے، مگر کوئی خاندان ایسا نہیں ہوسکتا جس میں پشتہا پشت تک اس کام کی انجام دہی کا دل ودماغ باقی رہے بلکہ اس کام کی انجام دہی کی نصف قابلیت بھی اس میں باقی نہ رہیگی - نیابتی مطلق العنان کا انتخاب لڑجھگڑکر ہونا ضروری ہے جیسے کہ نپولین اول اور نپولین سوم کے انتخابات ہوئے ہیں۔ اس قسم کی حکومت میں اور جو کچھ بھی خرابیاں ہوں مگر اس قدر اغلب ہے کہ اور حکومتوں کے بہ نسبت اس کا نظم ونسق زیادہ بہتر اور بہت زیادہ قابلانہ ہوگا - حکومت کا سرتاج بالضرور ایک نہایت ہی پختہ کار قابلیت کا شخص ہوگا، جب تک وہ ایسا نہ ہوگا وہ اپنے منصب پر قائم نہیں رہ سکتا بلکہ اُسے اپنی جان کا بچانا بھی دشوار ہوجائیگا - اس کا مستقد کار ہونا یقینی ہے - کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ غافل ہوا تو اُس کا اقتدار بلکہ شاید اس کا سر بھی جاتا رہیگا - انقلاب کے دبائے رکھنے میں اس کی سلطنت ناخنوں تک کا زور لگادیتی ہے - یہاں سیاسی مسائل میں سب سے زیادہ مشکل مسئلے کا حل کرنا ہے یعنی ایک وقت میں قوم کو پوری طرح قابو میں بھی رکھنا ہے اور پوری طرح خوش بھی کرنا ہے حکام عالا کا ازمنہ وسطیٰ کی زرہ آہنی کی مانند ہونا ضرور ہے کہ نہایت درجہ سخت بھی ہو اور نہایت درجہ لوچدار بھی ہو - اُسے ایسی دل پسند جدتوں کو گوارا کرلینا چاہیئے جن سے کوئی نقصان نہ پہنچتا ہو اور جن سے کسی خطرے کا احتمال ہو انھیں روکنا ضرور ہے - پرانی چیزیں جو اچھی اور موزوں ہیں انھیں قائم رکھنا چاہیئے اور جن سے دقت وتکلیف ہوتی ہو انھیں بدل دینا چاہیئے - آمر مطلق اگر چاہے تب بھی وہ خراب وزیر کا تقرر نہیں کرسکتا - میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ حکام کے انتخاب میں اس قسم کا مطلق العنان پارلیمنٹ سے افضل ہوتا ہے - وہ بہتر طور پر جانتا ہوگا کہ نئے دل ودماغ کو آزمودہ کار دماغ کے ساتھ کس طرح ملائے، ان دونوں کے بہتر اجتماع وامتزاج کے لئے اس کے وجوہات زیادہ قوی ہوں گے یہاں

یہ نظر آجاتا ہے کہ تمام انتخاب کنندوں میں بہترین انتخاب کنندہ انتہائے وقت نظر سے انتخاب میں کام لے رہا ہے۔ مگر انگلستان میں مجھے یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ حکمرانوں کے انقلابی انتخاب میں نظم ونسق کی خوبی کار کی جو قیمت دینی پڑتی ہے وہ اُس کے نفع سے بے انتہا زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ وہ اپنے تباہی انگیز حوادث ناگہانی کی وجہ سے (سلطنت کی) ساکھ کو نقصان پہنچا دیتی ہے۔ درمیان میں ایسے وقفے آپڑتے ہیں کہ وہ جان ومال کی حفاظت نہیں کرتی، ہر طرح کی خوشحالی کے باوجود اُس کی تہ میں خطرہ قائم رہتا ہے، کسی واقعی قابل مطلق العنان کے مہیا کرنے میں اُسے برسوں گزر سکتے ہیں، اور درمیان درمیان میں جو ناقابل اشخاص آتے ہیں، اُن کا دور خرابیوں سے بھرا ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی موزوں مطلق العنان ملے مگر اس کے بعد ہی فوراً اس کا انتقال ہوجائے، تمام نظم ونسق اور تمام دیگر امور اسی کے رشتۂ حیات کے ساتھ بندھے ہوتے ہیں۔

لیکن اس ہولناک انقلابی حکومت کو مستثنیٰ کر کے، اگر پارلیمنٹی حکومت اصولاً دوسری تمام مدمقابل حکومتوں کے بہ نسبت انتظامی خوبی میں بڑھی ہوئی ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ انگریزی حکومت جو بلا ردوکد تمام پارلیمنٹی حکومتوں میں بہترین حکومت ہے، وہ اپنی انتظامی خوبی کے لیے ممدوح نہیں ہے، وہ بہت سے امور کے لیئے ممتاز ہے، پھر اس خصوص میں وہ ممتاز کیوں نہیں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ عام یقین کے موافق ممتاز ہونا تو درکنار، کچھ اور ہی خیال پھیلا ہوا ہے۔

اس عام خیال کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ انگریزی حکومت بہت زیادہ کاموں کی کوشش کرتی ہے۔ سب سے زیادہ انگلستان کے فوجی نظام پر اعتراض ہوتے ہیں۔ معترض کہتے ہیں کہ انگریز اپنی فوج پر بڑی سے بڑی فوجی بادشاہتوں کے مقابلے میں زیادہ روپیہ صرف کرتے ہیں۔ اور پھر بھی نتیجے میں پیچھے رہتے ہیں لیکن یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ انگریز جس امر کی سعی کرتے ہیں وہ دوسروں سے مقابلے میں بے انتہا دشوار ہے۔ برّاعظم کی بادشاہتوں کو صرف اپنے مربوط یورپی مملکتوں کی حفاظت کرنا ہے اور وہ بھی ان کثیر التعداد سپاہیوں کے ذریعے سے جنھیں

وہ لڑنے پر مجبور کر سکتی ہیں، انگریز بغیر کسی جبر کے صرف ایسے سپاہیوں کے ذریعے سے جنھیں وہ خدمت پر راغب کر سکیں، اُن ممالک کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں جو وسعت میں تمام یورپ سے بدرجہا زیادہ بڑھے ہوئے اور تمام ربع مسکون میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ انگلستان کا ہارس گارڈز اور وزارت حربیہ نا مکمل ہی کیوں نہ ہوں (اور میرا یقین ہے کہ وہ مکمل نہیں ہیں) لیکن اگر انھیں بزور قانون رنگروٹ منتخب کرنے کا اختیار مل جائے یعنی پرشیا کی طرح انھیں چند برس کے لیے ہر شخص کے وقت پر کلی اقتدار اور بعد کو جب چاہیں اُنھیں طلب کرنے کا حق حاصل ہو جائے تو پھر جس آسانی و سرعت سے کام انجام پائیگا اسے دیکھ کر ہم متحیر ہو جائینگے مجھے اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ انگریز ایک طرز خاص پر جو کچھ انجام دیتے ہیں اُسے برا عظم کا کوئی ماہر سپاہی ناممکن قرار دے کر مسترد کر سکتا ہے۔ وہ اُسکی ہمت ہی نہ کرے گا کہ ایک نہایت منتشر شہنشاہی کو (جس میں بہت سے جزیرے شامل ہوں اور جس کا ہر برا عظم میں ایک طول طویل خط سرحد ہو اور جس کے مرکز میں غنیمت کا نہایت ترمال پڑا ہوا ہو) اس شہنشاہی کی وہ بعض ایسے رضاکار رنگروٹوں کے ذریعے سے حفاظت کرے جن میں سے اکثر قوم کے نہایت ہی بدترین طبقے سے آتے ہیں اور جنھیں ڈیوک اعظم ''دنیا کا تلچھٹ'' کہا کرتا تھا، جو ہر سال غیر متیقن تعداد میں آتے ہیں، اور ممکن ہے کہ جس سال ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہو اسی سال وہ کسی سیاسی واقعے کی وجہ سے کافی تعداد میں نہ آدیں یا بالکل ہی نہ آویں گے انگلستان کی وزارت حربیہ اُس کام کی ہمت کرتی ہے جسے برا عظم کی وزارت حربیہ ہاتھ بھی نہ لگائیگی (اور شاید اُن کا ایسا کرنا بجا ہوگا) برا عظم کے افسروں کو بے اندازہ قوت کے وہ ذرائع حاصل ہیں جو انگلستان کے افسروں کو میسر نہیں ہیں، حالانکہ ان آخر الذکر افسروں کو زیادہ سخت تر کام کرنا پڑتا ہے۔

مزید براں، انگریزی فوج بحری کو اتنے سواحل اور اتنے توابع کی حفاظت کرنا پڑتی ہے جو برا عظم کی ہر ایک سلطنت کے سواحل و توابع سے بدرجہا زیادہ ہیں، اور انگریزی میدان عمل کی وسعت اس وقت بھی خاص الخاص دشواری کا باعث ہو رہی ہے جس سے انگریزوں کو جہازات و اسلحہ کا بہت بڑا ذخیرہ مہیا رکھنا پڑتا ہے مگر

دوسری طرف نہایت ہی اہم وجوہ اس امر کے موجود ہیں کہ انھیں اتنا زیادہ سامان نہ رکھنا چاہیئے۔ بری وبحری دونوں قسم کے فنون جنگ ارتقا کی حالت میں ہیں۔ آج کی آخری دریافت کل کو بیکار ہو جاتی ہے اور اس کے برعکس کوئی اور اختراع نکل آتا ہے۔ جہازوں اور توپوں کے بہت زیادہ جمع کر لینے میں یقیناً بہت سا سامان ایسا ہوگا کہ جب کام کا وقت آویگا تو وہ سب بے مصرف اور غیر موزوں ہوگا۔ محکمۂ بحری کے خلاف دو شور مچے ہوئے ہیں اور دونوں ساتھ کے ساتھ چل رہے ہیں، ایکطرف تو یہ غوغا برپا ہے کہ "ہمارے پاس جہازات کافی نہیں ہیں، امدادی جہاز بالکل نہیں ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ کوئی بحری قوت ہی نہیں ہے" دوسری طرف یہ چیخ پکار ہو رہی ہے کہ وہ ہمارے تمام جہازات، ناقص، تمام توپیں ناقص اور جو کچھ ہے سب ناقص ہے امیر البحری نے اپنے اس احمقانہ خبط میں کہ جہاں تک ہو بناتے جاؤ، ایسے وقت میں جہازات تعمیر کیئے، جب اُسے انتظار کرنا چاہیئے تھا، اُس نے از کار رفتہ ایجادات کا ایک عجائب خانہ بنا کر کھڑا کر دیا ہے مگر کام کی کوئی چیز مہیا نہیں کی ہے" ایک دوسرے سے مغائر روش کے دونوں شور ساتھ کے ساتھ چل رہے ہیں اور انگلستان کی حکومت عاملانہ پر بالکل قلم کھینچ دیا ہے مگر حکومت عاملانہ کے لیئے ایس سے ہر ایک دوسرے کے مقابلے میں مدافعت کا کام کر دیتا ہے۔

مزید براں انگلستان کی وزارت داخلہ کو ایسے مشکلات سے کشاکش کرنا پڑتی ہے جن سے دوسرے ممالک کی وزارتوں نے مدت سے خلاصی حاصل کر لی ہے۔ انگریز خود مختار مقامی اقتدارات کو پسند کرتے ہیں جو دور اُفتادہ اقتدار کے چھوٹے چھوٹے مرکز ہوتے ہیں۔ دار الصدر کے عاملانہ حکام جس وقت کام کرنے کے بہت ہی زیادہ خواہاں ہوتے ہیں، وہ اس وجہ سے موثر طور پر کام نہیں کر سکتے کہ یہ مقامی جماعتیں مذبذب ہوتیں اور مباحثے کرنے لگتی ہیں بلکہ عدم اطاعت تک نوبت آجاتی ہے۔ مگر مقامی خود مختاری پارلیمنٹی حکومت کے لیئے لازم و ملزوم نہیں ہے۔ کسی ملک میں مقامی آزادی جس حد تک خوشگوار ہو سکتی ہے باعتبار حالات اسکے مختلف درجے ہوتے ہیں اور کوئی پارلیمنٹی حکومت اُس کی کسی ایک حد پر قائم ہو سکتی ہے۔ یقیناً ہمیں یہ نہ کرنا چاہیئے کہ انگلستان میں غربا کے متولیوں نے جو خاص خاص خرابیاں برپا کر رکھی ہیں؛

ہم پارلیمنٹی حکومت پر بہ حیثیت ایک عام و قابل عمل نظم سلطنت کے ان عیوب کا دھبہ لگا دیں، اگرچہ انگلستان میں پارلیمنٹی حکومت پر ہر روز یہ داغ لگتا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ، ادھر انگلستان کے نظم ونسق میں یہ مخصوص مشکل درپیش ہے، ادھر اس سے مقابلہ کرنے والے دوسرے ممالک کے نظم ونسق کو ایک خاص نفع حاصل ہے۔ غیر ممالک میں جو شخص حکومت کا ایک پرزہ ہوتا ہے وہ ایک اعلےٰ و برتر شخص سمجھا جاتا ہے۔ وہ باقی تمام دنیا سے بلند درجے پر ہوتا ہے، اور تمام دوسرے اشخاص اس پر رشک کرتے ہیں۔ اس حکومت کو بہت آسانی سے یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ قوم کے چیدہ چیدہ افراد کی جماعت بن جائے۔ تمام فطین و ذکی اشخاص حکومت کے تحت میں ہونے کے شایق ہوتے ہیں اور دوسری جگہ انھیں مشکل ہی سے اطمینان حاصل ہوتا ہے مگر انگلستان میں اس قسم کی کوئی فوقیت نہیں ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ انگریزوں میں اس قسم کا احساس بھی نہیں ہے۔ انگریز دفتر اسٹامپ کے کسی محرر یا آبکاری کے کسی مددگار کی کچھ وقعت نہیں کرتے، اور ایک مالدار بنیا یہ سمجھتا ہے کہ وہ ان دونوں سے بہت بلند ہے۔ انگلستان کی حکومت نیچے درجے کی محرری میں بہترین افراد کی قابلیت کو محض اعزاز و وقعت کے ذریعے سے سستے داموں خرید نہیں سکتی، اور کوئی حکومت اتنی مالدار نہیں ہے کہ وہ نقد روپیہ دے کر اس قابلیت کو بہت زیادہ خرید سکے۔ انگلستان کے تجارتی مواقع و ذرائع بہترین حوصلہ مند افراد کو اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں۔ غیر ملکی دفاتر قوم کے بہترین آدمیوں کے انتخاب سے بہرے ہوتے ہیں، مگر انگلستان کے دفتروں میں بہترین آدمیوں میں سے شاید چند ہی اشخاص داخل ہوتے ہوں۔

لیکن پارلیمنٹی حکومت کے اصول اور اس کے بے خلل موثرات کے موافق انگلستان کے سرکاری نظم ونسق کو جیسا عمدہ ہونا چاہیئے، اس کے ویسا نہ ہونے کے وجوہ صرف یہی نہیں ہیں بلکہ یہ تو اس کے خاص اسباب بھی نہیں ہیں، دو اہم اسباب اپنا کام کر رہے ہیں، جن کے نتایج گوناگوں جزئیات میں پھیل گئے ہیں تاہم انکی اساسی نوعیت کو مختصراً بیان کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے پہلا سبب تو انگریزوں کی جہالت ہے۔ ایک آزاد حکومت اصلاً و واقعاً ایک ترغیبی حکومت ہے، اور جن لوگوں کو

ترغیب دینا ہوتا ہے اور جو لوگ ترغیب دینے والے ہوتے ہیں، جیسے وہ ہوں گے ویسی ہی حکومت بھی ہوگی۔ انگلستان کے نظم ونسق کے متعدد اجزا میں انگریزوں کی انتہائی جہالت کا اثر صاف عیاں ہے۔ جو رائے اب شائع ہے اُسکے بموجب انگلستان کی خارجی حکمت عملی سالہا سال سے، بے جوڑ، لاحاصل اور کبھی کچھ اور کبھی کچھ ہوتی آئی ہے۔ اُس کی نظر کسی پہلو سے قائم کئے ہوئے مقصود پر نہیں ہے، نہ اُس کی بنیاد کسی ایسے اصول پر ہے جو بالاستقلال پہلے سے قرار دے لیا گیا ہو۔ مجھے یہاں اتنا موقع نہیں حاصل ہے کہ میں اس بحث میں پڑوں کہ اِس قطعی نقص کو کس قدر زیادتی یا کمی کے ساتھ قبول کرنا چاہیئے، لیکن میں اس سے کلی اتفاق کرتا ہوں کہ ادھر حال کی خارجی حکمت عملی بہت ہی سخت الزام کا موجب قرار پا سکتی ہے لیکن کیا یہ معجزے سے کم ہوتا کہ جب انگریزی قوم خود اپنی حکمت عملی کی سربراہی کرتی اور وہ جیسی کچھ ہے ویسی ہی ہوتے ہوئے، اس سے کسی اچھی حکمت عملی کی طرف رہبری کرتی؟ کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ سب قوموں سے بڑھ کر یہ قوم تمام دُنیا سے الگ تھلگ ہے، اس کا محل وقوع اور اُس کی طبیعت سب سے منقطع و منفرد (ایک جزیرے تک محدود) ہے، خواہ اس میں اچھائی ہو یا برائی۔ کیا وہ عام یوروپی اسباب و نتائج کی رو سے علحدہ نہیں ہے؟ کیا وہ ایک ایسی قوم نہیں ہے جو دوسروں کو نظر حقارت سے دیکھتی ہے؟ کیا وہ ایک ایسی قوم نہیں ہے جسے جدید دُنیا کی بابت کوئی خاص تعلیم و تربیت حاصل نہیں ہے؟ اور اکثر اس قسم کی تربیت سے وہ متنفر رہتی ہے، ایسی قوم سے کون یہ توقع کر سکتا ہے کہ وہ غیر ملکی معاملات کے جدید و عجیب حالات پر حاوی ہو جاوے گی؟ بجائے اس کے کہ اس امر پر تعجب کیا جائے کہ خارجی حکمت عملی کے متعلق انگریزی پارلیمنٹ ناکارہ ثابت ہوئی ہے میرے خیال میں تعجب اس امر پر کرنا چاہیئے کہ انگریزوں نے جو کچھ کیا اُسے اس خوبی سے کیسے کیا، اور اس قوم کے باطن میں جو بھدا اور مبہم تصور دائر و سائر ہے یہ اُس کی ایک دوسری علامت و نشانی ہے۔

ورائے ازیں، خاص پارلیمنٹی دستور سیاسی سے ممیز، انگریزی نظام سلطنت کے تصور ہی میں یہ امر داخل ہے کہ اُس میں وہ نمائشی۔ آرائشی حصص بھی شامل ہیں یہ وہ

حصص ہیں جنھیں حقیقی فائدے کے لیئے قائم نہیں رکھا گیا ہے بلکہ ایک غیر تربیت یافتہ اور بھدی طبیعت کی قوم کے خیالات پر ان کا جو دلفریب اثر پڑتا ہے اس کے لیئے انھیں قائم رکھا گیا ہے۔ اس قسم کے تمام اجزا و عناصر خالص خوبی کار کی تخفیف کا موجب ہوتے ہیں۔ ان کی مثال بعینہ ان زاید حلقوں کی ہے جو ازمنہ وسطی کی گھڑیوں میں محض آرائش کے لئے لگائے جایا کرتے تھے، جن سے چاند کی روزانہ ہیئت یا نظام شمسی کی کیفیت معلوم ہوا کرتی تھی، یا جن کے ذریعے سے چھوٹے چھوٹے آدمی یا طیور عجیب و غریب طرح سے اندر باہر آتے جاتے تھے۔ اس قسم کے تمام آرائشی کام تصادم و غلطی کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس سے وقت کے صحیح طور پر معلوم ہونے میں خلل پڑ جاتا ہے، ہر ایک نیا پیچ عدم تکمیل کا ایک نیا سبب بن جاتا ہے۔ پس اسی طرح اگر کسی شخص کو کوئی اختیار و اقتدار کام کے لیئے موزوں ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے دیا جائے کہ اس میں کوئی خیالی خوبی ہے تو وہ علی العموم عمدہ نظم و نسق میں روڑے اٹکا دیگا۔ ممکن ہے کہ وہ جزئیات کے عمدہ کاموں سے بڑھ کر کوئی دوسرا کام انجام دے سکے مگر وہ جزئیات کے عمدہ کاموں کو تباہ کردے گا۔ انگریزی طبقۂ اعیان اکثر اس قسم کا ہے۔ اس وقت تک اسے قوم پر بہت وسیع اثر حاصل ہے۔ اور زمانہ سابق میں تو بے انتہا اثر حاصل تھا مگر کوئی شخص بھی کسی اعیانی خاندان کے لڑکوں کو نظام ملکی کے عہدے کیلیئے موزوں و مناسب سمجھ کر انتخاب نہ کرے گا۔ کاروباری واقفیت، کاروباری تربیت اور کاروباری عادات کے حاصل کرنے میں انھیں خاص نامساعد حالات کا سامنا رہتا ہے اور کسی خاص قسم کے فوائد انھیں حاصل نہیں ہوتے۔

جس قسم کے منتظمان ملکی کے ہونے کی ضرورت ہے اُن کے مہیا کرنے کے لیئے انگلستان کا طبقۂ متوسط بھی نہایت ہی ناموزوں ہے۔ میں اس وقت اس امر پر بحث نہیں کر سکتا کہ انگریزوں کی تعلیم کے متعلق جو کچھ کیا جاتا ہے وہ سب کسی درست بنیاد پر مبنی ہے یا نہیں۔ اس تعلیم کے متعلق ایک بہت اعلیٰ صاحب الرائے نے یہ کہا ہے کہ وہ "ادعائے، ناکافی غیر درست ہے"، مگر میں یہ کہونگا کہ کاروباری آدمی میں جو بات ہونا چاہیئے یہ تعلیم اس قابل نہیں بناتی۔ ابھی تھوڑا ہی زمانہ گزرا ہے

کہ ایک ساہوکار کے محرر کے لیئے جن نہایت معمولی قابلیتوں اور عادتوں کی حاجت ہوتی ہے وہ نایاب و نادر سمجھی جاتی تھیں۔ جس قسم کی تعلیم انسان کو عملی زندگی کے اعلیٰ مناصب کے قابل بناتی ہے وہ تو اور بھی نایاب تھی، اس امر پر بھی پوری طرح اتفاق نہیں ہو سکا کہ اس تعلیم کو ہونا کیسا چاہیئے۔ جب تک اہل انگلستان کی کاروباری تعلیم ویسی ہی عمدہ نہ ہو جیسی دوسرے ممالک کی تعلیم ہے اس وقت تک انگلستان کے سرکاری عہدہ داروں میں دوسرے ممالک کے مماثل عہدہ داروں کی خوبی نہیں آسکتی[ا]۔

لیکن انگلستان کے نظم و نسق کے پست کرنے میں، انگریزوں کی جہالت اگرچہ ایک قوی وجہ ہے مگر دوسرے اسباب اور بھی زیادہ قوی ہیں۔ غالباً وہ غیر ممالک کے نظم و نسق انگریزوں کے نظم و نسق سے بہتر ہیں اور ان دونوں میں کچھ ایسی باتیں ہیں جو انگریزوں کے ہاں نہیں ہیں، ان دونوں ممالک کے نظم و نسق کی تنظیم و ترتیب ایک صاحب ذکا و فہم کے ہاتھوں سے انجام پائی تھی جس نے کامل غور و خوض کے بعد انھیں ایک خاص طور پر قرار دیا تھا۔ فرانسیسی انقلاب نے نپولین کے لیئے ایک صاف میدان مہیا کر دیا تھا اور اسی پر اس نے اپنی عمارت کھڑی کی۔ اگرچہ اس تعمیر کے ساتھ جدت و ندرت کے جو اوصاف کسی وقت میں منسوب کیئے جاتے تھے وہ فی الواقع صحیح نہیں تھے، ٹوک ویل اور لاویرنی نے یہ دکھا دیا ہے کہ جو عمارت قدیم دور حکومت میں ازمنۂ وسطیٰ کے پیچ بیچ تہ بہ تہ حجابات میں نہاں ہو گئی تھی اس کو صاف کر کے اس نے ایک عمارت پیدا کر دی۔ لیکن ہمیں اس وقت جس چیز سے بحث ہے وہ نپولین کی جدت و ندرت نہیں ہے بلکہ اس کا کام ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے اس نے فرانس کے نظم و نسق کو ایک پر زور، مربوط و پایدار بنیاد پر قائم کر دیا۔ بعد کی حکومتیں صرف اسی کل کو چلاتی رہیں ہیں جو انھیں نپولین سے ورثے میں ملی ہے۔ یہی کام فریڈرک اعظم نے پرشیا کی نئی بادشاہت میں انجام دیا۔ فرانسیسی و پرشیاوی دونوں نظامات نئی کلیں تھیں، جو متمدن زمانے میں اپنے مخصوص کام کے لیئے بنائی گئی تھیں۔

[ا] ہمیں اس لکھنے سے مسرت حاصل ہوتی ہے کہ یہ خرابی بہت کچھ کم ہوتی جا رہی ہے۔ گزشتہ پچیس برس کے اندر طبقۂ متوسط کی مدرسی تعلیم میں، حیرت انگیز ترقی ہو گئی ہے۔ (مصنف)

انگریزی عہدے جب سے قائم ہوئے ہیں، اُس وقت سے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ
اُن کی ترتیب ایک دوسرے کے تعلق کے اعتبار سے کی گئی ہو بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب
ہوگا کہ وہ کبھی (بالارادہ) قائم نہیں کئے گئے بلکہ ہر ایک نے مخصوص طور پر ترقی کی۔
انگلستان کے ازمنۂ وسطیٰ میں سرکاری ادارات میں جس قسم کی آزادانہ تجارت،
رائج تھی وہ نہایت ہی تعجب انگیز معلوم ہوتی ہے۔ عدالت شاہی، عدالت عامہ،
عدالت خزانہ، انگلستان کی ان تینوں عدالتوں نے محض وصول معاوضہ کی خاطر سے
اپنے ابتدائی محدود حلقے کو مقدمات کے تمام عرض وطول پر پھیلا دیا۔ قدیم مثل یہ تھی کہ
"اچھا جج وہ ہے جو اپنی عدالت کی آمدنی کو بڑھادے" یعنی خود اپنی اور اپنے ماتحتوں
کی آمدنی میں اضافہ کرے۔ مرکزی انتظام (یعنی خزانہ) عدالتوں سے انکے وصول کردہ روپے
کا حساب نہیں پوچھتا تھا اور جب تک کہ خود خزانے سے کچھ ملنے کا مطالبہ نہ کیا جائے،
اس وقت تک وہ مطمئن رہتا تھا۔ ابھی پچھلے سال کی بات ہے کہ اس نظام کے بہت سے
باقیات میں سے ایک شوشہ نکل آیا جس نے تمام ہی لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔
دفتر اسناد ایجادات کے ایک محرر نے فیس میں سے کچھ رقم چرالی، اور اس انیسویں صدی
میں لوگوں نے بالطبع یہ خیال کیا کہ فرانس کی طرح یہاں بھی اعلےٰ مالی وزیر یعنی
چانسلر آف دی اکسچکر (وزیر خزانہ) اس کا ذمہ دار ہوگا، مگر انگلستان کا قانون کسیقدر
مختلف تھا، دفتر اسناد ایجادات "لارڈ چانسلر" کے تحت میں تھا، اور اس لیئے یہ
کام لارڈ چانسلر کا تھا کہ وہ وہاں کی آمدنی کی نگرانی رکھے مگر عدالتوں کے کاموں میں وہ
جس طرح مصروف رہتا ہے اس کے لحاظ سے یہ یقینی ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ
عدالت خزانہ بھی انگلستان کی ان بہت سے تنظیمات میں سے ہے جن کی ہستی آزادانہ مقابلے
پر منحصر ہے۔ پارلیمنٹ کے ایک قانون کا یہ منشا ضرور ہے کہ دفتر اسناد ایجاد کے رقوم
"اکسچکر" (خزانہ) میں داخل کیئے جائیں اور اسی لحاظ سے وزیر خزانہ ہی اس معاملے میں
ذمہ دار سمجھا گیا مگر یہ صرف انھیں لوگوں کا خیال تھا جو اصلیت سے واقف نہیں ہیں۔
انگریزوں کے نظام کے مطابق تو چانسلر آف دی اکسچکر (وزیر خزانہ) اکسچکر (خزانہ) کا گویا دشمن ہے
قوانین کا ایک طومار اس غرض سے موجود ہے کہ خزانے کو اس وزیر سے محفوظ رکھا جائے۔
ابھی چند ماہ قبل تک ایک نہایت پرمنفعت عہدہ "محاسب خزانہ" کا تھا جس کا منشا

یہ تھا کہ خزانے کو "ودچانسلر" سے محفوظ رکھے اور اس عہدے پر جو آغری شخص (لارڈ ہانٹیگل) سرفراز تھا وہ یہ کہا کرتا تھا کہ وہ انگریزی نظام سلطنت کا قطب ہے۔ یہاں اتنی وسعت نہیں ہے کہ میں اُس کے منشا کی تشریح کروں اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہے، مطلب صرف اس قدر ہے کہ تاریخی پیچیدگیوں کے ایک متوارث سلسلے کی وجہ سے ایک ایسے دفتر کا خائن محرر جیسے مقدمات سے سروکار نہیں اُسے بالطبع جس حاکم کے تحت میں ہونا چاہیئے یعنی وزیر مالیات وہ اس کے تحت میں نہیں ہے بلکہ ایک دور افتادہ جج کے ماتحت ہے جس نے کبھی اس کا ذکر نہیں سنا ہے۔

لارڈ چانسلر کے تمام فرائض بے ربطیوں کے انبار ہیں - وہ جج ہے اور یہ امر بدیہی اُصول کے خلاف ہے کہ انتظام ملکی کا کوئی جزو کسی جج کے سپرد کیا جائے۔ یہ نہایت ہی اہم معاملہ ہے کہ عدالت کے نظم ونسق کو ہر طرح کے نا رواترغیبات سے صاف رکھا جائے۔ بایں ہمہ، انگلستان کا اعلیٰ جج، لارڈ چانسلر، کابینہ میں شریک ہوتا اور دارالامرا میں فریقانہ تقریریں کرتا ہے۔ لارڈ لنڈہرسٹ ٹوری فریق کے رہبروں میں سے تھا، اور اس پر بھی اوکانل کے مقدمے میں وہی میر مجلس تھا، لارڈ وسٹبری نے اساقفہ سے شدید تنازعہ برپا کر رکھا تھا مگر یہ امر اُسے کتاب "مقالات وتبصرات" پر فیصلہ صادر کرنے سے باز نہیں رکھ سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ لارڈ چانسلر صرف اس وجہ سے کابینہ میں داخل ہوگیا کہ بادشاہ کی ذات سے قرب حاصل ہونے کی وجہ سے درباری مدارج میں اُس کا درجہ بلند تھا، ورنہ کابینہ میں اُس کا شمول کسی صحیح یا غلط سیاسی اصول پر مبنی نہیں ہے۔

ایک دوست نے مجھ سے ایک مرتبہ یہ کہا کہ ایک زیرک اطالوی نے اُس سے انگلستان کے خاص خاص عہدہ داروں کے متعلق سوال کیا، تو اُسے اُن کے فرائض کے بیان کرنے میں سخت حیرانی پیش آئی، اور خاصکر اُن کے القاب کے ساتھ اُن کے فرائض کا تعلق دکھانے میں تو بڑی ہی دشواری ہوئی۔ مجھے تمام صورتیں تو یاد نہیں ہیں مگر اتنا یاد آتا ہے کہ اُس اطالوی کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ کیا وجہ ہے کہ اوّل میر خزانہ (First Lord of the Treasury) بالعموم خزانے سے کوئی واسطہ کیوں نہیں رکھتا۔ اور "محکمۂ جنگلات" شہروں کی نالیوں کی نگرانی کیوں کرتا ہے۔ یہ گفتگو وبائے مواشی سے

برسوں قبل ہوئی تھی مگر میں تو اب ان وجوہ کے سننے کا شائق ہوں کہ اس بلا کا انتظام
دفتر پریوی کونسل کے ہاتھ میں کیوں دیا گیا تاریخی وجہ تو ضرور بتائی جاسکتی ہے مگر میری مراد
انتظامی وجہ سے ہے یعنی وجہ ایسی ہو جس سے صرف یہ ظاہر نہ ہوتا ہو کہ یہ کام
پریوی کونسل کے ہاتھ میں کیونکر آیا بلکہ یہ معلوم ہو کہ کیوں آئندہ یہ کام اس کے
ہاتھ میں باقی رہے۔

لیکن انگلستان کے سرکاری دفاتر کا بے اُصول و بے ربط انتظام اس سے زیادہ
حیرت انگیز نہیں ہے جتنا کہ ایک ہی مشترک مقصد کیلئے اُنکے انتظام کی مغائرت باہمی
حیرت انگیز ہے۔ چونکہ وہ سب کے سب انجام کار ایک پارلیمنٹی عہدہ دار کے
تحت میں ہیں، اس لیئے چاہیئے یہ تھا کہ ہر ایک دفتر کے اہم معاملات و اغراض کو
اُس عہدہ دار کے سامنے پیش کرنے میں اُن کو بہترین ذرائع حاصل ہوتے جب کوئی
نووارد شخص حکمران ہوتا ہے تو اُسے حصول معلومات کی ضرورت ہوتی ہے اور
چونکہ اکثر و بیشتر کام بہت کچھ یکساں ہوتے ہیں، اس لیئے چاہیئے تھا کہ ان انتظامات
کو اپنے خارجی سر دفتر کے روبرو پیش کرنے کا ذریعہ بھی بہت کچھ یکساں ہوتا کم از کم
اتنا تو ضرور ہونا چاہیئے کہ جہاں اس میں فرق ہو وہ فرق کسی وجہ پر مبنی ہو اور جہاں
یکسانی ہو وہ یکسانی بھی کسی وجہ پر مبنی ہو لیکن حالت یہ ہے کہ دو دفاتر بھی ایسے
نہیں ہیں جہاں پارلیمنٹی سر دفتر کے ساتھ مستقل عہدہ دار کے معینہ مشخصہ تعلقات
بالکل ایک سے ہوں۔ دیکھیئے فوج اور بیڑہ اپنی نوعیت میں بہت ہی یکساں ہیں۔
لیکن فوج میں ایک مستقل بیرونی دفتر ہے جسے "ہارس گارڈز" کہتے ہیں، اور کوئی دوسرا
دفتر اُس کے مثل نہیں ہے۔ بیڑے میں عجیب و غریب مجمع الاضداد ہے، یہاں ایک
"بورڈ آف ایڈمرلٹی" (مجلس امیر البحری) ہے جو ہر ایک حکومت کے ساتھ بدلتی رہتی
ہے اور جس کا کام یہ ہے کہ فرسٹ لارڈ (بیڑے کا امیر اول) جن امور کو نہ جانتا ہو اُنسے
آگاہ کرے۔ فرسٹ لارڈ (امیر اول) اور بورڈ (مجلس) کے تعلقات ہمیشہ آسانی سے
سمجھ میں نہیں آتے ہیں اور وزارت حربی اور "ہارس گارڈز" کے تعلقات تو نہایت ہی
ابتر ہیں۔ اس وقت تک یہ نوبت ہے کہ اُن کے متعلق ایک پارلیمنٹی کاغذ دار العوام کے
سامنے پیش ہوا ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ سر جارج لیوئس کے پاس جو کاغذ

موجود ہے اس سے آگے کوئی اور اساسی وقطعی کاغذ نہیں ملتا، اور سر جارج اب سے تین برس پیشتر وزیر جنگ تھے۔ ان دفتروں کی پریشان کن باتوں کی تو کوئی انتہا ہی نہیں ہے اور جب دفتروں میں ایک دوسرے سے مقابلے کا مرض مزمن ہو جائے تو ایسا ہونا لازمی ہے۔ بورڈ آف ٹریڈ (مجلس تجارت) کے دفتر میں، تو بورڈ (مجلس) کا نام ہی نام ہے، اور مدت سے اس مجلس کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ صدر اور نائب صدر تک انصرام معاملات کے لیئے پابندی کے ساتھ ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ آخرالذکر کے حکم تقرر میں اُس کا فرض صرف یہ قرار دیا گیا ہے کہ صدر کی عدم موجودگی میں وہ کام انجام دے، اور اگر دونوں میں یگانگت نہ ہو، اور صدر خود ہی کام کرنا چاہے تو پھر نائب صدر نہ کوئی کاغذ دیکھتا ہے اور نہ کوئی کام انجام دیتا ہے۔ خزانے میں بھی بورڈ (مجلس) کا ایک شائبہ موجود ہے مگر اس کے ارکان کو کسی قسم کا اختیار نہیں حاصل ہے اور یہ بالکل ویسے ہی عہدہ دار ہیں جن کی نسبت کیننگ نے یہ کہا تھا کہ ان کا وجود صرف اس لیئے ہے کہ اُن سے ایک ایوان بن جائے، اور قائم رہے اور وہ وزرا کی مصروفیت کے لیئے کار و بار مہیا کریں۔ وزارت ہند میں ایک معینہ کونسل (مجلس) ضرور ہے مگر وزارت مستعمرات جو ماتحت علاقوں اور نو آبادیوں پر حکمرانی کرتی ہے اسمیں کونسل کا کہیں پتا تک نہیں ہے۔ اور نہ کبھی رہا ہے۔ ان انواع و اقسام کے نظامات میں سے کوئی ایک نظام صحیح و درست ہو سکتا ہے مگر یہ دشوار ہے کہ وہ سب کے سب صحیح و درست ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی ایسے مستقل دفتر کے واقعی نظام کے متعلق جس پر ایک مستقل افسر اعلیٰ حکمراں ہو انگلستان میں صرف ایک مرتبہ بحث ہوئی ہے۔ یہ ایک مخصوص اور جامع الاقتدار معاملہ تھا اور اس کے متعلق اس وقت جو فیصلہ کیا گیا وہ کسی قدر مشتبہ سا تھا۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی منسوخ کی گئی اُس وقت ایک نئے دفتر انڈیا آفس" (وزارت ہند) کا قائم کرنا منظور تھا۔ متوفی مسٹر جیمز ولسن جو انتظامی معاملات میں ایک پختہ کار و صائب الرائے شخص تھے، اُنھوں نے اس وقت اس امر پر زور دیا تھا کہ کوئی کونسل (مجلس) اسمانہ مقرر ہونا چاہیئے بلکہ ایک کابینی وزیر کی حقیقی کونسل چند بڑی تنخواہوں کے پوری طرح کام کرنے والے ذمہ دار معتمدین پر مشتمل ہونی چاہیئے اور وزیر اپنے حسب صوابدید

جب چاہے اُن سے انفراداً یا اجتماعاً مشورت کرلیا کرے۔ مسٹر ولسن اس رائے پر بھی قائم تھے کہ ایسے معتمدوں کا قابل ولایق ہونا ضروری ہوگا، کیونکہ کوئی وزیر کسی ایسے عہدے پر جو اس سے اس قدر قرب رکھتا ہو اور جس سے بہت زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہو کسی بیوقوف کو مقرر کرکے اپنی آسائش کو اس پر نثار نہیں کریگا اور نہ اپنی شہرت کو خطرے میں ڈالیگا۔ مجلس کے کسی رکن کا نااہل ہونا آسانی سے نبھ سکتا ہے۔ اگر کچھ دوسرے ارکان اور میر مجلس قابل ہیں، تو ایک یا دو احمقوں کے شامل کرلینے کا کچھ پتا نہ چلے گا، وہ اپنی تنخواہ پاتے رہیں گے اور کچھ کام نہیں کریں گے لیکن ایک مستقل نائب وزیر جسے نہایت ہی اہم معاملات کی حقیقی نگرانی تفویض ہو اس کا قابل ہونا لازمی ہے، ورنہ اُسکے بالادست پر الزام آجائیگا اور " پارلیمنٹ میں غل مچ جائے گا "

میں یہاں اس امر پر بحث نہیں کرنا چاہتا اور میں اُس کی اہلیت بھی نہیں رکھتا کہ سرکاری دفاتر کی ترتیب دینے اور پارلیمنٹی سردفتر کے ساتھ اُن کے توازن کے قائم کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے، کسی شخص کا جسے مخصوص تجربہ نہ حاصل ہو اس مسئلے پر غور کرنا اس وقت تک کچھ سودمند نہیں ہوسکتا جب تک کہ ماہر اشخاص کی شہادت تحریراً موجود نہ ہو لیکن اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ مسٹر ولسن نے جو تجویز پیش کی تھی وہ انگلستان کے نظم و نسق کے سب سے زیادہ کامیاب جزو یعنی " مداخل و مخارج " (Wugs and means) کے متعلق عمل میں لائی جاتی ہے۔ چانسلر آف دی اکسچکر (وزیر خزانہ) جب موازنہ تیار کرتا ہے تو محکمۂ مداخل کے ذمہ دار سردفتروں سے سرکاری آمدنی کے متعلق اُن کے تخمینے طلب کرتا ہے اور اس میں یہ اولین اصول مرعی رہتا ہے کہ کوئی تغیر نہ کیا جائے بلکہ سال ماسبق کے محصولوں ہی کو برقرار سمجھ لیا جائے۔ بعد میں اگر وہ کسی تغیر کی ضرورت سمجھتا ہے تو وہ اُس کے متعلق خود ہی اطلاع طلب کرتا ہے۔ اگر وہ خزانے کے تمسکات کی تجدید کرنا یا بدلنا چاہے میں اس کے متعلق کوئی کارروائی کرنا چاہتا ہے تو وہ " دفتر قرضۂ قومی " کے سب سے زیادہ قابل ذمہ دار شخص اور اُس کے ساتھ ہی خزانے کے سب سے قابل و ذمہ دار شخص کی رائے لیتا ہے۔ مسٹر گلیڈسٹن اس دور میں سب سے بڑے " چانسلر آف دی اکسچکر " ہوئے ہیں، (بلکہ دوسرے اختیارات سے بھی نہایت ہی بلند پایہ وزرائے خزانہ میں ایک

انھیں بھی سمجھنا چاہیئے ۔) انھوں نے اکثر خلاف عادت ان ماہر ذمہ دار مشیروں کی احسانمندی کا اظہار کیا ہے ۔ جو شخص خود کو جتنا ہی زیادہ جانتا ہے، وہ اتنا ہی زیادہ اشتراک عام کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہے اور اتنا ہی زیادہ اس امر کا تیقن ہے کہ وہ اُنسے مشورہ چاہیگا اور اُن کی قدر کریگا جو قابلیت کا نتیجہ اور تجربے کا ثمر ہوں ۔ یہ یقین کہ اس اصول سے اچھا ثمرہ حاصل ہوتا ہے بلا چون وچرا تسلیم کیا جاتا ہے کہ انگلستان کا موازنہ دنیا میں بہترین موازنہ ہوتا ہے ۔ کیا وجہ ہے کہ اگر یہی طریقہ دوسرے انتظامات پر بھی عاید کیا جائے تو دوسرے انتظامات بھی ایسے ہی اچھے نہوں ۔

یہ تحریر ابتداً جس طرح لکھی گئی تھی، میں اسی طرح چھوڑے دیتا ہوں، کیونکہ اس میں یہ دعوے نہیں کیا گیا ہے کہ اس کی بنا میری ہی ذاتی معلومات پر ہے، بلکہ اس میں تو اعلیٰ اسناد کی بنا پر ایک طرح کی تجویز ظاہر کی گئی ہے ۔ تاہم حال کے تجربے نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ تمام بڑے بڑے انتظامی محکموں میں ایک نہ ایک مستقل ذمہ دار سر دفتر ہونا چاہیئے جس کے توسط سے بدلتے رہنے والے پارلیمنٹی افسر اعلیٰ ہمیشہ کارروائی کریں، جس سے وہ ہر ایک امر کا علم حاصل کریں اور جسے وہ ہر امر سے اطلاع دیں خزانے میں جو کام روزانہ ہوتا ہے وہ امیر البحری یا وزارت داخلہ کے کام کے مقابلے میں بالکل بے حقیقت ہے اور اس لیئے ایک واحد اعلیٰ سر دفتر کی چنداں ضرورت نہیں ہے مگر اُس وقت کی شہادتوں کا غلبہ اس جانب ہے کہ جن دفتروں میں بہت زیادہ کام ہوتا ہے اُن سب میں ایک نہ ایک اسی قسم کا سر دفتر ہونا لازمی ہے ۔

وزارت کے مفروضہ مانعات ومعدلات

میں اس سے قبل کا ایک خطبہ پارلیمنٹری حکومت کی شاہی وغیر شاہی شکل کی تفصیلی بحث کے مقابلہ کے لئے وقف کرچکا ہوں، اس میں میں نے یہ واضح کیا ہے کہ وزارت کی بنا کے وقت اور اس کے دوران قیام میں ایک واقعی محتاط و فہمیدہ بادشاہ سے نادر فوائد حاصل ہونگے، میں نے یہ دکھایا ہے کہ یہ خیال غلط ہے کہ ایسے موقعوں پر آئینی بادشاہ کا کوئی اقتدار اور اس کا کوئی فرض نہیں ہوگا مگر اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ایسے موقع پر ایک آئینی بادشاہ کے سودمند ہونے کے لئے جس مزاج، جس طبعیت اور جن صفات کی ضرورت ہے وہ بہت ہی نادر و نایاب ہیں، یا بدرجۂ اقل اتنے کمیاب تو ضرور ہیں جتنے کسی عظیم المرتبت خود مختار بادشاہ کے اوصاف لازمہ کمیاب ہوتے ہیں نیز یہ کہ ایسے موقع پر ایک معمولی شخص سے جس قدر نفع پہنچ سکتا ہے اس قدر نقصان بھی پہنچ سکتا ہے بلکہ شاید نقصان کا پہلو غالب ہے مگر نظم و نسق کے ختم ہونے کے وقت بادشاہ پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کے متعلق میں اس خطبہ میں پوری طرح بحث نہیں کرسکتا تھا کیونکہ یہی وہ موقع ہے جب انگریزی حکومت کے نہایت ہی خاص الخاص اجزا سے کام لیا جاتا ہے، یعنے دارالعوام کی برطرفی اور نئے امرا کے بنانے کے اختیارات عمل میں آتے ہیں، اور جب تک دارالامرا اور دارالعوام کی نوعیت کی تشریح نہ کردی جاتی اس وقت تک وہ مقدمات ہی ہاتھ نہ آتے جن کے بموجب ان معاملات میں بادشاہ کے مختص فرائض کے متعلق دلیل پیش کیجاسکے۔ اس خطبہ کے بعد ہم ہر دو ایوانہائے پارلیمنٹ کے فرائض اور انگلستان کے

نظم ونسق پر تغیر وزارت کے اثرات دونوں امور پر غور کرچکے ہیں، اس لئے اب یہ موقع حاصل ہے کہ ہم نظم ونسق کے اختتام کے وقت شاہی فرائض پر بحث کریں۔

میں اس معاملہ میں ضرورت سے زائد ظواہر کا پابند نظر آؤنگا مگر میں بالقصد بہت زیادہ پابند ظواہر ہونا چاہتا ہوں، میرا خیال یہ ہے کہ دارالعوام کے برطرف کرنے اور امرامیں اضافہ کرنے کے جو اختیارات انگلستان کے حکام عاملانہ (بادشاہ ووزرا) کو حاصل ہیں وہ حکومت کے نہایت ہی اہم اجزا میں سے ہیں مگر ان کی صحیح قدر بہت کم سمجھی گئی ہے، اور انھیں امور پر حاوی نہ ہونے سے انگریزی نظام سلطنت کے نقل کرنے میں سیکڑوں غلطیاں واقع ہوئی ہیں۔

ہابس نے مدتوں پہلے یہ کہا ہے اور ہر شخص اسے سمجھتا ہے کہ ہر سلطنت میں ہر امر کے متعلق کہیں نہ کہیں کوئی اعلیٰ اقتدار اور حتمی اختیار ہونا چاہئے حکومت کا تصور اگر صحیح طور پر ذہن نشین کیا جائے تو یہ امر اس تصور میں شامل ہے، مگر حکومت کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم میں جملہ امور کے متعلق اعلیٰ حتمی اختیار صرف ایک ہی ہوتا ہے دوسری قسم میں حتمی اختیار کا مستقر مختلف امور کے متعلق کبھی نظام سلطنت کے ایک جزو میں ہوتا ہے اور کبھی دوسرے جزو میں۔ اہل امریکہ نے یہ خیال کیا کہ اپنے نظام سلطنت کو آخری اصول پر قائم کرکے انھوں نے انگریزی نظام سلطنت کی نقل کی ہے اور اسی لئے انھوں نے معاملات کی ایک قسم کے لئے ایک آخری اختیار قائم کیا اور دوسری قسم کے لئے دوسرا آخری اختیار قائم کیا، مگر فی الحقیقت انگریزی نظام سلطنت کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ہے، اس میں تمام قسم کے معاملات کے لئے صرف ایک ہی اقتدار ہے۔ اس فرق کی ایک زندہ تصویر دیکھنے کے لئے ہمیں اہل امریکہ کی کارروائی پر نظر ڈالنا چاہئے۔

اول جس امر میں ایک حد تک ان کا بس نہ چلا اسے انھوں نے اس کے حال پر چھوڑ دیا یعنے مختلف ریاستوں کے اقتدار اعلیٰ کو قائم وبرقرار رکھا سلطنت کی ایک اساسی دفعہ میں یہ تحریر ہے کہ جو اختیارات مرکزی حکومت کو "تفویض" نہیں کئے گئے ہیں وہ اپنی اپنی ریاستوں کے لئے محفوظ ہیں، اور اتحاد کے قریبی زمانہ کی

جملہ تاریخ بلکہ اس کے ماضی و حال کی کل تاریخ پر اس قانون کا جس قدر اثر پڑا ہے، اس قدر اثر کسی دوسرے سبب واحد کا نہیں پڑا ہے۔ سلطنت کے خاص خاص معاملات کا اعلیٰ اقتدار مرکزی حکومت کے ہاتھ میں نہیں بلکہ ماتحت حکومتوں کے ہاتھ میں ہے۔ متفقی حکومت غلامی کے معاملہ میں ہاتھ نہیں لگا سکتی تھی اور یہی وہ "خانگی ادارہ" تھا جس نے اس اتحاد کو ایسے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا، کہ ان کے اخلاق، ان کی سیاسیات اور ان کی معاشری حالت ایک دوسرے سے بالکل مغائر ہو گئی اور آخر الامر دونوں میں جنگ ہو پڑی۔ یہ معرکۃ الآرا سیاسی معاملہ ملک کی اعلیٰ ترین حکومت کے عدالتی اختیار میں نہیں تھا جہاں اعلیٰ سے اعلیٰ عقل و فراست کی توقع کیجاتی تھی، نہ وہ مرکزی حکومت کے حیطۂ اقتدار میں تھا جہاں بے لوثی کی امید ہو سکتی تھی بلکہ وہ اختیار میں تھا مقامی حکومتوں کے، جہاں یہ یقینی امر تھا کہ پست درجہ کے اغراض و مقاصد پر لحاظ کیا جائے گا اور صرف کمتر درجہ کی قابلیت کے لوگوں سے کام لیا جائے گا۔ بلکہ اس اہم ترین امر کا فیصلہ نیچے درجہ کی عدالتوں کے لئے محفوظ تھا۔ ممالک متحدہ امریکہ میں صرف ایک امر اور ایسا ہے جس کی اہمیت کا مقابلہ غلامی کے معاملہ سے کیا جا سکتا ہے اور اس پر بھی ریاستوں ہی کی حکومتوں کا عمیق و قوی اثر پڑا ہے۔ اہل امریکہ کی حد سے بڑھی ہوئی عمومیت، کسی متفقی قانون کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ نتیجہ ہے ریاستی قانون کا۔ متفقی دستور سلطنت نے اپنی ہیئت ترکیبی کے خاص اجزا میں سے ایک جزو ماتحت حکومتوں کی تحویل میں دیدیا ہے، اس کے دفعات میں ایک دفعہ اس مقصود کی ہے کہ ہر ریاست میں متفقی دارالنائبین کے لئے انھیں اشخاص کو رائے دہی کا حق ہوگا جو اس ریاست کے ایوان وضع قانون کے زیادہ کثیر التعداد ایوان کے لئے رائے دے سکیں گے، اور چونکہ ہر ایک ریاست اپنی مجلس وضع قانون کے لئے حق رائے دہی کا تعین خود ہی کرتی ہے اس لئے متفقی ایوان ادنیٰ کے لئے حق رائے دہی کا تعین بھی فی الجملہ انھیں ریاستوں کے وسیلہ سے ہوتا ہے۔ متفقی دستور سلطنت کی ایک دوسری دفعہ کے بموجب صدارتی انتخاب میں رائے دینے کے اوصاف کا تعین بھی یہی ریاستیں کرتی ہیں۔ پس امریکہ میں آزاد حکومت کے عنصر اولیں کا تعین (یعنے حکومت میں کس قدر آدمیوں کو حصہ دیا جائے)

حکومت کے ہاتھ میں نہیں بلکہ بعض ماتحت مقامی جماعات کے ہاتھ میں ہے اور بعض اوقات
یہ جماعتیں معاندانہ روش اختیار کر لیتی ہیں جیسا کہ اس وقت جنوبی امریکہ کا حال ہے۔
اس میں شک نہیں کہ اس دستور سلطنت کے مرتب کرنے والوں کو اس
معاملہ میں زیادہ اختیار حاصل نہیں تھا۔ ان میں سے عاقل ترین اشخاص اس امر کے لئے
بیچین تھے کہ جہاں تک ہو سکے مرکزی حکومت کے لئے زیادہ اختیار حاصل کریں اور مقامی
حکومتوں کے لئے جہاں تک ممکن ہو کم اختیارات باقی رکھیں مگر اس پر شور مچا کہ
اس دانشمندی سے مطلق العنانی پیدا ہو جائے گی اور آزادی میں خلل پڑ جائے گا
اور اس شور و شغب کی مدد سے مقامی رقابت کو آسانی سے کامیابی حاصل ہو گئی۔
حقیقت میں تمام متفقی حکومتوں کا حال یہ ہے کہ جس شئے کو میں نے حکومت کے
عناصر معظم کہا ہے وہ ان حکومتوں میں عملدار عناصر سے مطابقت نہیں رکھتے۔
ہر ایک معاہدے کے آغاز میں وہی پرانی حکومتیں جداگانہ سلطنتوں کی نسبت
سے قوم کو اپنی طرف مائل اور اس کی وفاداری کو برقرار رکھتی ہیں متفقی حکومت
ایک مفید شئے ضرور ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی نئی اور غیر مرغوب بھی ہوتی ہے۔
اسے بہت کچھ ریاستی حکومتوں کی باتیں ماننا پڑتی ہیں کیونکہ وہ اپنی قوت محرکہ کے لئے
انھیں کی زیر بار احسان ہوتی ہے۔ یہی وہ حکومتیں ہیں جن کی فرماں پذیری قوم
برضا و رغبت کرتی ہے۔ جب ریاستی حکومتوں کے ساتھ اس قسم کی الفت باقی نہیں
رہتی تو وہ اس طرح حمیٹ جاتی ہیں جس طرح جرمانیہ میں چھوٹے چھوٹے حکمراں
ناپید ہو گئے اور پھر کسی متفقیت کی ضرورت نہیں رہتی ایک مرکزی حکومت
سب پر حکمراں ہو جاتی ہے۔
مگر امریکی دستور سلطنت میں اقتدار اعلیٰ کی کیفیت اس سے بدرجہا
زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس اقتدار کا جو حصہ وفاقی حکومت کے لئے باقی رہا ہے
اس کی خود تقسیم اور زیر تقسیم ہو گئی ہے۔ اس کی عظیم ترین مثال وہی ہے جو سب
سے زیادہ نمایاں ہے۔ کانگریس تو صرف قانون پر حکمرانی کرتی ہے اور رئیس جمہوریہ،
نظم و نسق کا کارفرما ہوتا ہے۔ دستور سلطنت نے ان دونوں میں اتحاد کا ایک
ذریعہ قائم کیا ہے کہ رئیس جمہوریہ جس قانون کو پسند نہ کرتا ہو اسے وہ محو کر سکتا ہے،

مگر دونوں ایوانوں کے دو ثلث ارکان جب متفق الرائے ہو جائیں تو وہ رئیس جمہوریہ
کے حکم کو باطل کر سکتے اور اس کے بغیر ہی قانون بنا سکتے ہیں اور تھوڑے ہی زمانہ قبل
ایسا ہو بھی چکا ہے۔ پس یہاں بحالات مختلفہ تشریعی اختیار کے تین جداگانہ
مخزن ہو جاتے ہیں۔ اول۔ کانگریس (موتمر) و رئیس جمہوریہ بصورت اتفاق
یکدگر۔ دوسرے رئیس جمہوریہ جب وہ پوری قوت کے ساتھ اپنے اختیار کو عمل میں
لادے، اس کے بعد دو ثلث ارکان موتمر جب وہ رئیس جمہوریہ کے اختیار کو باطل
کردیں۔ لیکن اس آخری صورت میں یہ لازم نہیں آتا کہ رئیس جمہوریہ جس قانون کو
پسند نہ کرتا ہو اس کے نفاذ میں وہ زیادہ از ضرورت سرگرمی دکھائے گا۔ یہ ضرور
ہے کہ شدید غفلت کی صورت میں اس پر مقدمہ چل سکتا ہے مگر جرم
عدم ادائی فرائض اور پر جوش مستعدی کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔
مسٹر جانسن، "قانون اشخاص آزاد شدہ" کا عملدر آمد اس طرح سے نہیں کرتے
جس طرح مسٹر لنکن اس کا عملدر آمد کرتے جو اس قانون کو پسند کرتے تھے۔
امریکی دستور سلطنت میں ایک ترکیب یہ رکھی گئی ہے کہ مختلف حالات میں
اعلیٰ تشریعی اختیار کو بدل دیا جائے اور انتظامی اختیارات کو ہر حال میں
اس سے علیحدہ رکھا جائے۔

مگر خود انتظامی اختیار بھی مجرد و غیر منقسم نہیں رہا ہے۔ نظم و نسق کا ایک
نہایت ہی اہم جزو بین الاقوامی حکمت عملی ہے اور اس معاملہ میں اعلیٰ اقتدار
رئیس جمہوریہ کو حاصل نہیں ہے اور دارالنائبین کو تو اس معاملہ میں اور بھی
کم دخل ہے یہ اختیار سینیات کے ہاتھ میں ہے۔ رئیس جمہوریہ صرف اسی
حالت میں معاہدے کر سکتا ہے، جب دو ثلث حاضر الوقت سیناتی اس سے
اتفاق کرلیں پس عظیم ترین بین الاقوامی مسائل کا اقتدار اعلیٰ عام انتظامی
و تشریعی مسائل سے بالکل علیحدہ دستور سلطنت کے ایک دوسرے ہی حصہ
میں مرکوز ہے یعنے وہ بطور خود ایک خاص جگہ قائم کردیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ جنگ کا اعلان موتمر کی طرف سے ہوتا ہے مگر حال کی
ترکیب قوانین کے موافق موتمر کے لئے نہایت دشوار ہوگا کہ وہ رئیس جمہوریہ کو

صلح کرنے پر مجبور کر سکے۔ اس میں شک نہیں کہ اس دستور سلطنت کے بانیوں کا منشا
یہ تھا کہ موتمر امریکہ کو حکام عاملانہ پر نگرانی کرنے اور ان کو قابو میں رکھنے کا
ویسا ہی موقع حاصل ہے جیسا انگلستان کی پارلیمنٹ کو وہاں کے حکام عاملانہ
پر حاصل ہے۔ اسی لئے انھوں نے وسائل اخراجات کی منظوری کو کلیتہً دار النائبین کے
ہاتھ میں رکھا تھا مگر انھیں "زر کاغذی" کا خیال نہ آیا اور اب یہ طے ہو گیا
ہے کہ موتمر سے مشورے کئے بغیر رئیس جمہوریہ اس طریق سے روپیہ ادا کر سکتا ہے۔
گزشتہ جنگ کے ابتدائی مراحل مسٹر لنکن نے انجام دئے تھے۔ ان کا اعتماد موتمر
کے عطیات پر نہیں تھا بلکہ ادائی رقم کے لئے انھیں اسی اختیار خاص پر اعتماد تھا۔
یہ بالکل مذاق معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت زر کاغذی کے جاری کرنے کے
اختیار کی نسبت یہ فیصلہ ہو گیا ہے کہ اقوام کے سپہ سالار اعظم کی حیثیت سے
رئیس جمہوریہ کو اس کا حق حاصل ہے اور جب اختیار کو جنگی اختیار کہا جاتا ہے
یہ اس کا ایک جزو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ جنگ میں روپیہ کی ضرورت
تھی اور حکومت نے اسے سہل ترین طریقہ سے حاصل کیا، اور قوم نے اس جوش
میں کہ اس پر مزید محصول نہیں لگے گا، اسے پوری طرح پسند کیا، مگر اب یہ امر
واقعہ کے طور پر قائم ہو گیا ہے کہ نظیر سابق اور فیصلۂ عدالت کی بنا پر رئیس جمہوریہ کو
موتمر کی منظوری کے بغیر بلکہ شاید موتمر کی مرضی کے خلاف ہی جنگ کے جاری رکھنے کا
زبردست اختیار حاصل ہو گیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ امریکی قوم کی متحدہ مرضی کے
خلاف رئیس جمہوریہ بالکل ہیچ ہو گا اور اس قوم کی فطانت ایسی ہے کہ
رئیس جمہوریہ اس کا خیال تک بھی دل میں نہ لائے گا لیکن (جیسا کہ سابق
میں ہو چکا ہے) قوم جب دو فریقوں میں منقسم ہو جائے جنہیں سے ایک رئیس جمہوریہ
سے اور دوسرا موتمر سے وابستہ ہو تو رئیس جمہوریہ کو زر کاغذی جاری کرنے کے
اس بے قید و قال اختیار کے زور پر یہ قوت حاصل ہو جائے گی کہ وہ اس صورت
میں جنگ کو جاری رکھے گا جب (انگریزی اصطلاح میں) پارلیمنٹ جنگ کو
ختم کرنا چاہتی ہو۔
آخری امر یہ ہے کہ نہایت ہی اعلیٰ پایہ کے مسائل ان حکام کے

ہاتھوں سے تماماً نکال لئے گئے ہیں جو معمولاً سلطنت کے کارفرما ہوتے ہیں اور انھیں خاص کارکنوں کے لئے محفوظ رکھا ہے۔ "دستور سلطنت" کی رو سے خود اس دستور کے اندر کی کوئی ذی اقتدار شخصیت اس میں تغیر و تبدل نہیں کر سکتی بلکہ یہ تغیر و تبدل بیرونی قوتوں کے ہاتھ میں ہے۔ دستور سلطنت کی رو سے ہر ایک اعلیٰ و ادنی تبدیلی کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ مجالس وضع قوانین یا ریاستوں کے ایک پر پیچ تناسب کی منظوری سے عمل میں آئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہایت ہی بدیہی خرابیاں بھی عجلت کے ساتھ دفع نہیں کیجا سکتیں، ان مضرت رساں دفعات کے صریحی مفہوم سے بچ نکلنے کے لئے نہایت ہی خلاف قیاس افسانے اور قصے بنائے جاتے ہیں، ایک سادہ مزاج اور کارکن قوم کے سیاسیات میں ایسے عسیر العمل طرز کار اور ایسی تحریف یا پابندی ظواہر کا واقع ہونا داغ سا معلوم ہوتا ہے۔ امریکہ میں اس کے متعلق جو عملی دلائل اور قانونی بحث و مباحثے پیش آتے ہیں وہ اکثر ان متولیوں کے دلائل و مباحث کے مشابہ ہوتے ہیں جو کسی غلط تحریر شدہ وصیت نامہ کو عمل میں لانا چاہتے ہیں، ان کا منشا اچھا ہوتا ہے مگر اس وصیت پر نہ کہیں کامل طور پر عمل ہو سکتا اور نہ سادے طور پر اس کی حمایت کیجا سکتی ہے کیونکہ ایک پرانے عہد نامہ کے پرانے الفاظ سے اس میں نہایت درجہ دقت حائل ہو جاتی ہے۔

ان مثالوں سے (جن میں مزید مثالوں کا اضافہ ہو سکتا ہے) یہ ثابت ہوتا ہے اور تاریخ سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ امریکہ کے دستور سلطنت کے بنانے والوں کا خاص خیال کیا تھا۔ اقتدار اعلیٰ کہیں بھی قائم کیا جائے وہ اس سے گھبراتے تھے، انھیں یہ خوف دامنگیر تھا کہ اس سے مطلق العنانی پیدا ہو جائے گی۔ جارج سوم ان کے لئے ایک خود سر بادشاہ تھا اور اس لئے کچھ بھی کیوں نہ ہو وہ کسی دوسرے کو جارج سوم نہ بننے دیں گے جو نظریات دلوں میں جاگزیں ہو چکے تھے انمیں یہ بتایا گیا تھا کہ انگریزی دستور سلطنت میں اقتدار اعلیٰ منقسم ہے اور اسی کی نقل میں اہل امریکہ نے اپنے اقتدار اعلیٰ کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

نتیجہ اب سامنے آیا ہے۔ ان کی تاریخ کے اس نازک وقت میں کوئی آمادۂ کار اور فیصلہ کن طاقت موجود نہیں ہے۔ ریاستہائے جنوبی شدید بغاوت کے بعد اپنے فاتحین کے قدموں کے نیچے پڑی ہیں اور فاتحین کو اب یہ قرار دینا ہے کہ ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ انھیں ان شرائط کا فیصلہ کرنا ہے جن کے بموجب یہ افتراقی دوبارہ ان کے متفقہ حقوق شہریت میں داخل ہو جائینگے، وہ پھر رائے دینے لگیں گے، پھر ان کی نیابت ہونے لگے گی اور غالباً پھر حکمرانی کرنے لگیں گے۔ سب سے مشکل مسئلہ یہ ہے کہ ان سابق دشمنوں کو کس طرح سے آزاد دوست بنایا جائے۔ فاتحین کے گرانبار سرکاری قرضہ کی طمانیت اور اس قرضے کے ساتھ ان کی آئندہ کی ساکھ اور ان کی آئندہ جنگوں کی قوت سب کا انحصار اس پر ہے کہ ان لوگوں کو زاید از ضرورت امتیاز نہ دیا جائے جنھیں اس قرضہ میں خود اپنی مغلوبیت کی تصویر نظر آتی ہو اور اب کہ خود ان کا قرضہ (یعنی ان کے مدافعت کا خرچ) ساقط قرار پا چکا ہے ان کا میلان اسی جانب ہوگا کہ اس قرضہ کو بھی ساقط کر دیں۔ اب ایک اور قوم بھی جو پہلے حالت غلامی میں تھی، ان لوگوں کے رحم و کرم کی طرف آنکھیں لگائے ہوئے ہے جو اس سے متنفر و کارہ ہیں اور جن لوگوں نے اس قوم کو آزاد کیا ہے ان پر پابندی عائد ہوتی ہے کہ اسے بھی زندگی میں موزوں و منصفانہ موقع دیں۔ اس کے قبل غلام اپنی زنجیروں سے محفوظ تھے، ان کی حیثیت ایک باقیمت شئے کی تھی مگر اب وہ خود اپنے مالک ہیں۔ ان کی زندگی میں ان کے سوا اور کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہے اور وہ ان "ذلیل سفید رنگ والوں" کے رحم پر ہیں جن کی محنتوں کی قیمت ان کی وجہ سے گھٹتی ہے اور جو انھیں کراہیت و نفرت سے دیکھتے تھے کسی حکومت کے سامنے بڑے سے بڑا اخلاقی فرض جو کبھی پیش کیا گیا ہو اور بڑے سے بڑا اندیشہ ناک سیاسی مسئلہ جو کسی حکومت کے روبرو آیا ہو، وہ اس وقت امریکی حکومت کے سامنے

ا۔ خانہ جنگی کے عین بعد ہی یہ تحریر لکھی گئی تھی مگر مجھے اب تک یہ نہیں معلوم ہوا کہ اس میں جس اہم مسئلہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ مناسب طور پر حل ہو گیا ہے۔

موجود ہے مگر نہ کوئی فیصلہ ہوا ہے اور نہ کسی فیصلہ کا امکان ہے۔ رئیس جمہوریہ ایک روش پر چلنا چاہتا ہے اور دوسری روشوں کے روکنے پر قادر ہے، ہو تو کو ایک دوسری روش پر چلنا چاہئے اور اسے بھی اپنے خلاف روشوں کے روکنے کا اختیار ہے، غرض کہ اقتدار اعلیٰ کے مختلف حصوں میں بکھیر دینے کا حاصل یہ ہے کہ وہاں کوئی صاحب اقتدار اعلیٰ رہا ہی نہیں ہے۔

۱۷۸۷ء میں اہل امریکہ نے یہ سمجھا تھا کہ وہ انگریزی دستور سلطنت کی نقل کر رہے ہیں مگر (فی الواقع) وہ اس سے ایک مغائر دستور سلطنت تیار کر رہے تھے، جس طرح امریکی حکومت مرکب حکومتوں کا ایک نمونہ ہے جس میں اعلیٰ اقتدار مختلف جماعتوں اور کارکنوں کے درمیان منقسم ہے، بالکل اسی طرح انگریزی نظام سلطنت، ان نظامہائے سلطنت کا کامل نمونہ ہے جن میں تمام مسائل کے متعلق اختتامی اختیار ایک ہی ہاتھوں میں ہے۔

انگریزی دستور سلطنت میں آخری صاحب اقتدار نیا منتخب شدہ دارالعوام ہے۔ اس سے کوئی بحث نہیں ہے کہ جس مسئلہ کا وہ تصفیہ کرتا ہے وہ انتظامی ہے یا تشریعی، نہ اس سے کوئی غرض ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق واقعی دستور سلطنت کے اعلیٰ مسائل سے ہے یا روزمرہ کے خفیف واقعات سے، نہ اس سے کوئی سروکار ہے کہ جنگ کے آغاز کا مطالبہ ہے یا اس کو جاری رکھنے کا سوال ہے، نہ اس سے کوئی واسطہ ہے کہ محصول لگانے کی بحث ہے یا زر کاغذی جاری کرنے کی، نہ اس سے کوئی تعلق ہے کہ یہ سوال ہندوستان سے متعلق ہے یا آئرلینڈ اور لندن سے، غرض یہ کہ ایک جدید دارالعوام خودسرانہ و اختتامی طور پر ہر امر کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ دارالعوام جزوی معاملات میں دارالامرا کی نظرثانی کو قبول کرے گا اور جن معاملات سے متعلق اسے کچھ ایسی زیادہ فکر نہ ہو ان کی نسبت دارالامرا کے حق امتحا کا بھی روادار ہو جائے گا مگر جب اسے عامۃ الناس کی مرضی کی طرف سے یقین ہو اور اس کا انتخاب بھی نیا نیا ہوا ہو تو پھر وہ بالکل مطلق العنان ہوتا ہے۔ وہ جس طرح چاہے حکمرانی کرے

اور جس طرح چاہے فیصلہ کرے اور وہ اس امر کی بہترین ضمانت لے سکتا ہے کہ اس کا فیصلہ بیکار و مہمل نہیں رہے گا۔ وہ اس امر کا اطمینان کر سکتا ہے کہ اس کے احکام پر عملدر آمد ہو گا کیونکہ حکام عاملانہ کا تقرر کلیتہً اس کے ہاتھ میں ہے۔ غفلت کے لئے وہ سخت سے سخت تادیب کر سکتا یعنے حکام عاملانہ کو برطرف کر سکتا ہے۔ وہ اپنی خواہشوں کو عمل میں لانے کے لئے ایسے لوگوں کا انتخاب کر سکتا ہے جن کی خود وہی خواہشیں ہوں، اور اس طرح پر اس کی مرضی کا عمل میں آنا یقینی ہو جاتا ہے۔ امریکی موتمر کے دونوں ایوانوں کی ایک مشروط کثرت رائے کسی تصریحی قانون کی رو سے اپنے وہاں کے حکام عاملانہ کے حکم کو باطل قرار دیسکتی ہے مگر انگلستان کے مجلس وضع قوانین کی شاخ عمومی حکام عاملانہ کا عزل و نصب دونوں کر سکتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ، انگریزی دستور سلطنت اس اصول پر وضع کیا گیا ہے کہ اقتدار اعلیٰ کے لئے ایک منفرد قوت منتخب کر لی جائے اور اسی کو پرزور بنا دیا جائے۔ خلاف ازیں، امریکی دستور اس اصول پر بنا ہے کہ ذی اقتدار قوتیں متعدد ہوں اور اس کثرت تعداد سے اقتدار کی لپستی کی تلافی ہو جانے کی توقع کی گئی ہے۔ اہل امریکہ اب اپنے ادارات کو آسمان پر چڑھاتے ہیں اور اس طرح پر جائز و واجبی تعریف سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ اگر ان میں سیاسیات کا حس و ادراک ہوتا تو ان کے کاموں میں وہ اعتدال پسندی ہوتی جو ایک ایسی جگہ نہایت ہی عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے جہاں معمولی تقریریں اس قدر جوش انگیز ہوتی ہوں اگر ان میں قانون کا اس درجہ پاس و لحاظ نہوتا، جس کا ثبوت کسی بڑی قوم نے ابتک نہیں دیا ہے اور انگریزوں کے پاس قانون کو تو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے، تو پھر امریکی دستور سلطنت میں اقتدارات کی یہ تکثیر اب سے بہت پہلے اس دستور سلطنت کا بری طرح خاتمہ کر چکی ہوتی۔ میں نے ایک ذکی الفہم اٹارنی (مختار) کو یہ کہتے سنا ہے کہ سمجھدار حصہ دار ہر ایک دستاویز پر عمل کر سکتے ہیں۔ اسیطرح میرا یقین ہے کہ میساچوسٹس کے باشندے چاہتے تو دستور سلطنت کی ہر ایک نوع پر عمل کر سکتے تھے[1]۔ مگر سیاسی فلسفہ

[1] بیشک اسوقت جنوبی اور جنوب مشرقی حصہ کی جو حالت ہے میں اس کا ذکر نہیں کرتا ہوں

کے لئے ضروری ہے کہ سیاسی تاریخ کا تجزیہ کرے، اس کے لئے یہ فرق دکھانا لازمی ہے کہ کس کام کا باعث قوم کے اعلیٰ اوصاف ہیں اور کس کام کا باعث قوانین کی خوبی ہے، اس کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ ہوشیاری کے ساتھ نظام سلطنت کے ہر ایک جزو کے صحیح اثر کا اندازہ کرے، خواہ ایسا کرنے میں اسے عوام الناس کے بہت سے معبودوں کو غارت ہی کیوں نہ کرنا پڑے اور جس جگہ بہت کم لوگوں کا ذہن پہنچ سکتا ہو وہاں پہنچکر افادے کے راز کا پتہ چلائے۔

میرا خیال ہے کہ کوئی شخص بھی اس میں شک نہیں کرسکتا کہ سیاسی کاموں میں توحد و یکسوئی کس درجہ اہم ہے۔ ہم اس توحد کے حصص کی تفریق و تعریف کرسکتے ہیں مگر حکمت عملی ہر حال میں ایک واحد مجموعی شئے ہے۔ اس کا نفاذ قوانین اور صاحبان نظم و نسق کے ذریعہ سے ہوتا ہے، کبھی ایک کی ضرورت پڑتی ہے اور کبھی دوسرے کی، جب تک وہ آسانی کے ساتھ دونوں کو حرکت نہ دے سکے اس کے راستہ میں بہت جلد دشواری حائل ہوجائے گی، جب تک کہ دونوں پر اسے قطعی تفوق حاصل نہ ہو اس کا کام ناقص و ناتمام رہے گا۔ معاملات انسانی کی پیچ در پیچ نوعیت کا منشا یہ ہے کہ ایک واحد فیصلہ کن اعلیٰ قوت ہو، اگر ہر ایک فرضی تفریق کے لئے ایک جداگانہ قوت قائم کیجائے گی اور وہ اتنے دنوں تک قائم بھی رہے گی کہ اس سے کوئی کام انجام پائے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ کام میں سخت ابتری و پریشانی پیدا ہوجائے۔ برطانی نظام سلطنت کا وصف خاص یہی ہے کہ اس نے اس توحد کو حاصل کرلیا ہے یعنے اس کی ذی اقتدار قوت واحد، ممکن العمل اور اعلیٰ درجہ کی ہے۔

اس کامیابی کی اولیں وجہ انگریزی نظام سلطنت کی وہ مخصوص شرط ہے جس نے حکام عاملانہ کا انتخاب "ایوان عموم" کے ہاتھ میں دیدیا ہے، لیکن اگر ان میں دو خاص پرزے نہ ہوتے تو یہ مقصد اسے مکمل طور پر حاصل نہ ہوتا یعنی ان پرزوں کو

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:- میرے ذہن میں یہ نہیں آتا کہ جہاں اس قدر ناقص عناصر اس قدر تلاطم کی حالت میں ہوں وہاں کے حالات معاشری میں کوئی آزاد حکومت کیونکر قائم رہسکتی ہے۔

نظام سلطنت کے حاجز محافظ (Safety-value) اور مقوم (Regulator)
کہنا چاہتا ہوں۔

حاجز محافظ (Safety-value) نظام سلطنت کی خاص شرط ہے
اور ان کے متعلق میں دارالامرا والے خطبہ میں بہت شرح و بسط سے بحث کر چکا ہوں۔
حکام عاملانہ کا سرگروہ ایوان ثانی کے لئے نئے ارکان کا انتخاب کر کے
اس ایوان کی مقاومت پر غالب آسکتا ہے یعنے اگر اسے کثرت رائے نہ حاصل
ہو تو وہ کثرت رائے پیدا کر سکتا ہے۔ یہ نہایت قابل اعتماد قسم کا حاجز محافظ
(Safety-value) ہے، اس سے مرضی عامہ کو موقع ملجاتا ہے کہ وہ دستور سلطنت
کے اندر ہی رہکر ان خواہشوں اور ان خیالوں کو عمل میں لاسکے جنھیں اس
دستور سلطنت کی ایک شاخ ناپسند کرتی اور اس کے سد راہ ہوتی ہو۔ اس
مرضی کے ظاہر کرنے والے حکام عاملانہ ہیں اور ان کا تقرر خود اسی مرضی سے
ہوتا ہے۔ اس سے رکی ہوئی طاقت کا وہ خطرناک اجتماع خارج ہو جاتا ہے جو
اس دستور سلطنت کو اسی طرح بہالیجاتا جس طرح اس قسم کے دوسرے اجتماعات
اس کے ہمشکل دستوروں کو بہالے گئے ہیں۔

جس شئے کو میں انگلستان کے واحد اقتدار اعلیٰ کا مقوم کہنا چاہتا ہوں
اسے اس ایوان کو برطرف کر دینے کا اختیار ہے جو خود ہر طرح پر ذی اقتدار ہے،
یہ اختیار حکام عاملانہ کے سرگروہ کے تفویض میں ہے۔ جماعت مقننہ کی شاخ عمومی
کے صاحب اقتدار اعلیٰ ہونے کے نقائص کے متعلق کسی سابق خطبہ میں بہت
تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ مختصراً ان نقائص کو تین الزامات کی صورت میں جمع
کیا جاسکتا ہے۔

اول یہ کہ انتخاب کنندۂ ایوان کی خرابیوں میں سے سب سے زیادہ
عام اور سب سے زیادہ خطرناک خرابی اس کی حرص ہے۔ انگلستان کی نوآبادیوں
میں پارلیمنٹی حکومت جہاں جہاں ناکام رہی ہے یا جہاں جہاں اس کے ناکام
ہونے کا ادعا کیا گیا ہے، ان سب جگہوں میں یہی خرابی سب سے مقدم خلل انداز
ہوئی ہے۔ ایوان کو اس امر پر آمادہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی ایک حکومت کو

برقرار رکھے بلکہ وہ کبھی ایک شخص کو وزیر منتخب کرلیتی ہے اور کبھی دوسرے کو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی قسم کی بھی حکومت باقی نہیں رہتی۔

دوسرے یہ کہ اس حرص وطمع کا جو علاج ہے اس سے خود ایک دوسری خرابی لاحق ہوجاتی ہے۔ وہ متنفر طریقہ جس کے ذریعہ سے کسی پارلیمنٹی حکومت میں، مربوط کثرت رائے اور پائدار حکومت قائم رہسکتی ہے، وہ فریقیانہ تنظیم ہے مگر اس تنظیم سے بجائے خود فریقانہ زیادتی اور فریقیانہ بغض وعناد کو ترقی ہوتی ہے۔ اس طریق کا ماحصل یہ ہے کہ کل قوم کو قوم کے ایک جزو کی حکومت کے تابع کردیا جائے جس کا انتخاب محض اس کی تخصیص کی وجہ سے ہوا ہو۔ پارلیمنٹی حکومت فی الاصل ایک فریقی حکومت ہے اور اس کا امکان اسی وقت تک ہے جبتک فرقے اپنی اپنی جگہوں پر مربوط رہیں۔

تیسرے یہ کہ ہر ایک دوسرے ذی اقتدار شخص کی طرح، پارلیمنٹ کے بھی خاص حسیات اس کے خاص میلانات، اور خاص اغراض ہوتے ہیں، اور ہوسکتا ہے کہ وہ قوم کی خواہشوں بلکہ خود بہبود قوم کے خلاف اپنے خیالات ذاتی کے پورا کرنے کے درپے ہوجائے۔

انگلستان کے نظام سلطنت کی دولابہ تقویم (Regulating wheel) جس طرح اپنے کام کو پورا کرتی ہے وہ صاف عیاں ہے۔ وہ پارلیمنٹ کے اقتدار میں اس کی نوعی حیثیت سے کوئی خلل نہیں ڈالتی بلکہ وہ ایک مختص پارلیمنٹ کے اختیار میں روک پیدا کردیتی ہے۔ وہ ایک خاص شخص کو جو پارلیمنٹ سے خارج ہے یہ کہنے کا موقع دیتی ہے کہ اب ارکان پارلیمنٹ اپنا فرض ادا نہیں کرتے، آپ قوم کو خسارے میں ڈال کر اپنی حرص وطمع کو پورا کر رہے ہیں آپ قوم کو مبتلائے آلام کرکے اپنے فریقیانہ جوش کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ آپ قوم کا نقصان کرکے خود اپنے کو نفع پہنچا رہے ہیں، میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں قوم اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتی ہے یا نہیں لہذا میں آپ کی اس پارلیمنٹ کا مرافعہ اُس دوسری پارلیمنٹ کے روبرو پیش کرنا چاہتا ہوں"

انگلستان کے دستور سلطنت کی شرط خاص کی قدر وقیمت کے سمجھنے کا

بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کے عملدرآمد کو درجہ بدرجہ دیکھا جائے، یعنے اس پر اس طرح نظر کیجائے جس طرح ہم نے اس کے قبل شاہی انگلستان کے دوسرے اختیارات پر نظر کی ہے کہ کس حد تک ان کا انحصار موروثی بادشاہ کی موجودگی پر ہے اور کس حد تک پارلیمنٹ کا منتخب کردہ وزیر اعظم ان کو عمل میں لاسکتا ہے۔ ہم جب اس خاص شخص کی نوعیت پر غور کرینگے جو اس اختیار کو عمل میں لانے کے لئے درکار ہوگا تو خود اس اختیار کے متعلق ایک صاف و واضح خیال ہمارے ذہن میں آجائے گا۔

اول یہ کہ وزیر اعظم کے انتخاب میں پارلیمنٹ اگر حرص و طمع سے کام لے تو اس کے روکنے کے لئے بہترین شخص کون ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ وہ شخص خود وزیر اعظم ہے۔ وزیر اعظم ہی وہ شخص ہے جسے اپنے نظم و نسق کے قائم رکھنے میں سب سے زیادہ دلچسپی ہے اور اس لئے ہر طرح بہ ظن غالب بھی ہے کہ جس طاقت کے ذریعہ سے یہ نظم و نسق قائم رہتا ہے اس سے عمدگی و ہوشیاری سے کام لینے پر وہ ہمہ تن توجہ کرے گا۔ ایک بیرونی بادشاہ کی دخل دہی سے دشواری پیش آتی ہے۔ ایک طامع پارلیمنٹ ہمیشہ اس امید میں لگی رہے گی کہ اس کی طمع بادشاہ کی حرص و طمع کے ہمنوا ہو جائے۔ جس زمانہ میں جارج سوم اپنی حکومتوں پر حملے کیا کرتا تھا اس زمانہ میں وزیر اعظم بالطبع اپنے مناسب اختیار سے محروم ہو گیا تھا ہمیشہ اس بنا پر سازشوں کی ہمت افزائی ہوتی تھی کہ معلوم نہیں کہ اس مبغوض شاہی وزیر کو سازشیوں کی فریاد کرنے کا موقع بھی ملے گا یا نہیں اور ہمیشہ یہ توقع بھی لگی رہتی تھی کہ شریک سازش بادشاہ وزیر اعظم کی جگہ خالی ہونے پر انھیں سازشیوں میں سے کسی کو وزیر اعظم مقرر کردے گا۔ پارلیمنٹ کی برطرفی کا اختیار جب خود اس کے مقرر کردہ شخص کو تفویض ہو جاتا ہے اس وقت پارلیمنٹ کی حرص و طمع کی روک اس سے بہتر طور پر ہوتی ہے کہ یہ اختیار کسی باہر کے ذی اقتدار شخص کے لئے مخصوص کردیا جائے۔

مگر اس کے برعکس یہ کہا جاسکتا ہے کہ فریقانہ جوش اور پارلیمنٹ کی خود مطلبی کی بہترین روک ایک ایسے ہی ذی اقتدار کے ذریعہ سے ہوسکتی ہے جس کا کوئی تعلق پارلیمنٹ سے ہو اور نہ اس کا انحصار پارلیمنٹ پر ہو مگر اس

کے ساتھ یہ بھی فرض کرنا پڑے گا کہ یہ صاحب اقتدار شخص اخلاقی و ذہنی طور پر اس فرض مفوضہ کی انجام دہی کی اہلیت رکھتا ہے، وزیر اعظم چونکہ کثیر التعداد فریق کا نامزد کردہ ہوتا ہے اس لئے اغلب ہے کہ وہ اس کے خیالات میں شریک ہو اور زبان سے یہ کہنے پر تو وہ ہر حال میں مجبور ہے کہ وہ ان کا شریک ہے۔ یہ ضرور ہے کہ معاملات سے حقیقی تعلق پیدا ہو جانے کے باعث اکثر اس کے بہت سے تعصبات فنا ہو جاتے، اس کے بہت سے حد سے بڑھے ہوئے خیالات فرو ہو جاتے اور اسکی بہت سی غلطیاں رفع ہو جاتی ہیں۔ موجودہ کنسرویٹو حکومت میں ایک سے زائد رکن ایسے ہیں جو اپنے فریق کو ذہنی حیثیت سے پژمردہ سمجھتے ہیں، یہ ارکان یا تو اپنے فریق کی خاص زبان بولتے ہی نہیں اور اگر بولتے بھی ہیں تو استثناً لاہر اور وہ بھی "تفریحاً"، یہ لوگ اپنے فریق کے جمع شدہ تعصبات کو "زور دار قوت" سمجھتے ہیں جس پر خود ان کا دار مدار ہے اور اس لحاظ سے اس کی وقعت کرتے ہیں مگر باوجود اس کے کہ وہی ان کے بقا کا سہارا ہے وہ اس سے نفرت بھی رکھتے ہیں۔ برسوں قبل مسٹر ڈزریلی سر رابرٹ پیل کی وزارت کو جو حقیقی قوت رکھنے والی کنسرویٹو وزارتوں میں آخری وزارت تھی، "ایک منضبط منافقت" کہا کرتے تھے "راس"، و "ذنب" کے خیالات وحسیات میں اس درجہ بون بعید تھا۔ مسٹر ڈزریلی نے اگر ہمیشہ سے اس امر کو نہیں سمجھا ہے تو غالباً اب وہ اسے سمجھنے لگے ہیں کہ ڈاؤننگ اسٹریٹ کی ہوا وہاں کے رہنے والوں میں چند مخصوص خیالات پیدا کر دیتی ہے اور معاملات کے وسیع بحر مواج میں مخالفت کے مستحکم تعصبات گھل کر محض نام کو رہجاتے ہیں۔ لارڈ پامرسٹن بھی ایسے سر گروہوں کے کامل نمونہ تھے جو جوش کے برانگیختہ کرنے کے بجائے اسے فرد کر دیتے اور اپنے پیروؤں کے دلوں میں بغض وعناد پیدا کرنے کے بجائے رفق ولینت پیدا کر دیتے تھے۔ لیکن اگرچہ مشکلات اور دشواریوں سے قریبی واسطہ ہونے کی وجہ سے عام طور پر وزیر اعظم میں حد اعتدال سے بڑھا ہوا فریقانہ انداز باقی نہ رہے گا، تاہم ایک حد تک اسے اہل فریق رہنا ہی پڑے گا، اور ممکن ہے کہ وہ ایک شدید دغالی اہل فریق بنجائے اور اس صورت میں وہ اپنے فریق کے روکنے کے لئے موزوں شخص نہ رہے گا۔

جب پارلیمنٹ کا حاوی فرقہ وہ کام کر رہا ہو جسے قوم پسند نہ کرتی ہو تو ضرورت ہے کہ ایک فوری مرافعہ پیش ہو اور پارلیمنٹ برطرف کر دیجائے۔ مگر فریقانہ جوش سے بھرا ہوا وزیر اعظم ایسا مرافعہ پیش نہ کرے گا، وہ اپنے اصول موضوعہ پر چلے گا، وہ یقین کرے گا کہ وہ اچھا کام کر رہا ہے حالانکہ غالباً وہ ایک غیر مربوط اصول کے مسلمات کو غیر پر لعزیز نتائج کی طرف کھینچے لیجا رہا ہوگا ایسی ساعت میں ایک آئینی بادشاہ نعمت غیر مترقبہ بن جاتا ہے وہ قوم کو نقصان پہنچانے سے پارلیمنٹ کو روک سکتا ہے اور روک دے گا۔ لیوپولڈ اول اسی قسم کا بادشاہ تھا اور شہزادہ البرٹ بھی ایسا ہی ہو جاتا۔

علاوہ ازیں، پارلیمنٹ کی خود غرضی کی روک تھام کے لئے داخلی مانع کے بجائے خارجی مانع قطعاً زیادہ موثر ثابت ہوگا، ممکن ہے کہ جب وزیر اعظم کو خود پارلیمنٹ نے مقرر کیا ہو وہ بھی انھیں لوگوں کے خراب خیالات میں شریک ہو جائے جنھوں نے اس کا انتخاب کیا ہو ورنہ کم از کم اتنا تو ضرور ہوگا کہ وہ ان خیالات کو اپنا "سرمائہ کار" بنائے گا اور اس سے نفع اٹھائے گا یعنے وہ ظاہر یہ کرے گا کہ وہ ان کے خیالات میں شریک ہے۔ یہ یقینی ہے کہ اغراض ذاتی اور اس کی گندم نما جو فروش کارروائیاں وزیر اعظم کے لئے ایک دوسرے درجہ کی بات ہوگی، اسے جس امر کی فکر ہوگی وہ خود اپنی وزارت کا استقلال و نفع ہوگا خواہ یہ نفع جائز ذرائع سے حاصل ہو یا ناجائز ذرائع سے کوئی ایسا کام جو صریحاً نامقبول ہو اس سے وہ ضرور پہلو بچاتا جائیگا کیونکہ معمولی حالات کے اعتبار سے کچھ زمانہ بعد ایک نئی جمعیت کا منتخب ہو کر آنا لازمی ہے پس وزیر اعظم یہ کیوں چاہے گا کہ وہ ان انتخاب کنندوں کے احساس کو صدمہ پہنچائے جو اس مجلس کے عالم وجود میں آنے کے باعث ہوں گے۔ وزیر کا مقصد اگرچہ دہشت انگیز افعال قبیحہ کے مخالف واقع ہوگا مگر دبے دبائے افعال کا وہ روادار ہو جائیگا وہ محل و موقع کے حسب حال کارروائی کرے گا، بدنما معاملات کو خوشنما لباس میں ظاہر کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ اتنے نقصان کا آسانی سے روادار ہو جائیگا جو مجلس کو راضی رکھے مگر اتنے نقصان کا روادار نہ ہوگا جس سے قوم آزردہ ہو جائے۔ شریک کار مجرم بن جانے میں اسے زیادہ لیت ولعل نہ ہوگا اسکی

کوشش جو کچھ ہو گی یہ ہو گی کہ وہ جرم کو ہلکا کر دکھائے۔ اگر کوئی بے لوث وقابل بیرونی صاحب اقتدار مل سکے تو ایسے شخص کی مداخلت بلاشک و شبہ انتخاب کنندہ مجلس کی حرص وطمع کے ساتھ ساتھ اس کی فرقہ بندی کو بھی روک دے گی۔

مگر سوال یہ ہے کہ ایسا سرتاج مل بھی سکتا ہے یا نہیں؟ میرا خیال ہے کہ ایک موقع کے لئے ایسا شخص مل گیا ہے انگلستان کی نوآبادیوں کے گورنر ٹھیک ایسے "اشخاص از غیب" کے مصداق ہیں۔ وہ ہمیشہ سمجھدار ہوتے ہیں کیونکہ ان کا گزر کسی دوسری ہی تجارت پر ہوتا ہے۔ ان کا بے لوث ہونا تقریباً یقینی ہے کیونکہ وہ دنیا کے دور دراز مقامات کا تجربہ حاصل کئے ہوئے ہوتے ہیں یہ بھی یقینی ہے کہ وہ نوآبادیوں کے کسی طبقہ یا جماعت کے خود غرضانہ خواہشات میں شریک نہ ہوں گے، کیونکہ ان خواہشات کے برگ و بار لانے سے بہت ہی قبل وہ دنیا کے دوسرے گوشہ میں پہنچ چکے ہونگے، انھیں دوسری ہی شکل وشمائل کے لوگوں سے سابقہ پڑ چکا ہو گا اور ان کے کانوں تک یہ آواز بھی نہ پہنچے گی کہ جس ملک کو وہ نیم فراموش کر چکے ہیں وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ایک مستعمری والی پارلیمنٹی اقتدار سے بالاتر شخص ہے اس کی عقل و دانش کافی و وافی ہوتی ہے اور یہ عقل و دانش مقامی پارلیمنٹ کی عقل و دانش سے اگر فائق نہیں تو اس سے مغائر ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اس صورت میں اس خارجی اقتدار کا فائدہ بڑی گراں قیمت پر خریدا گیا ہے اور اس قیمت کو اس وجہ سے ہلکا نہ قرار دینا چاہئے کہ اکثر اس کا ادا کرنا ہی مناسب ہوتا ہے مستعمری والی اس قسم کا حکمراں ہوتا ہے جسے اپنی زیر حکومت نوآبادی میں کوئی مستقل دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ جب وہاں بھیجا جاتا ہے تو غالباً اسے نقشہ میں اس مقام کو تلاش کرنا پڑتا ہے، اسے وہاں کے فرقوں اور وہاں کے اختلافات کے صحیح طور پر سمجھنے میں برسوں گزر جاتے ہیں۔ وہ فوراً اگرچہ پہلے سے کسی خیال کیطرف مائل نہیں ہوتا مگر ممکن ہے کہ وہ اپنے آس پاس کے لوگوں کے میلانات کا غلام بنجائے۔ لامحالہ وہ نوآبادی کے مفاد کو (جس کے سمجھنے میں اس سے غلطی ہو سکتی ہے) مدنظر رکھکر حکومت نہیں کرتا بلکہ اپنے مفاد کو پیش نظر رکھکر حکومت کرتا ہے جسے وہ صریحی طور پر دیکھتا ہے اور جس کا اسے یقین ہے، اور اسی طرز حکومت کی

مدح سرائی کیجاتی ہے۔ اس کی پہلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ خود کسی "مشکل" میں نہ پھنسے وہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جس سے اس کے انگلستان کے بالادستوں یعنے وزارت مستمری کے ارکان کو کوئی وقت پیش آئے، اور خود اسے بے وقت اور مشکوک طور پر واپس بلا لیا جائے جس سے اس کی آئندہ زندگی کو نقصان پہنچ جائے۔ اسے یہ یقین ہے کہ وہ باشندگان نوآبادی کے دلوں میں یہ خیال چھوڑ کر جائے گا کہ ان کا حکمراں ایسا رہا ہے جو انھیں قدر قلیل جانتا تھا اور ان کی فکر اسے اتنی بھی نہ تھی۔ اہل انگلستان اپنی نوآبادیوں کے اس عام احساس کو اس وجہ سے کماینبغی نہیں سمجھتے کہ وہی وہاں کے لئے فرمانروا مقرر کرتے ہیں لیکن اگر سیاسی قلب ماہیت سے صورت حال بدل جائے اور نوآبادی والے انگریزوں کے لئے فرمانروا مقرر کرنے لگیں تو پھر انگریز اس حقیقت کو ایک آن واحد میں سمجھ جائیں۔ وہ معاً یہ کہنے لگیں کہ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نیوزیلینڈ کا ایک شخص انگلستان کو سمجھ سکے، یہ ممکن ہے کہ جو شخص کرۂ ارض کی دوسری جانب چلے جانے کی آرزو کر رہا ہو، اسے انگلستان کی کچھ فکر ہو؟ ہم ایک ایسے شخص پر کیونکر اعتماد کر سکتے ہیں جو ایک دور و دراز کی ذی اقتدار قوت کے متلون مزاجیوں کا آسرا لگائے بیٹھا ہو۔ ہم کیسے اس شخص کی دل سے اطاعت کر سکتے ہیں جو صرف زبان کے اتفاقاً یکساں ہونے کے علاوہ اور ہر طرح پر ہم سے اجنبی ہو"

جن نقائص کے باعث استعماری حکمرانی کی خوبیاں غارت ہو رہی ہیں میں ان پر اس وجہ سے بحث کرتا ہوں کہ یہ استعماری گورنری (ولایت) پارلیمنٹ سے فائق شاہی کی سب سے زیادہ پسندیدہ مثال ہے، اور اس پر نظر ڈالنے سے انگریز از سر نو اس امر کو ذہن نشین کر سکتے ہیں کہ اس ادارے کے حقیقی مشکلات کیا ہیں۔ انگریز اس سے اس درجہ مانوس ہیں کہ وہ اسے سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ ان کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو کسی شخص کو زندگی بھر جانتے رہے ہوں لیکن جب وہ اپنی کسی صریحی و بدیہی خصلت کا اظہار کرتا ہے (جسے گاہ بگاہ کے دیکھنے والے ایک نظر میں تاڑ جاتے ہیں) تو یہ لوگ بالکل حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔ میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی بہن کی

آنکھ کا رنگ کیا ہے، حالانکہ وہ بیس برس سے اسے روزانہ دیکھتا رہا تھا، کہنا یہ چاہیئے کہ چونکہ وہ اسے اس طرح سے دیکھتا رہا تھا اسی وجہ سے وہ اس امر کو نہیں جانتا تھا - یہ فلسفیانہ اصول کس درجہ صحیح ہے کہ ہم اپنے خیالات کے دائمی عنصر کی جو غالباً نہایت ہی اہم ہوتا ہے پروا نہیں کرتے اور محض تغیر پذیر عناصر کی طرف خواہ وہ کم وقعت ہی کیوں نہ ہوں، متوجہ رہتے ہیں (انھیں تغیر پذیر عناصر کو لوگ تفریقی عناصر کہتے ہیں) مگر جب ہم ایک مستعمری والی کی مثال سے گھبا پھرا کر یہ سمجھتے ہیں، کہ پارلیمنٹ کے برطرف کرنے کے لئے ایک آئینی بادشاہ کا کام کس قدر دقت طلب ہے تو ہم معاً یہ سمجھ جاتے ہیں کہ ایک موروثی بادشاہ سے یہ امر کس قدر مستبعد ہے کہ اس میں اس کام کے حسب حاجت صفات موجود ہوں -

اوسط درجہ میں ایک موروثی بادشاہ زیادہ سے زیادہ ایک معمولی شخص ہے - یہ تو کم و بیش یقینی ہے کہ کاروبار کے لئے اس کی تعلیم خراب ہوی ہوگی، اس میں کاروبار کے ذوق کے موجود ہونے کی بہت کم توقع ہوسکتی ہے، عیش و طرب کی ہر طرح کی ترغیبات بچپن ہی سے اس کے قدم چومتی رہتی ہیں، غالباً اس نے ساری زندگی اس مضرت رساں حالت میں گزاری ہوگی کہ وہ ولیعہد سلطنت ہے وہ اس وجہ سے کوئی کام نہیں کرسکتا کہ اس کا کوئی مقرر کام نہیں ہے اور اگر وہ از خود کوئی کام کرے تو یہ سمجھا جائے گا کہ وہ اپنے حد اختیار سے باہر ہو گیا ہے - زیادہ تر تو یہی ہوتا ہے کہ آئینی بادشاہ ایک "نقصان رسیدہ" عام شخص ہوتا ہے - اسے کام کے لئے اس طرح مجبور نہیں ہونا پڑتا جیسے ایک مطلق العنان بادشاہ کو اکثر مجبور ہونا پڑتا ہے مگر ایک مطلق العنان بادشاہ جس قسم کی ترغیبات و تحریصات سے تباہ ہوتا ہے، اکثر کام کرنے کے لئے اسی قسم کی ترغیبات و تحریصات اسے بھی غارت کرتی ہیں، تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ موروثی بادشاہی خاندانوں میں ان کے منصب کے خراب کن اثر کے تواتر و تسلسل کی وجہ سے ان کے خون میں کچھ تاریک رنگ آجاتا ہے، کوئی زہر ایسا ہوتا ہے جو ان میں برابر ساری ہوتا اور ترقی کرتا رہتا ہے جس سے ان کی قوت رائے کو صدمہ پہنچ جاتا، ان کے حزن و ملال میں مزید تاریکی پیدا ہو جاتی اور ان کے نصف مسرات پر بھی ابر چھا جاتا ہے - اس قول میں کہ "تخت ایسی ہر ایک

موروثی بادشاہ فاتر العقل ہوگیا تھا" اگر پوری صداقت نہیں ہے تو بھی تھوڑی بہت کچھ صداقت ضرور ہے۔ کیا یہ توقع ہوسکتی ہے کہ اس قسم کے بادشاہ اس وقت کا ٹھیک ٹھیک پتہ چلالیں کہ کب ایک شاندار کامیاب وزارت کے علی الرغم انھیں پارلیمنٹ کو برطرف کردینا چاہیے۔ اس کام کو صحت وخوبی کے ساتھ انجام دینے کے لئے ان میں اس امر کے سمجھنے کی قابلیت ہونا چاہیے کہ پارلیمنٹ غلطی پر ہے، اور قوم بھی اس کو جانتی ہے کہ پارلیمنٹ غلطی پر ہے، لیکن اس امر کے جاننے کے لئے کہ پارلیمنٹ غلطی پر ہے اگر جلیل القدر مدبر کی نہیں تو ایک معقول درجہ کے مدبر کی تو بہر نوع ضرورت ہے"۔ بادشاہ میں بہت ہی بڑھی ہوئی خلقی قوت ہونا چاہیے کیونکہ معمولی درجہ کی قوت قومی حکمت عملی کے سخت اصول کو قابو میں نہ لاسکے گی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ علی التسلسل محنت سے کام کرتا رہے کیونکہ ادنی درجہ کی محنت سے وہ ان جزئیات مشمولہ کے ہمقدم نہ رہ سکے گا جن کا اس اصول سے تعلق ہے، اور نہ وہ گاہ بگاہ کے اس محل وموقع کو سمجھ سکے گا جہاں اس اصول کو عمل میں لانے کی ضرورت ہوگی۔ جو شخص خلقاً معمولی طبیعت کا انسان ہو اور اس کی طرز زندگانی نے اسے اور بدتر بنادیا ہو، اس میں ان دونوں میں سے کسی امر کے وجود کی بھی توقع نہیں ہوسکتی۔ یہ تو تقریباً یقینی ہے کہ اس میں زیرکی وجفاکشی دونوں صفتیں جمع نہ ہونگی۔ ایک بادشاہ جو محل کے عشرت خانوں میں زندگی بسر کرتا ہو، لوگوں کی فریب وہ خوشامدوں کو سنتا ہو، جسے عام دنیا کے حالات کا تلخ تجربہ نہ ہوتا ہو جس کے اردگرد ہمیشہ جاہ وجلال کا حلقہ کھنچا رہتا ہو، ایسے بادشاہ سے اس کے سوا کیا امید ہوسکتی ہے کہ رائے عامہ کے متعلق اس کا فیصلہ ایک کمزور فیصلہ ہوگا ممکن ہے کہ اس میں رائے عامہ کے معلوم کرلینے کا خلقی ملکہ ہو مگر اسکی زندگی اس طرح بسر ہوگی کہ اس سے وہ ہرگز کچھ سیکھ نہ سکے گا۔ بلکہ غالب یہ ہے کہ وہ ملکہ اور کمزور ہوجائے گا۔

لیکن ایک اس سے بھی بدتر صورت ہے جو جارج سوم کے سوانح زندگی سے فوراً ذہن میں آجاتی ہے۔ اس کی زندگی گیا تھی، آئینی بادشاہ کی کوتاہیوں کا ایک عجائب خانہ تھی ممکن ہے کہ پارلیمنٹ قوم سے زیادہ دانشمند ہو اور اس کے

ساتھ ہی بادشاہ کی رائے قوم کی رائے سے متفق ہو۔ جنگ امریکہ کے آخری برسوں میں وزیر اعظم لارڈ نارتھ جس پر سب سے اول اس جنگ کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، وہ اس جنگ کے جاری رکھنے سے برداشتہ خاطر اور جانتا تھا کہ اس میں کامیابی نہ ہوگی، پارلیمنٹ کا بھی بہت کچھ ہی خیال تھا۔ گر لارڈ نارتھ سے یہ ہوسکتا کہ وہ ایک صلحنامہ لیکر نئی پارلیمنٹ میں آتا تو غالباً پارلیمنٹ خوش ہو جاتی اور قوم کو اگرچہ اپنے نقصانات کا رنج ہوتا مگر پارلیمنٹ کی سرکردگی میں غالباً وہ بھی مطمئن ہو جاتی۔ اُس زمانہ کی رائے اس زمانہ کے انگریزوں کی رائے کے مشابہ ہونے کی بہ نسبت اس وقت کے اہل امریکہ کی رائے کے زیادہ مشابہ تھی۔ اس زمانہ میں رائے کے قائم ہونے کی رفتار اس زمانہ کی بہ نسبت بہت سست تھی وہ بہت جلد مرکزی حکومت کے فوری اشتعالات کے زیر اثر آجاتی تھی۔ اگر لارڈ نارتھ کو یہ موقع حاصل ہوتا کہ وہ حکومت عاملانہ کی غیر منقسم قوت، اور اس کے غیر منتشر اقتدار سے صلح کے قیام و دوام کے اعلیٰ و افضل مقصد کو سرانجام دے سکتا تو برسوں کی خونریزی سے نجات مل گئی ہوتی اور عداوت کی وہ شاخ جو ابھی زوردار نہیں ہوئی تھی کٹ جاتی، مگر وزیر اعظم کے عقب میں ایک طاقت اور بھی تھی، جارج سوم جنگ کے جاری رکھنے کے لئے دیوانہ ہو رہا تھا اور ناواقف، سست قوم بھی اس کے ساتھ چلنے پر آمادہ تھی۔ قوم نہ تو اس جنگ و جدل کی یاس افزا حالت کو دیکھتی تھی اور نہ اس دیر پا عداوت کو سمجھتی تھی جو اس کی اس ضد کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھی۔ لارڈ نارتھ اگر صلح کی خواہش ہی کرتا اور پارلیمنٹ کو بھی اس پر راضی کر لیتا تو بھی اس کی تمام کوشش بیکار جاتی ایک اس سے بالاتر طاقت، اس دانشمند و صلح جو پارلیمنٹ کا مرافعہ ایک مغموم و آمادۂ جنگ قوم کے سامنے پیش کر سکتی تھی۔ پس انگلستان کے دستور سیاسی میں وہاں کی پارلیمنٹ کی خاص خرابیوں کے لئے جو خاص روک رکھی گئی ہے اس کے غلط استعمال سے پارلیمنٹ کی دانائی کو تباہ کیا گیا۔

کابینی حکومت کی ماہیت پر ہم جس قدر غور کریں گے اسی قدر ہم اس امر سے جھجکیں گے کہ کسی نہایت ہی اہم موقع پر کابینی حکومت کی نازک کل کو

ہم کسی اتفاقی کے نا اہل اور شاید نیم مجنون بیرونی شخص کے دست اول کے لئے وقف کر دیں۔ نہایت درجہ اغلب یہی ہے کہ ایسے اہم موقع پر وزیر اعظم اور پارلیمنٹ میں فی الواقع بادشاہ سے زیادہ دانشمندی ہوگی۔ یہ یقینی ہے کہ عمدہ فیصلے کے لئے وزیر اعظم کی قابلیت بڑھی ہوئی ہے اور اسی کو سب سے زیادہ اسکی فکر بھی ہوگی۔ اگر وہ فیصلہ میں ناکام رہے گا تو اپنی جگہ کھو بیٹھے گا۔ حالانکہ بادشاہ ہر طرح کی غلطیاں کرنے کے بعد بھی اپنی جگہ پر قائم رہے گا۔ اس شخص کی قوت فیصلہ جو بالطبع بہت ہی زیرک و باہوش ہو ایک سخت تاوان کے خوف سے اور بھی ذکی الحس ہو جائے گی مگر جس شخص کی ذہانت فطرتاً اس سے بہت کم ہو وہ اپنے آپ کو اس تاوان سے مستثنیٰ سمجھے گا۔ نیز پارلیمنٹ بھی اکثر و بیشتر ایک ذی ہوش، بافکر اور کام کرنے والی جماعت ہوتی ہے۔ اصول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی حکومت کو موقوف کر دینا جس سے پارلیمنٹ کو اطمینان ہو اور صورت حال کو قوم کے روبرو پیش کرنے کی بنا پر خود اسی پارلیمنٹ کو برطرف کر دینا یہ ایسے اختیارات نہیں ہیں جنھیں ایک عام موروثی بادشاہ انجام کار میں سود مند طور پر انجام دے سکے گا۔

پس یہ اختیار انگریزی دستور سلطنت کے واقعی عملدر آمد میں اگر کلیۃً ساقط نہیں ہو گیا ہے تو کم و بیش معطل ضرور ہو گیا ہے۔ انگریزی قوم کو غالباً کوئی شئے اس سے زیادہ حیرت میں نہیں ڈال سکتی کہ ملکہ و فعتۃً واحدۃً ایک ضرب سے اس وزارت کا تختہ الٹ دے جسے مستحکم طور پر پارلیمنٹ کی موافقت اور اس کی کثرت رائے کی طمانیت حاصل ہو۔ نظری طور پر تو یہ اختیار بلا ردوکد ملکہ کو حاصل ہے لیکن لوگوں کے دلوں سے یہ اس درجہ محو ہو چکا ہے کہ اگر ملکہ اس کا استعمال کرے تو لوگ اس سے ایسے دہشت زدہ ہو جائیں گویا پر امن پہاڑی سے آتش فشاں مادہ پھوٹ نکلا ہو۔ آخری مرتبہ جو کارروائی اس اختیار کے مشابہ ہوئی ہے اسے نظیر قرار دینے سے گریز کرنا چاہئے۔ یہ واقعہ ۱۸۳۵ء میں پیش آیا جب ولیم چہارم نے ایک ایسی حکومت کو برطرف کر دیا جس کا شیرازہ اس وجہ سے بکھر گیا تھا کہ دارالعوام میں اس کا کوئی سرگروہ

نہیں رہا تھا مگر وہ حکومت بہر نوع قائم تھی اور دارالامرا میں اس کے لئے ایک
وزیر اعظم موجود تھا جو اس کی رہبری کے لئے تیار تھا اور دارالعوام میں بھی ایک
نیا سرگروہ کام شروع کر دینے کے لئے آمادہ تھا۔ بادشاہ کو یہ گمان ہوا کہ رائے عامہ
دھگوں کی طرف سے ہٹ کر ٹوریوں کی طرف مائل ہوتی جا رہی ہے، اور اس لئے
اسے یہ خیال تھا کہ اسے چاہیئے کہ سابق الذکر کو حکومت سے خارج کر کے اس تغیر کو اور بھی
تیز کر دے۔ اس کا یہ تفرس واقعی صحیح تھا۔ انگریزی قوم دھگوں کی وفا شعار نہیں رہی
تھی بلکہ فی الواقع تذبذب میں پڑ گئی تھی کیونکہ دھگوں کا کوئی ایسا سرگروہ نہیں تھا
جس کا اثر طبائع پر پڑتا ہو، نہ کوئی ایسا شخص تھا جو حیرت کا نمونہ مجسم بن جاتا اور دلوں کو
جوش سے بھر دیتا۔ علاوہ ازیں یہ لوگ مدت ہائے دراز سے فریق مخالف رہنے
کے عادی تھے اس لئے برسرکار ہو کر بہت سی غلطیاں کر رہے تھے۔ وہ اس
عام جوش کی وجہ سے حکومت پر پہنچ گئے تھے جسے وہ آدھا بھی نہیں
سمجھے تھے اور اس جوش میں ان کی شرکت تو اور بھی کم تھی۔
مگر بادشاہ کی حکمت عملی بھی غلط تھی، اس نے اس رجعت عمل
میں مدد دینے کے بجائے الٹا اسے روک دیا، اس نے قبل از وقت
جبراً و قہراً ایک ٹوری حکومت ملک پر مسلط کر دی مگر تمام ذی فہم اشخاص نے یہ
سمجھ لیا تھا کہ یہ حکومت ناکام ہو گی اور ایسا ہی ہوا، دھگوں کے خلاف عام
رجحان ابھی بالکل ہی ابتدائی حالت میں اور نہایت کمزور تھا اور بادشاہ کی یہ
مداخلت ان کے لئے نفع رساں بن گئی کیونکہ یہ کارروائی قوم کی حریت آزادی
کے منافی معلوم ہوتی تھی۔ تغیر رائے کی ابتدائی حالت کو دریافت کرنے میں
ولیم چہارم جس حد تک صحت پر تھا اسی حد تک یہ بھی ہے کہ اس نے اس
تغیر کو سمجھنے میں غلطی بھی کی۔ چاہیئے یہ تھا کہ لبرل حکومت کو طول دیا جاتا۔ اس
ابتدائی بے اطمینانی کا تعلق محض دھگ سرگروہوں کی شخصی ناقابلیت اور
آزادانہ اصولوں کے دوسرے ہنگامی عوارض سے تھا خود ان اصولوں سے
فی نفسہ بے اطمینانی نہیں تھی۔ بہرحال وزارت پر بادشاہ کی دھمکیوں کی اس
آخری نظیر کا انجام یہ ہوا کہ صحیح اصول کی مخالفت اور غلط اصول کی تائید ہوئی

اور جس فریق کو نفع پہنچانا مقصود تھا اسے نقصان پہنچ گیا۔ اس قسم کی تنبہ کے بعد توقع یہی ہے کہ انگلستان کے بادشاہ اس حکمت عملی پر چلیں گے جدھر فی الحال مدتوں کی خاموشانہ نظر اشارہ کر رہی ہے یعنے جس وزارت پر پارلیمنٹ کو بھروسہ ہوگا اسے وہ پارلیمنٹ ہی کے فیصلہ پر چھوڑ دیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے اندر قوم کے معیار سے بڑھکر فریقانہ جوش کے ظاہر ہونے اور قوم کے صحیح اغراض کے خلاف پارلیمنٹ میں خود غرضی کے رونما ہونے سے جو خطرات پیدا ہوتے ہیں وہ ایک ایسے ملک میں بہت اندیشہ ناک نہیں ہوتے جہاں قوم کی طبیعت سیاسیات کی جانب مائل ہو اور جہاں قوم کے نمائندوں پر قوم کو مستقل قدرت حاصل ہو۔ انگلستانی سیاسیات کی طرف قوم کی توجہ اس درجہ بلا انقطاع رجوع رہتی ہے اور ہر ایک رکن کو اپنی گرانبہا جگہ کھو دینے کا اس درجہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ کسی قائم شدہ رائے عامہ کے خلاف دارالعوام میں مستقلاً مخالفت کا برپا رہنا بالکل ہی خارج از بحث ہے۔ یہ خطرات ابتدائی اور منتشر قوموں کے لئے ہیں جہاں دلچسپ سیاسی مسائل موجود نہیں ہوتے، جہاں مختلف مقامات میں دور دراز فاصلہ حائل ہوتا ہے جہاں پارلیمنٹ کی متجاوز الحد کارروائیوں پر کوئی باخبر رائے کسی قسم کا فیصلہ نہیں صادر کرتی، جہاں محض معدودے چند افراد کو ایوان میں جگہ حاصل کرنے کی فکر ہوتی ہے اور جہاں ان معدودے چند میں سے بیشتر ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے اپنے اخلاق اور اپنے سابق حالات کی بنا پر ایوان میں رہنا کسی دوسری جگہ رہنے سے کچھ بہتر نہیں ہوتا۔ حد بلوغ کو پہنچی ہوئی سیاسی قوم میں پارلیمنٹی حکومت کی ایک بہت بڑی خرابی یہ ہے کہ وزارت کے انتخاب میں پارلیمنٹ بڑی حرص و طمع سے کام لیتی ہے۔ اس محل پر قوم کے لئے مشکل ہوتا ہے کہ وہ پارلیمنٹ کو قابو میں رکھ سکے اور یہ اچھا بھی نہیں ہے کہ وسیع حدود سے گزر کر قوم پارلیمنٹ کے معاملات میں زیادہ دخل دے۔ کسی حکومت کے عیب و صواب کے متعلق پارلیمنٹ کی رائے کا انحصار زیادہ عام طور پر ان معاملات پر منحصر ہوتا ہے جنھیں پارلیمنٹ قریب تر ہونے کی وجہ سے صاف طور پر دیکھتی ہے

مگر قوم اپنی دوری کی وجہ سے انھیں نہیں دیکھتی لیکن جہاں شخصیت کا قدم درمیان آیا وہیں حرص و طمع کا بھی آغاز ہوا۔ ذہن میں ایک ایسی پارلیمنٹ کا تصور کرنا آسان ہے، جو کسی سے بھی راضی نہ ہو، جو چھوٹے چھوٹے فریقوں پر مشتمل ہو، چھوٹی چھوٹی جماعت بندیوں کی صورت میں رائے دیتی ہو جو کسی سیر گروہ کے ساتھ مستقلاً وابستہ نہ ہو جو ہر سر گروہ کو موقع دیتی اور اسے امید دلاتی ہو۔ اس قسم کی پارلیمنٹوں کے لئے ضرورت ہے کہ ان پر یہ دباؤ قائم رہے کہ ہمہ وقت ان کے منتشر کردئے جانے کا امکان موجود ہے۔ مگر (جیسا کہ ثابت ہو چکا ہے) اس دباؤ کا وزیر اعظم کے ہاتھ میں رہنا بادشاہ کے ہاتھ میں رہنے سے زیادہ بہتر ہے اور ادھر کے ایام میں انگلستان کے نظام سلطنت پر جس طرح عملدرآمد ہو رہا ہے اس سے یہ کام سال بسال بادشاہ کے ہاتھ سے نکلتا جاتا اور وزیر اعظم کے ہاتھ میں آتا جاتا ہے۔ کسی وزیر کو اگر شکست ہو جائے تو اسے پارلیمنٹ کے برطرف کرنے کا موقع نہ دینا ملکہ کے لئے اس سے کم دشوار نہیں ہے کہ وزیر کو شکست نہ ہوئی ہو اور ملکہ اس کی رضامندی کے بغیر پارلیمنٹ کو برطرف کر دے۔

میں نے جس شئے کو انگلستان کے نظام سلطنت کا حاجز محافظ (Safety-valve) کہا ہے، اس کی صورت حال بھی تقریباً ایسی ہی ہے ایک اچھا اور قابل، موروثی بادشاہ اس کا استعمال وزیر اعظم سے بہتر کرے گا مگر وزیر اعظم ہی اس کا انتظام معقول طور پر کر سکتا ہے، لیکن ایسا بادشاہ جو اس کام کو وزیر اعظم سے بہتر انجام دے، وہ صدی میں صرف ایک بار پیدا ہوتا ہے اور اس کام کو خراب کرنے والے بادشاہ روز ہی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس زمانہ میں حکام بالملانہ کے اقتدار سے جس طرح نئے امرا بنائے جاتے ہیں یعنے انگلستان کے اعلیٰ و اشرافی ایوان کے لئے مزید ارکان نامزد کئے جاتے ہیں، اس کے دو طریقے ہیں جن میں سے ایک طریقہ تو عادتی طور پر برابر جاری رہتا ہے اور اس کے دوران عمل میں عام طبائع اسے کافی طور پر محسوس نہیں کرتیں اور دوسرا طریقہ ایک پرخطر طریقہ ہے مگر وہ ناممکن العمل نہیں ہے اگرچہ

فی الواقع اس پر شاید ہی کبھی عمل ہوا ہو تاہم اس کا سحر دلوں پر ایسا مسلط ہے کہ اس سے بہت وسیع و امتناعی اثر قائم رہتا ہے۔ بادشاہ سال بسال چند نئے امرا کا تقرر کرتا اور اس طرح دار الامرا کے مخصوص احساس و خیال میں برابر ترمیم کرتا رہتا ہے۔ میں نے باخبر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ "انگریزی" امرا میں اب ٹوریوں سے زیادہ دھگوں کا اثر نمایاں ہے (انگریزی امرا کی تخصیص اس وجہ سے کی کہ بدقسمتی سے اب یہی ایک طبقہ رہ گیا ہے جو نئے عطائے منصب کے زیر مشق رہتا ہے) تیس برس قبل کثرت رائے، بلارد و کد دوسری جانب تھی۔ نہایت ہی عجیب و غریب حالات کے پیش آجانے سے انگلستان کے مختلف فریق یکے بعد دیگرے اس طرح برسر اقتدار نہیں آئے جیسا اس وقت کے توقعات سے بہت کچھ پیشین گوئی کی جاتی ہے اور عام بات چیت میں تو بہت کچھ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ایسا ہو گیا ہے۔ دھگ فریق (چند بہت ہی مختصر وقفوں کے علاوہ) ایسن کے عہد سے لارڈ نارتھ اور مسٹر فارکس کے اتحاد باہمی کے زمانہ تک ستر برس صاحب اقتدار رہا۔ اس کے بعد ٹوری فریق بھی (ایسے ہی قلیل وقفوں کے علاوہ) سنہ ۱۸۳۲ء تک پچاس برس حکمراں رہا اور پھر اس کے بعد سے دھگ فریق چند برائے نام وقفوں کے علاوہ غالب چلا آرہا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک مسلسل حکمرانی کرنے والے فریق کو یہ موقع ملتا رہا کہ وہ دار الامرا کو اپنے خیالات سے ہمنوا بنانے کے لئے اس میں ترمیم کرتا رہے۔ ٹوریوں نے نصف صدی کے اندر اندر اس کثرت سے نئے امرا بنائے کہ پہلے قانون اصلاح کے قبل دار الامرا بہت غالی ٹوری ہو گیا تھا مگر اب یہ حالت اس درجہ بدل گئی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ آئرلینڈ اور اسکاٹلینڈ کے امرا ہمیشہ ٹوری ہی رہتے ہیں، ان میں تغیر نہیں ہوتا کیونکہ ان کی نامزدگی ایک ایسے حلقہ انتخاب کی طرف سے ہوتی ہے جس میں کچھ بھی ردوبدل نہیں ہوتا، وہ اسی حلقۂ انتخاب کے کثیر التعداد فریق کے خیالات کی نمائندگی کرتے ہیں (اور قلیل التعداد فریق کی کوئی آواز ہی نہیں ہوتی) مگر جس حصہ میں تغیر کا موقع تھا اس میں تغیر ہو گیا ہے۔ اس زمانہ میں انگریزی امرا پر ٹوریوں کا اثر غالب ہو یا نہ ہو مگر اتنا یقینی ہے کہ

اب وہ ۱۸۳۲ء والے ٹوری نہیں رہے ہیں - یہ ضرور ہے کہ ڈھگوں کا یہ اضافہ ایک ایسے طبقہ سے ہوا ہے جو استیصالیت کی طرف مائل ہونے سے زیادہ ٹوریوں کا ہمرنگ تھا - بڑے بڑے دولتمندوں سے یہ توقع رکھنا کہ کسی منظم تغیر میں ان سے کوئی بہت بڑی مدد ملے گی محض عبث ہے - نئے امرا کا اضافہ اس عمدگی سے ہوا ہے کہ وہ پرانے امیروں کے دوش بدوش کھڑے ہو گئے ہیں اس لئے وہ بہت آسانی کے ساتھ وسیع و دوررس ترمیمات کو عمل میں لا سکتے ہیں - اگر متضاد اجزا کا کثرت سے اضافہ کر دیا جاتا تو اس میں نیا جوش آ جاتا مگر ہم جنس و مختلف النوع اجزا کے آہستہ آہستہ شامل کر لئے جانے سے پرانے خمیر کو بگاڑے بغیر نئی معجون تیار ہو گئی ہے -

نئے امرا کے بنانے کا یہ معمولی و عام اختیار ہمیشہ وزیر اعظم کے ہاتھ میں رہتا ہے اور اس کا وزیر کے ہاتھ میں رہنا ہی اس کے اس خاص انحاص کے استعمال کا موجب ہے - فریق غالب کے سرگروہ ہونے کی حیثیت سے وزیر اعظم ہی وہ موزوں شخص ہے جو اس مستقل ایوان میں جو آغاز کار کے وقت شاید وزیر کا معاند رہا ہو، با آہستگی ترمیم کر دے گا اتنا تو ضرور ہو جائے گا کہ جدید اضافوں سے یہ ایوان بہترین طور پر اس رائے عامہ کے ہم آہنگ ہو جائے گا جس کی نمائندگی وزیر کر رہا ہے - کوئی بھی تو ترتیب سیاسی دستور ایسا نہ ہو گا جس میں ایوان ثانی کے ترمیم کرنے کی کل ایسی نازک ایسی لوچدار اور ایسی پائدار ہو - اگر دارالحیات امرا کے تقرر کا اضافہ ہو گیا ہوتا تو دارالامرا پر ذمہ دار حکام عاملانہ کا جو اثر گھٹتا جا رہا ہے اس میں ایسی خوبی پیدا ہو جاتی کہ باید و شاید -

ایوان اعلیٰ کو مغلوب کر لینے کی غرض سے نئے امرا کا تباہی انگیز اضافہ اس کارروائی سے ایک بالکل مختلف شئے ہے - اگر ایوان سے خارج کوئی قابل و بے لوث بادشاہ موجود ہو تو اس اختیار کا بادشاہ کے ہاتھ میں رہنا سب سے اچھا ہے - یہ ایک ایسا اختیار ہے جو صرف نہایت ہی اہم مواقع پر استعمال ہو گا جبکہ مقصد پیش نظر نہایت ہی عظیم الشان ہو اور فریقانہ جنگ و جدال میں کسی طرح کمی نہ آتی ہو - یہ اس نازک موقع کے لئے

آخری اور حاوی الاثر اختیار ہے، پس لامحالہ اس کا ایسے شخص کے ہاتھ میں رہنا جس میں قابلیت و بے لوثی دونوں صفتیں موجود ہوں، اس سے بہتر ہے کہ وہ وزیراعظم کے ہاتھ میں ہو جس میں کچھ نہ کچھ فریقانہ جانبداری کا ہونا لازمات سے ہے۔ قومی قسمت کے ایسے نازک موقع پر اگر کوئی فہمیدہ، پرسکون، اور دانشمند بادشاہ حکمراں ہو تو اس کی قدر و قیمت کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ وہ برسوں کے شور و شر کو روک سکتا ملک کو خونریزی و خانہ جنگی سے بچا سکتا، خود اپنے لیئے پر اطمنان شہرت کا ذخیرہ جمع کر سکتا ہے اور مختلف فریقوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے ایک شدید منافرت کے جاگزیں ہونے کو روک سکتا ہے۔ مگر سوال پھر وہی پیدا ہوتا ہے کہ آیا عین اس موقع پر ایسا بادشاہ موجود ہوگا بھی یا نہیں؟ ٹھیک اسی وقت میں ایسے بادشاہ کے موجود ہونے کی کیا توقع ہو سکتی ہے اور ایسے بادشاہ سے کیا نفع ہوگا جو بالعموم اتفاقات جانشینی کی وجہ سے ایسے مواقع پر تخت نشین رہا کرتے ہیں جیسا کہ سب لوگ جانتے ہیں۔ اس غریب و نادر معاملہ میں ہمیں تھوڑا بہت تجربہ حاصل ہے، اس سے ان سوالوں کا قابل اطمینان جواب نہیں ملتا۔ انگلستان کی تاریخ میں صرف دو موقع ایسے آئے ہیں جو امرا کے اس تہلکہ خیز تقرر کے قریب پہنچے ہوں کہ دارالامرا کی کثرت دفعۃً واحدۃً بدل جاتی۔ ان میں سے ایک موقع تو ملکہ این کے زمانہ میں آیا جبکہ دارالامرا میں وھگوں کی کثرت تھی اور ہارلی کی وزارت نے عاجلانہ طور پر کثرت سے نئے امرا کا تقرر کر دیا کہ صورت حالات دگرگوں ہوگئی اور ٹوریوں کی تعداد بڑھ گئی۔ اس کا عام اثر ایسا وسیع ہوا کہ دوسرے عہد میں وزارت کے متنازعہ فیہ مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ نئے امرا کے تقرر کا بے تعداد اختیار بادشاہ کے ہاتھ سے نکال لیا جائے اور جس طرح دارالعوام کے لئے ایک تعداد معین ہے اسی طرح دارالامرا کے لئے بھی تعداد معین کر دی جائے۔ مگر بادشاہ کو اس تمام معاملہ میں بہت کم دخل تھا، جن لوگوں نے کسی بڑی جگہ پر قدم رکھا ہے اس میں ملکہ این کی ہستی ایک بہت چھوٹی ہستی ہے۔ سویفٹ نے تلخی کے ساتھ کہا ہے مگر بہت سچ کہا ہے کہ "دو کہ اس کے پاس دوستی کا ذخیرہ

اتنا نہیں ہے جو ایک وقت میں ایک سے زیادہ دوستوں کے لئے کافی ہو سکے، اور
عین اس وقت میں اس کی تمام شفقت و محبت کا مرکز ایک پیش خدمت تھی،
اس کی اس پیش خدمت نے اس سے امرا کے بنانے کے لئے کہہ دیا اور اس
نے ایسا ہی کر دیا مگر وسیع خیالات اور حاوی تدبیر سے وہ اتنی ہی مبرا تھی.
جیسے مسز مشم ان صفات سے پاک و صاف تھی۔ اس نے ایک ناقص وزارت
کی اس کی غایت درجہ کی انتہائی کارروائیوں میں تائید کی اور یہ تائید بھی
طمع کی وجہ سے کی۔ ولیم چہارم کا معاملہ اس سے بھی زیادہ سبق آموز ہے۔
وہ ایک نہایت ہی ایماندار بادشاہ تھا مگر ساتھ ہی حد سے زیادہ کمزور بھی تھا۔
اس نے اس معاملہ کے متعلق لارڈ گرے سے جو مراسلت کی وہ ایک ضخیم جلد
کے نصف حصہ پر حاوی ہے، اس مراسلت کو اس کے معتمد کی مراسلت کہنا
بہتر ہوگا، کیونکہ وہ جو کچھ سوچتا تھا یا یوں سمجھئے کہ اس کے گرد و پیش کے لوگ
جو کچھ سوچتے تھے ان کے لکھنے کے لئے اس نے ایک بہت ہی ہوشیار شخص کو
مقرر کر رکھا تھا۔ یہ واقعہ ایک عالی مرتبہ شخص کی کمزوری اور اس کے تردد قلبی کی
ایک عجیب و غریب مثال ہے۔ بے شمار مراسلات کے بعد بادشاہ نے اس امر کی
رضا دی کہ اگر قانون اصلاح کی دوسرے خواندگی کے وقت ضرورت ہوئی تو
وہ ایک معقول تعداد نئے امرا کی بنا دے گا مگر "فدبدین" کا توریوں کا ساتھ
چھوڑ دینے سے اس اضافہ کے بغیر ہی دوسری خواندگی کو کثرت رائے سے منظور
ہو گئی اور اس کے بعد جب لارڈ لنڈہرسٹ نے ایک ایسی ترمیم منظور کرا دی
جس سے یہ قانون بیکار ہو جاتا یا جس کا منشا یہ تھا کہ یہ قانون بیکار ہو جائے تو
بادشاہ نے اس موقع کے لئے نئے امرا یا ان کی کافی تعداد مقرر کرنے سے انکار
کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مہیب نازک حالت پیدا ہو گئی اور قریب قریب
"انقلاب" کی سی صورت رونما ہو گئی۔ تاریخ میں نیک نیت کمزوری کی اس
سے زیادہ تعجب خیز مثال شاید ہی دوسری مل سکے۔ جو شخص بھی غور کے ساتھ
ان حالات کو پڑھتا ہے اسے مطلق شک نہیں رہتا کہ اگر یہ اختیار لارڈ گرے
کے ہاتھ میں ہوتا تو بادشاہ کے ہاتھ میں ہونے سے بدرجہا بہتر ہوتا۔ فریق مخالف

میں اس لاعلمی کی وجہ سے خصوصیت کے ساتھ، جوش بڑھا ہوا تھا کہ آیا بادشاہ اس اختیار پر عمل کرے گا بھی یا نہیں اور عمل کرے گا تو کس حد تک عمل کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی انقلاب کے وقت اختیار کا کسی کمزور شخص کے ہاتھ میں دیدیا جانا ممکن ہے مگر کمزور ہاتھوں میں اس کا برقرار رہنا دشوار ہے۔ اختیار از خود کمزور ہاتھوں سے نکل کر مضبوط ہاتھوں میں آجاتا ہے۔ نئے امرا کے تقرر کے اختیار کو ایسے وقت عمل میں لانے کے لئے جب اس کی شدید ضرورت ہو، تو ولیم چہارم اور جارج چہارم کے ایسے معمولی موروثی بادشاہ موزوں نہیں ہیں اور جارج سوم کا ایسا نیم مجنون بادشاہ اور بھی بدتر ہے۔ وہ کسی نامعلوم جوش میں آکر ایسے وقت میں اس کا استعمال کر بیٹھے گا جب اس کی ضرورت نہ ہو اور جس وقت اس کی ضرورت ہو گی اس وقت محض دیوانگی کی وجہ سے اس کے استعمال سے انکار کر دے گا۔

وزیر اعظم کے روبرو ایک خیالی روک کا ہونا فی الاصل مفید ہے، کیونکہ اس سے واقعی روک کے عمل میں دائمی دشواری پیش ہوتی ہے۔ از روئے قانون یہ شرط عاید کر دینا آسان ہے کہ امرا کی غیر معمولی مثلاً اس سے زاید تعداد ایوان ادنیٰ کی بہت بڑی مثلاً تین چوتھائی کثرت رائے کے بغیر نہ مقرر کیجائے گی۔ اس سے یہ تیقن ہو جائے گا کہ وزیر اعظم نظام سلطنت کی محفوظ قوت سے معمولی قوت کی طرح کام نہ لے گا، وہ اس وقت تک اسے استعمال نہ کرے گا جب تک تمام قوم قطعی طور پر اس کی خواہاں نہ ہو، یہ قوت انقلاب کے لئے محفوظ رہے گی اور عام نظم و نسق میں صرف نہ کیجائیگی۔ اس سے یہ بھی تیقن ہو جائے گا کہ بوقت ضرورت کام لینے کے لئے یہ قوت تیار رہے گی۔ ملکہ این اور ولیم چہارم کے واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس نزاکت طلب اور آخر الحیل طاقت کو کسی موروثی بادشاہ کے اتفاقی جوش طبیعت یا معمولی میانہ روی پر چھوڑ دینے سے دونوں میں سے کوئی مقصد بھی بالیقین حاصل نہیں ہوتا۔

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ایک ایسا مسئلہ جس کا عمل میں آنا بظاہر

نہایت بعید معلوم ہوتا ہو اور جو ایک معنی کر کے میرے مضمون سے بہت بے تعلق ہو میں اس پر اس قدر طول وطویل بحث کیوں کر رہا ہوں ۔ کوئی شخص یہ تجویز نہیں کرتا کہ ملکہ وکٹوریہ کو تخت سے اتار دیا جائے، دنیا میں اگر کسی کی جگہ محفوظ ہے تو وہ جگہ انھیں کی ہے ۔ خود انھیں خطبات میں ظاہر کیا جا چکا ہے کہ اہالی انگلستان ملکہ کے سوا اور کسی کی اطاعت نہ کریں گے، ملکہ کی ذات سے جو احترام پیدا ہوتا ہے وہی احترام (اس وقت کی سائینس کی زبان میں) وہ قوت اصلیہ ہے جس سے دوسری چھوٹی چھوٹی قوتیں پیدا ہوتی ہیں اور جس سے ادنیٰ درجہ کے فرائض میں زور اور کمال پیدا ہو جاتا ہے ۔ لیکن اگر اس موجودہ وقت اور ایک خاص ملک پر نظر نہ کی جائے بلکہ عام دنیا پر اور آئندہ زمانوں پر نظر کیجائے تو کوئی سوال اس سے زیادہ عملی نہیں ہو سکتا ۔

دنیا پر جو اثر چھاتا جا رہا ہے وہ ایک طرح پر واقعیت کا اثر ہے، ہر صدی میں یہ خیال بڑھتا جاتا ہے کہ اصل معیار نتائج کا معیار ہے ۔ تمام دنیا میں ایسے نئے ممالک عروج حاصل کرتے جاتے رہے ہیں جہاں احترام کا کوئی معینہ منبع و مخزن نہیں ہے ۔ جہاں ان منابع کے بنانے کی ضرورت ہے، جہاں ایسے ادارات پیدا کرتے ہیں جو اپنے صریحی فائدہ رسانی کی وجہ سے وفاداری کے مولد ہوں ۔ اس واقفیت نے یورپ میں بھی ہمارے اس زمانہ کی دو نہایت ہی جلیل القدر وجدید ترین ذہنی عاملات کی وجہ سے ترقی حاصل کی ہے ۔ ان عاملات میں سے ایک تو کاروبار ہے ۔ تجارت کے مادی ثمرات اس قدر آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں کہ ہم اس کے ذہنی ثمرات کو بھلا دیتے ہیں اس سے ایک ایسی طبیعت کی نشو ونما ہوتی ہے جو مادیات کی طرف راغب خیالات سے نفور اور الفاظ کی نزاکت و لطافت سے ناآشنائے محض ہوتی ہے ۔ یہی کلمہ اس کے ورد زبان رہتا ہے کہ ہر محنت میں نفع ہونا چاہیے، صرف اتنا ہی صحیح نہیں ہے کہ "ہمنے بہی کھاتے کی خاطر تلوار ہاتھ سے رکھدی ہے" بلکہ جنگ کا سر انجام جس قدر تلوار سے ہوتا ہے اسی قدر بہی کھاتے سے بھی ہوتا ہے ۔

اس زمانہ کا سپاہی اور مرد میدان کوئی تخیل پرست حیوان نہیں ہوتا جو مجنونانہ جوش سے بھرا ہوا، موہوم امیدوں کے پیچھے سر ٹکراتا پھرتا ہو، اور کسی معشوقہ طناز یا کسی شہریار مطلق کے خیالات میں مگن ہو۔ بلکہ وہ ایک پرسکون و باوقار شخص ہوتا ہے، جو نقشوں کے دیکھنے میں سرگرم، میزانات کے جوڑنے میں درست وصحیح خدعات جنگ میں ماہر، اور ادنیٰ ادنیٰ سی جزیات میں مشغول رہتا ہے، اور (جیسا کہ ڈیوک ولنگٹن کی نسبت کہا جاتا ہے) اسے سب سے زیادہ اپنے سپاہیوں کے جوتوں کا خیال رہتا ہے۔ اسے ہر طرح کی نمائش اور فصاحت وبلاغت سے نفرت ہوتی ہے، اور شاید کاونٹ مولٹکے کی طرح وہ "خاموش ہفت زبان بھی ہوتا ہے"۔ ہم رائے عام کی ایک ایسی اقلیم میں پہنچ گئے ہیں جہاں شمار و اعداد کی حکمرانی ہوتی ہے اور جہاں بادشاہوں کے حق خداداد کا موئید یعنے کاونٹ بسمارک اپنے چپ و راست بادشاہوں کو زیر و زبر کرتا ہر ایک کو نتائج کے معیار پر جانچتا ہے اور کسی ایسے بادشاہ کو باقی نہیں رہنے دیتا جس کا کوئی کام نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ پانچسو برس میں بنی نوع انسان کے حکمراں طبقے کے اولیں مشاغل میں تغیر عظیم واقع ہو گیا ہے۔ اس سے قبل بادشاہوں کے اوقات یا تو جوش انگیز کاموں میں صرف ہوتے تھے یا کاہلانہ عیش کوشی میں۔ ازمنہ جاگیری کے کسی بیرن کے لئے جنگ و شکار اور "مبتذل آرام طلبی" کے درمیان میں کوئی اور کام نہیں تھا، اب زمانہ حال کی زندگی جوش و ہیجان میں تو بہت پست ہے مگر خاموشانہ کام میں بہت مستقل وغیر منقطع ہے۔ اس کی دائمی تجارت سے ایک طرح کی "محاسبانہ" عادت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر شخص، ہر شئے، ہر تنظیم کے متعلق یہی سوال ہوتا ہے کہ "ہاں آخری مرتبہ جب میں نے تمھیں دیکھا تھا اس کے بعد سے تم نے کیا کیا ہے"

ہماری طبیعات، جواب ہزاروں شخصوں کے لئے اعلیٰ ترین مایہ تعلیم بنتی جارہی ہے، اور جواب عام علم ادب میں اس قدر پیوست ہونا شروع ہو گئی ہے کہ اس کا ادراک بھی کم لوگوں کو ہوتا ہے وہ بھی بالکل اسی طرف مائل ہے۔ اس کے دو خصوصیات، اس کی دلنشینی اور اس کی تجسس پسندی ہے۔ اس کی دلنشینی یہ ہے کہ لوگ جس شئے کو "لغو" واقعات کہا کرتے تھے اسی کی وہ قدردان ہے اور اس کی

تجسس پسندی یہ ہے کہ وہ ہمہ وقت اس فکر میں رہتی ہے کہ کیسی ہی محنت شاقہ کیوں نہ اٹھانی پڑے مگر اپنی آنکھوں سے دیکھکر اور اپنے کانوں سے سن کر یہ مصدق کر لیا جائے کہ یہ واقعات ہی ہیں۔ خیالات کا قدیم ہیجان نیم مردہ ہو چکا ہے، یا یوں کہئے کہ گاہ بگاہ سخت تشنج کی صورت میں ظاہر ہونے کے بجائے اس کی مسرت خاموشی کے ساتھ تمام زندگی پر پھیل گئی ہے۔ قدیم زمانہ کے فلاسفہ ڈیکارٹ وغیرہ کو یہ گمان ہوتا ہوگا کہ ابتدائی حقائق قائم کرکے (جنھیں وہ اپنی قوت ابداعی پر زور ڈال کر معلوم کر سکتے تھے) وہ محض استخراج نتائج سے کل کائنات کا خاکہ تیار کر لیں گے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ خود شدت کے ساتھ جانچ کرنے اور شدت کے ساتھ دلائل سے کام لینے سے ہر شئے حاصل ہو سکتی ہے، روح میں اگر تجرد لطیف کا کمال پیدا ہو جائے تو پھر جس شئے کی ضرورت ہو اسے "خود بخود" بنا سکتی ہے۔ انسان کے لئے جس اعلیٰ سے اعلیٰ مسرت کا امکان ہو سکتا ہے یہ فلسفہ اپنے پرستاروں کو اس کی طمع دلاتا تھا۔ اس سے بڑھکر اور کیا مسرت ہو سکتی ہے کہ کسی شئے کو برائے العین دیکھنے کی پابندی کے بغیر انسان ہمیشہ بادلیل ہو۔ مگر اب ہمارے زمانہ کے فلسفہ کے منصوبوں میں سے نہایت بلند پرواز منصوبہ کا آغاز بالکل ہی دوسری طرح پر ہوتا ہے۔ مسٹر ڈارون اس کی ابتدا یوں کرتے ہیں کہ:۔

"جب میں ماہر طبیعات کی حیثیت میں جہاز بیگل پر تھا تو مجھے جنوبی امریکہ کے بعض جانداروں کی تقسیم و ترتیب، اور اس براعظم کے اس وقت کے اور سابق کے باشندوں کے ارضیاتی تعلقات کے بعض واقعات سے سخت حیرت ہوئی۔ ان واقعات سے جیسا کہ اس جلد کے ابواب مابعد میں نظر آئیں گے اصل الانواع پر (جسے ہمارے ایک بہت ہی عالی رتبہ فلسفی نے "سر الاسرار" کہا ہے) کچھ روشنی پڑتی معلوم ہوتی تھی۔ پس جب میں ۱۸۳۷ء میں وطن واپس آیا تو میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا، کہ جن واقعات کا اس مسئلہ سے ذرا بھی تعلق ہو اگر ان سب کو صبر و استقلال کے ساتھ فراہم کرکے ان پر غور کیا جائے تو شاید کوئی بات نکل آئے۔ پانچ برس کام کرنے کے بعد میں نے یہ سمجھا کہ میں اس مضمون پر کوئی رائے قائم کر سکتا ہوں اور اس کے متعلق چند مختصر یادداشتیں مرتب کیں یہ کتابیں

ان یادداشتوں میں کچھ اضافہ کر کے میں نے ان نتائج کا ایک خاکہ تیار کیا جو مجھے
غالب الوقوع معلوم ہوتے تھے۔ میں اس وقت سے آج کے دن تک مسلسل اس
مضمون میں منہمک رہا ہوں میں ان جزئیات کا ذکر اس وجہ سے کرتا ہوں کہ یہ معلوم
ہو جائے میں نے کسی فیصلہ پر پہنچنے میں عجلت سے کام نہیں لیا ہے اور امید
ہے کہ ان شخصی جزئیات کے بیان کے لئے مجھے معذور رکھا جائے گا"

مسٹر ڈارون اگر انجام کار میں اس اہم مسئلہ کو حل کرنے کی توقع رکھتے
ہیں، تو وہ اسی طرح کبوتروں کی تبدیل نوع اور اس قسم کے دوسرے مصنوعی نسلی تغیرات کا
بڑے غور و فکر سے تجربہ کرتے رہیں۔ ان کا مرد کار کوئی خلوت گزیں مشتغل مزاج فلسفی نہیں
ہے بلکہ سر جان سبرائٹ جیسا ماہر افزائش نسل ہے جو کبوتروں کی نسبت یہ کہا کرتا
تھا کہ تین برس میں جس طرح کا پر چاہو پیدا کر دوں گا اور سر اور چونچ کے لئے چھ برس کا
زمانہ درکار ہوگا"۔ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ یہ نیا خیال اس پرانے خیال سے بہتر ہے،
اور اس کے متعلق کچھ کہنا میرا کام بھی نہیں ہے، میں صرف اس قدر دلنشین کرنا
چاہتا ہوں کہ ہمارا نہایت بلند خیال سائنس بھی کس درجہ واقعات نفس الامری پر
مبنی ہو گیا ہے اور یہ واقعات اول نظر میں کیسے خفیف معلوم ہوتے ہیں۔ چونکہ
یہ مقصد مثالوں کے سوا اور طرح پر ذہن نشین نہیں ہو سکتا تھا اس لئے میں نے
مثالوں سے کام لیا۔

انگریزوں کے نقل وطن کی عادت کی وجہ سے جو نئی عادتیں برابر پیدا ہوتی جا رہی
ہیں ان میں عامیانہ انداز طبیعت اور بھی سخت ہوتا جا رہا ہے۔ قدیم انگریزوں
کی طبیعت کے برعکس اہل امریکہ اور نو آبادی والوں کی طبیعتوں میں ایک طرح کی
ظاہر پرستی پائی جاتی ہے، ان کا میلان یہ رہتا ہے کہ "واقعات یہ اور یہ ہیں،
اس سے بحث نہیں کہ ان کی نسبت لوگوں کے خیالات اور گمان کیا ہیں" خانہ جنگی
کے قبل انگریز عادتاً یہ کہا کرتے تھے کہ اہل امریکہ "قادر مطلق ڈالر کی پرستش کرتے
ہیں لیکن اب انگریزوں کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ امریکہ والے دل پر رکھ لیں تو پھر وہ
روپیہ کو بالکل ٹھیکری سمجھتے ہیں، مگر اس خیال سے انگریزوں کا جو مقصود تھا وہ
نصف صحیح ہے یعنے اہل امریکہ مرئی قیمت یعنے بدیہی ناقابل انکار اور موثر نتیجہ کی

پرستش کرتے ہیں۔ آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ میں بھی یہی انداز سب پر غالب ہے۔ طبیعت کا انداز لق ودق بیابانوں میں جدوجہد کرنے سے نشو ونما پاتا ہے طبعی دشواریاں ابتدائی جماعتوں کی دشمن ہیں اور ان دشواریوں سے مسلسل پشتہا پشت تک جنگ آزمائی کرتے رہنے سے طبیعتوں پر واقعیت کا رنگ چڑھ جاتا ہے، انگریزوں کو یہ رنگ بہت تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ ایک قدیمی اور پیچ در پیچ سوسائٹی کے مخفی خوف اور نیم خیالی خطرات کے عادی ہو گئے ہیں "نئے انگلستان" دنیا کے تمام عرض وطول میں جہاں کہیں بھی واقع ہیں وہ (گستاخی معاف) "قدیم" انگلستان کے مقابلہ میں بالکل "سادہ دل" ہیں۔

اس لئے جب کسی نو آباد دنیا کی نئی قوم کو حکومت کا انتخاب پیش آوے گا تو وہ بالضرور ایسی ہی حکومت کا انتخاب کریگی جس میں تمام ادارات کے مفاد بدیہی ظاہر ہوں۔ ملکۂ انگلستان کی پراسرار رازداری اور شہزادہ ولیعہد کی خوش گذران بے عملی پر اہل امریکہ جس طرح خندہ زیر لب رہتے ہیں اس پر انگریزوں کی نگاہ پڑ ہی جاتی ہے۔ فی الحقیقت ان کی عامیانہ طبیعت کو اس امر کا یقین دلانا غیر ممکن ہے کہ آئینی بادشاہی ایک عاقلانہ حکومت ہے، اور یہ بادشاہی ایسی ہے کہ ایک نئے زمانے اور ایک غیر متفرق ملک میں جو لوگ از سر نو حکومت کا آغاز کرنا چاہتے ہوں وہ اس سے کام لے سکتے ہیں۔ یہ بادشاہزادے جو نیک ارادوں کے ساتھ مگر کاروباری معاملات سے بالکل ناواقف دنیا میں گھومتے پھرتے ہیں وہ اہل امریکہ کے نزدیک ایسے چلتے پھرتے اشتہارات ہیں جن سے یہ اعلان ہوتا ہے کہ یہ نوع حکومت اپنے حدود و تعریفات میں یورپی اور اپنی اصلیت میں دور متوسط کی حکومت ہے، اور یہ شاہی اگرچہ قدیم سلطنتوں میں ابھی بہت کچھ کارہائے نمایاں کرنے والی ہے مگر نئی سلطنتوں میں اس کے لئے کوئی جگہ یا اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ بعض نقادوں کے نزدیک انیسویں صدی کے ادبیات کے ایک نمایاں جزو کی سب سے بڑی خصوصیت ایک "حقیقت بے رحمانہ" ہے اور یہی خصوصیت سیاسیات میں بھی پائی جاتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس صدی کے تمام تخلیقات کا وصف یہ ہونا چاہئے کہ ان کا مفاد

صاف نظر آتا ہو۔

پس اس خطبہ کے بحث میں نہایت گہری دلچسپی موجود ہے، اگر پارلیمنٹی حکومت کے لئے موروثی بادشاہی لازمی ہوتی تو ہم بہت کچھ اس حکومت سے مایوس و برگشتہ ہو چکے ہوتے مگر صحیح تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ شاہی لازمی و لابدی نہیں ہے، بلکہ بدرجۂ اوسط یہ شاہی کچھ ایسی زیادہ سود مند بھی نہیں ہے اور اگرچہ ایک بلند ہمت و باہوش بادشاہ جو اپنے منصب عالی کی اہلیت رکھتا ہو ہمیشہ سود مند اور نادر مواقع پر بے بہا ہوتا ہے مگر بادشاہ خلقتاً جیسے ہوتے ہیں ایسے عام بادشاہ مشکل و نازک مواقع پر کسی مصرف کے نہیں ہوتے اور معاملات کی عام رفتار میں ان کی مدد نہ کچھ ایسی مفید ہوتی ہے اور نہ اس کی ضرورت ہوتی ہے وہ کچھ کام نہیں کریں گے اور انھیں کچھ کام کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ ایک نئے ملک کو لامحالہ اختیارات کی اس مہلک تقسیم میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، جو صدارتی حکومت کا لازمہ ہے۔ اگر دوسرے حالات مساعد ہوں تو یہ ہوسکتا ہے کہ وہ پارلیمنٹی حکومت کی غیر شاہی شکل کے تحت میں انگریزی نظام سلطنت کی سی بنی بنائی، موزوں اور اسی کے ہم شکل شاہی قائم کرلے۔

باب (۸)

کابینی حکومت کے شرائط ضروریہ اور انگلستان میں ان کی ممتاز ہیئت مخصوصہ

کابینی حکومت ایک نادر و نایاب حکومت ہے، کیونکہ اس کے شرائط ضروریہ بہت کثیر ہیں۔ اس حکومت کے لئے متعدد قومی خصائص کے ایک ساتھ موجود ہونے کی ضرورت ہے، مگر دنیا میں ایسا ہوتا کم ہے کہ یہ سب خصائص ایک ساتھ پائے جاتے ہوں اور یہ ضروری ہے کہ ان شرائط پر جس توضیح کے ساتھ نظر

ڈالی جاتی ہے اس سے زیادہ توضیح کے ساتھ اُن پر نظر کیجائے خیال یہ کیا جاتا ہے کہ
ضرورت بس اتنی ہی ہے کہ (قوم میں) کچھ ذہنی قابلیت اور چند سادی خوبیاں
موجود ہوں۔ ذہنی و اخلاقی صفات بیشک ضروری ہیں مگر ان کے سوا اور بھی
بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے۔ کابینی حکومت ایک مجلسی حکومت ہے
جس کا انتخاب مجلس وضع قوانین کی طرف سے ہوتا ہے، پس اس کے لئے "دُہری"
شرائط قائم ہیں۔ اول تو وہ شرائط ہیں جو تمام انتخابی حکومت کے لئے من حیثیت الحکومت
لازمی ہیں، اور دوسرے وہ جو خاص اس انتخابی حکومت کے لئے درکار ہیں، پس
اول "جنس" کے شرائط ضروریہ ہیں اور اس کے بعد "نوع" کے شرائط مزید ہیں۔

انتخابی حکومت کی اولین شرط انتخاب کنندوں کا "اعتماد باہمی"
ہے۔ انگلستان کے لوگ انتخابی وزراکی حکمرانی کے اس درجہ عادی ہو گئے ہیں کہ
انھوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ساری دنیا اُسے قبول کر لینے کے لئے آمادہ ہے۔
انگریزوں میں علم و تہذیب نے کم از کم اتنی ترقی کر لی ہے کہ وہ بغیر کسی مزید ارادہ
کے از خود اس امر کے روادار ہو جاتے ہیں کہ چند مخصوص اشخاص ان کے حکمرانوں کا
انتخاب کر دیں۔ ان کے نزدیک یہ کام دنیا میں سب سے زیادہ سہل و سادہ
کام ہے مگر حقیقت میں یہ ایک نہایت ہی نازک و اہم کام ہے۔

نیم وحشی قوموں کے خاص علامات، ان کی تمام بے اعتمادی اور
لغو و مہمل تشکوک و شبہات ہیں نہایت ہی مفید مقصد اوقات و مقامات
کے سوا اور ہر حال میں لوگ انھیں جگھوں میں جمے رہتے ہیں جہاں وہ پیدا ہوئے
تھے، اُن کے دماغوں میں انھیں جگھوں کے مختص خیالات بسے ہوتے ہیں،
اور ان خیالات کے سوا کسی دوسرے خیال کے وہ متحمل نہیں ہو سکتے۔ پاس
کے قصبے تک کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اس کے باشندوں کے طور طریق
مختلف ہوتے ہیں اور یہ فرق اگرچہ بالکل غیر مرئی سا ہوتا ہے مگر ہوتا ضرور
ہے اُن کا لب و لہجہ مختلف ہوتا ہے، وہ چند خاص الفاظ استعمال کرتے ہیں
ان قدیم روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عقیدہ مشتبہ
ہے۔ پس اگر دوسرے قصبہ کی نسبت خفیف سا شک ہوتا ہے تو دوسرے

ضلع کے متعلق بہت کچھ شک ہوتا ہے۔ یہیں سے قطعی طور پر نئے اصول، نئے خیالات اور نئے طریقوں کا آغاز ہوتا ہے۔ از یادر رفتہ زمانہ کی حد فاصل سے ہی ایک عجیب و غریب دنیا محسوس ہونے لگتی ہے۔ اگر پاس کا ملا ہوا ضلع مشتبہ ہے تو دور افتادہ ضلع تو ہر طرح ناقابل اعتماد ہے۔ لوگ یہ جانتے ہیں کہ "وہاں سے بے خان و ماں آوارہ گرد آتے ہیں" اس کے سوا وہ اور کچھ نہیں جانتے۔ شمال کے رہنے والوں کی مقامی زبان جنوب کے رہنے والوں کی مقامی زبان سے مغائر ہوتی ہے۔ ان کے قوانین دوسرے ہیں، ان کا طبقہ امرا دوسرا ہے، ان کی زندگی دوسری ہے۔ جن زمانوں میں دور افتادہ اقطاع ملک کا کوئی نشان تک لوح دل پر نہیں ہوتا ہے جب صرف ہمسائگی کا احساس اور مقامیت کا جوش دلوں میں ہوتا ہے، اس وقت بعید الوقوع مقامات کے درمیان ادنی سے ادنی معاملات پر بھی متفقہ اتحاد عمل ناممکن ہوتا ہے، کوئی بھی دوسرے کی خوش اعتقادی، خوش فہمی اور اصابت رائے پر کافی اعتماد نہیں کرتا، نہ وہ علی اقدر حاجت دوسرے کے ساتھ اتفاق رائے کرتا ہے۔

پس اگر خفیف و جزوی معاملات میں اس قسم کے اتحاد عمل کی توقع نہیں ہو سکتی تو حکومت کے اہم ترین معاملہ یعنے عاملانہ حکمراں کے انتخاب میں کب ایسا ہو سکتا ہے، اس کا تو وہم بھی ذہن میں نہیں آتا۔ یہ خیال ہی محال ہے کہ ملک کے حاکم اعلیٰ کے انتخاب کے لئے تیرھویں صدی میں نارتھمبر لینڈ، سمرسٹ شائر کے ساتھ اتفاق کرنے پر رضامند ہو جاتا، حاکم اعلیٰ کا انتخاب تو درکنار ایک جلاد کے تقرر پر بھی ان کا متفق ہونا دشوار تھا۔ اس وقت تک یہ حالت ہے کہ اگر صاف لفظوں میں یہ کہدیا جائے کہ وہ حاکم اعلیٰ کا انتخاب کر رہے ہیں، تو دونوں میں کوئی صوبہ بھی اسے پسند نہ کرے گا (انگلستان میں) کسی صوبے میں انتخاب کے موقع پر کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ "اس موجودہ جلسہ کی غرض یہ ہے کہ ہم (باصطلاح اہل امریکہ) اس "حلقۂ انتخابی" کے لئے اپنے وکیل کا انتخاب کریں جس میں ہمارے حاکم اعلیٰ کی نامزدگی ہوگی

جو ہمارے لئے بمنزلہ رئیس جمہوریہ کے ہے" اس صوبے کے نمائندے دوسرے ضلعوں، شہروں اور قصبوں کے نمائندوں کے ساتھ ملکر ہمارے حکمرانوں کے انتخاب کی کارروائی عمل میں لاویں گے"۔ اس طرح کی صاف صاف باتیں قدیم زمانہ میں تو بالکل ناممکن تھیں، خود اس زمانہ میں بھی بہت ہی عجیب و غریب سمجھی جائیں گی۔ خوش قسمتی سے اس انتخاب کی کارروائی اس درجہ بالواسطہ و پنہاں ہوتی ہے اور اس کارروائی کا عملدرآمد ایسی آہستگی و پوشیدگی کے ساتھ ہوتا ہے کہ انگریزوں کو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ ایک دوسرے پر کس قدر وسیع سیاسی اعتماد کر رہے ہیں۔ جو لوگ بڑے سے بڑا تجارتی اعتبار کرتے ہیں ان کی نظر میں ان کا یہ فعل بالکل طبعی، سہل و واضح معلوم ہوتا ہے وہ اس کے متعلق نہ بحث و حجت کرتے ہیں اور نہ کچھ سوچتے ہیں، سیاسی اعتماد کا بھی بالکل یہی حال ہے، ہم اپنے اہل ملک پر اعتماد کرتے ہیں اور اس کا خیال تک دل میں نہیں لاتے کہ ہم ان پر اعتماد کر رہے ہیں۔

انتخابی حکومت کی ایک دوسری نہایت ہی مفید المثال شرط، پرسکون قومی طبیعت کا ہونا ہے یعنے قوم کی طبیعت میں اتنی پختگی ہو کہ عیاں و بدیہی انقلابات کے لئے جس جوش و خروش کا برپا ہونا لازمی ہے وہ اس کی متحمل ہو سکے۔ کسی وحشی یا نیم مہذب قوم میں یہ وصف کبھی پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔ انگلستان میں غیر تعلیم یافتہ اشخاص کے جم غفیر سے اس وقت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ "جاؤ اپنے حکمرانوں کا انتخاب کرو" اگر ایسا کیا جائے تو وہ بالکل حواس باختہ ہو جائیں گے۔ ان کا واہمہ طرح طرح کے بے اصل خطرات پیدا کر دیگا، اور انتخاب کے وقت کی کوششوں کا انجام کسی جبری غصب پر ہو گا۔ ایک آزاد سلطنت میں مقدس ادارات کا انتہائی فائدہ یہ ہے کہ وہ اس قسم کے تصادم کو روکتے ہیں۔ انگلستان میں حکمرانوں کے انتخاب کا جوش و خروش اس وجہ سے دب جاتا ہے کہ بظاہر ایک غیر منتخب حکمراں موجود ہے۔ اس جوش و خروش سے نسبتاً غریب و جاہل طبقہ سب سے زیادہ متاثر اور سب سے زیادہ گمراہ ہو جاتا گروہ واقعتاً یہ یقین رکھتا ہے کہ حکمراں ملکہ ہے "آپ صاحب تخت و تاج" اور

"حقیقی کارفرما" کا دقیق فرق انھیں نہیں سمجھا سکتے۔ اس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے جن الفاظ کی ضرورت ہے وہ ان کی مقامی زبان میں موجود نہیں ہیں، نہ ان کے دماغوں میں وہ خیالات موجود ہیں جو اس مفہوم کے کماینبغی سمجھنے کے لئے درکار ہیں۔ منصب اعلیٰ سے اختیار اعلیٰ کا جدا کر لینا یہ ایک ایسا نازک مسئلہ ہے کہ عوام الناس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ ان کے ذہن میں تو یہ خیال بسا ہوا ہے کہ ایک موروثی ملکہ جسے خدا نے اپنی رحمت سے ملکہ بنایا ہے، ان پر حکمراں ہے، حالانکہ فی الاصل کابینہ و پارلیمنٹ ان پر حکمراں ہیں اور یہ انھیں کے ایسے لوگ ہیں اور خود انھیں نے ان کا انتخاب کیا ہے۔ اس علانیہ عظمت و رفعت سے احترام کا خیال پیدا ہوتا ہے اور دوسرے اشخاص جو اکثر نہایت بے وقار ہوتے ہیں اس سے فائدہ اٹھا کر خود حکمراں بن جاتے ہیں۔

انتخابی حکومت کی تیسری، و آخری شرط کو میں "تعقل" کہنا چاہتا ہوں اس سے میری مراد اس ملکہ سے ہے جس میں ذہانت داخل ہے مگر پھر بھی یہ ملکہ ذہانت سے مختلف ہے۔ ایک پوری قوم جو اپنے حکمرانوں کا انتخاب کرتی ہو اسے اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ بعید الوقوع امور کی نسبت ایک صاف خیال قائم کر سکے۔ "ظل اللہیت" کا جو ہالہ بادشاہ کے گرد کھنچا ہوتا ہے اس کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بادشاہ کی نسبت کوئی مستقل خیال قائم کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ آپ کا گمان یہ ہوتا ہے کہ آپ کا قبلۂ وفا جس طرح ظاہری حیثیت میں آپ سے اتنا ارفع و اعلیٰ ہے اسی طرح باطنی فطرت میں بھی آپ سے بے حد برتر و فائق ہے۔ آپ اپنے تصور میں اسے ویسا ہی سزاوار ستائش سمجھتے ہیں جیسا کسی وقت میں لوگ اصولاً و عقیدۃً اسے قابل پرستش سمجھتے تھے۔ یہ فریب وہ خیال ہی نوع انسان کے لئے بے انتہا فوائد کا موجب بنا رہا ہے اور اب بھی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ خیال لوگوں کو ان کے حکمرانوں کے انتخاب سے روک دیتا ہے۔ ایک شخص جو کل تک ویسا ہی تھا جیسے آپ خود ہیں اور کل پھر ویسا ہی ہو جائے گا جیسا تھا، اور اس وقت جو کچھ ہے وہ آپ ہی کا بنایا ہوا ہے

آپ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اس شخص کی نسبت ایسا ہی خیال پیدا کر دیں (جیسا بادشاہ کے متعلق ہوتا ہے) لیکن اس وہم پرستی سے اگرچہ حکمرانوں کا انتخاب رک جاتا ہے تاہم اسی سے غیر منتخب شدہ حکمرانوں کی موجودگی کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ غیر تعلیم یافتہ انگریزوں کے ذہن میں یہ خیال جما ہوا ہے کہ ان کا بادشاہ جس کے سر پر متبرک تاج رکھا گیا ہے، جس کے سر پر ریمز کا بنا ہوا تیل لگایا گیا ہے، جس کا سلسلۂ نسب خاندان پلینٹیجنٹ سے ملتا ہے، وہ اُن لوگوں سے ایک مختلف ہی نوعیت کا شخص ہے جو نہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، نہ ان کے سر پر تاج رکھا گیا ہے اور نہ تیل لگایا گیا ہے۔ ان کا یقین یہ ہے کہ (دنیا میں) ایک ہی شخص ایسا ہے جس کی اطاعت غیبی حق کے بموجب ان پر عائد ہوتی ہے، اور اس لئے وہ اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ کسی علانیہ منتخب شدہ حکمراں کا صاف وصریح قاعدہ صرف اسی وقت ممکن العمل ہوگا جب دنیا وسیع تر ہو جائے گی، اس کا تجربہ بڑھ جائے گا، اور اس کے حالات زیادہ پرسکون ہو جائیں گے۔

یہ شرائط انتخابی حکومت کے لئے سخت ضیق پیدا کر دیتے ہیں مگر کابینی حکومت کے شرائط ضروریہ اور بھی الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتے ہیں۔ اس حکومت کے لئے صرف متذکرۂ بالا شرائط ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ایک آئینی مجلس وضع قوانین کا ہونا بھی ضروریات میں داخل ہے یہ مجلس ایسی ہونا چاہئے جو نظم ونسق ملک کے لئے ایک معقول جماعت کے منتخب کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔

لیکن اہلیت رکھنے والی مجلس وضع قوانین بہت ہی نایاب شئے ہے۔ انگریزوں کی نظر میں اگرچہ ہر ایک مستقل جماعت مقننہ یعنے توضیع وترمیم قوانین کی ہر ایک جماعت ایک بہت ہی طبعی شئے معلوم ہوتی ہے مگر یہ امر عام بنی نوع انسان کے پشتہا پشت کے جمے ہوئے خیالات کے بالکل مغائر ہے۔ اقوام عالم کی بہت بڑی تعداد کا اپنے قوانین کی نسبت یا تو یہ خیال ہے کہ یہ قوانین خدا کے عطا کردہ اور اس لئے ناقابل ترمیم ہیں، یا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ

یہ قوانین ان عادات راسخہ میں سے ہیں جو سلف سے خلف کی طرف منتقل ہوتے آئے ہیں۔ الحال انگریزی پارلیمنٹ کا اہم واخص فرض وضع قوانین ہے، مگر ایک وقت ایسا بھی تھا کہ یہ حالت مطلق نہ تھی، بلکہ پارلیمنٹ ایک طرح کی محافظ جماعت تھی۔ ملک کے رواج یعنے اس قدیمی منتقل شدہ قانون میں جو ججوں کے سینہ میں محفوظ تھا، پارلیمنٹ کی رضامندی کے بغیر ترمیم نہیں ہو سکتی تھی، اور ہر شخص کو یہ اطمینان واعتماد تھا کہ بغیر خاص شدید اور غیر معمولی حالات کے کسی حالت میں بھی اس میں تغیر نہو گا۔ قانون کے ترمیم کرنے کے متعلق پارلیمنٹ کے کام کی قدر وقیمت اس سے نصف بھی نہیں تھی جتنی قوانین کی تبدیلی کے روکنے کے متعلق تھی۔ پارلیمنٹ کا حقیقی فائدہ بھی یہی تھا۔ قدیمی نظم معاشرت میں قانون کا معین ومشخص ہونا قانون کے اچھے ہونے کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ اہم وقابل لحاظ تھا۔ دور جہالت کے لوگ جو قانون ہی بناتے اس میں بہت سے ناقص خیالات کا شامل ہو جانا اور اس سے بہت سی خرابیوں کا منتج ہونا یقینی تھا کسی غیر متمدن تکلیف دہ اور محدود معاشرت میں قوانین کے کمل ہونے کی توقع نہیں کیجا سکتی اور فی الحقیقت اس کی کچھ زیادہ ضرورت بھی نہیں ہے، مگر اس زمانہ میں تعین وتشخص کی خواہش بڑھی ہوی ہوتی ہے۔ ایک نیم وحشی قوم کی اولیں آرزو اور اس کا بزرگ ترین مفاد یہی ہے کہ لوگ اپنی محنت کے پھل سے نفع اُٹھائیں، ملکیت کا قانون ہر شخص کو معلوم ہو، ازدواج کا قانون ہر شخص جانتا ہو، اور زندگی کے تمام مراحل کے لئے ایک معین طریقہ مقرر ہو۔ اس زمانہ میں لوگ یہ نہیں چاہتے کہ ان کے قوانین کی تدوین حسب حال ہو جائے بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ قوانین مضبوط ومستحکم رہیں۔ جذبات اس قدر قوی ہوتے، اظہار قوت کا شوق اس قدر بڑھا ہوا اور معاشری ربط اس قدر کمزور ہوتا ہے کہ نظم معاشرت کے برقرار رکھنے کے لئے قوانین کا ایسی مقدس ومتبرک صورت میں دکھانا لازم ہو جاتا ہے جس میں سب کچھ ہو مگر ترمیم نہ ہو سکے۔ انسانی نظم معاشرت کے ابتدائی

مدارج میں تغیر کسی قسم کا ہو برا سمجھا جاتا ہے اور اکثر تغیرات ہوتے بھی نہیں۔ ایسے ہی حالات زندگانی اس قدر سادے اور اس قدر غیر مبدل ہوتے ہیں کہ قواعد اگر صاف و واضح ہوں اور لوگ ان سے واقف ہوں تو بس وہ کافی ہیں۔ مطلق العنانی کے متعلق پہلی روک رسم و رواج کی ہے۔ معاشری زندگی کا وہ معینہ و مقررہ دور عمل جس پر زمانۂ حال کے نئے طور و طریق والے ناک بھوں چڑھاتے ہیں، اور جو جدید ترقی کے راستہ میں سد راہ سمجھے جاتے ہیں وہی دور عمل ازمنہ قدیمہ میں بیہمی طاقت کے لئے سب سے مقدم روک کا کام دیتا تھا۔ اس زمانہ میں سیاسی خوبی کار کے تصور کا پوری طرح آغاز بھی نہیں ہوا ہوتا، تجریدی انصاف کا خیال مبہم و کمزور سا ہوتا ہے، اور اس غیر متفرد غیر مخرب اور غیر منقطع زندگی کے لئے سینہ بسینہ رسم و رواج کے ایک معینہ طور و طریق کی ضرورت لازمی ہوتی ہے۔

ایسے زمانہ میں کوئی مجلس وضع قوانین جو علی التسلسل اجلاس کرتی، ہمیشہ نئے نئے قوانین بناتی اور پرانے قوانین کی تنسیخ کرتی رہتی ہو، وہ ایک بے جوڑ اور پریشان کن شئے معلوم ہوگی مگر دنیا کے متمدن حصہ کی موجودہ حالت کے اعتبار سے یہ دشواریاں زمانۂ ماضی کی باتیں ہو چکی ہیں۔ مہذب اقوام میں یہ خواہش پھیلتی جاتی ہے کہ قوانین حسب ضرورت زمانہ وضع ہوتے رہیں، دنیا میں روز بروز جس قسم کی نئی ضرورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں انھیں کے موافق موروثی قوانین بھی بدلتے رہیں۔ اب یہ خیال متروک ہو گیا ہے کہ چونکہ کسی نہ کسی قانون کا قائم رہنا ضروری ہے اس لئے اچھا یا برا جو قانون بھی ہو اسی کو قائم رکھنا چاہئے۔ تمدن اب اس قدر تنومند ہو گیا ہے کہ وہ قانونی ترقیات کے نشتر کی برداشت کر سکتا ہے، مگر عام تاریخ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ کابینیات کی یہ قلت زیادہ تر دائمی مجالس وضع قوانین کی قلت مزید کے باعث واقع ہوتی ہے۔

لیکن اس کے سوا اور اسباب بھی ایسے ہیں، جن سے اس موجودہ زمانہ میں بھی کابینی حکومت کا رقبہ محدود ہو گیا ہے۔ محض مجلس وضع قوانین کا

وجود ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس مجلس میں اہلیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یعنے وہ ایسی مجلس ہو جو ایک کارگزار جماعت عاملانہ کا انتخاب کرنے اور اسے برقرار رکھنے پر آمادہ ہو اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ ہمیں اس دردسر کی حاجت نہیں ہے کہ ہم اس نازک و پیچ در پیچ تنظیم پر غور کریں جو فی الحال دارالعوام میں کسی قدر موجود ہے اور دارالعوام کی آئندہ اصلاح و ترقی کے تجاویز میں اسے اور شرح و بسط کے ساتھ پھیلایا گیا ہے۔ اس وقت ہمیں فضل و کمال سے بحث نہیں ہے بلکہ ہم صرف معمولی موزونیت اور بقدر حاجت اہلیت کے خواہاں ہیں۔

موزونیت کے شرائط دو ہیں، پہلے آپ ایک عمدہ مجلس وضع قوانین مہیا کریں، اور پھر اسے اسی عمدگی کی حالت میں قائم رکھیں۔ ان دونوں باتوں کے اندر پہلی نظر میں جیسا قریبی تعلق معلوم ہوتا ہے واقعہ میں ایسا تعلق ہے نہیں کیسی مجلس وضع قوانین کو ایسی حالت میں رکھنے کے لئے ضرور ہے کہ اس کے پاس حقیقی کاموں کی کافی مقدار موجود ہو۔ اگر آپ بہترین افراد کی ایک جماعت کو کسی ایسے کام کی انجام دہی پر لگا دیں جو بمنزلہ نفی کے ہو تو وہ اس بے حقیقت شئے کے لئے باہم دیگر تنازعہ کرنے لگیں گے۔ جہاں پر اہم مسائل کا خاتمہ ہوتا ہے وہیں سے چھوٹے چھوٹے فرقوں کا آغاز ہوتا ہے، اور جب خوش گزران قوم میں محض چند نئے قوانین کے بنانے اور پرانے خراب قوانین میں کچھ یوں ہی سی ترمیم کرنے کی ضرورت ہو اور حل طلب خارجی معاملات بھی سیدھے سادے ہوں، وہاں کسی مجلس وضع قوانین کو کام میں مشغول رکھنا نہایت دشوار ہے۔ اس مجلس کے لئے نہ کوئی امر قانونی صورت میں لانے کے لئے ہے اور نہ کوئی امر طے کرنے کا ہے۔ لامحالہ نہایت ہی قوی خطرہ یہ لگا رہتا ہے کہ مجلس وضع قوانین، اور دوسری قسم کے تمام کاموں سے محروم ہو کر اپنے انتخابی کام کے متعلق مناقشات برپا کرنے لگے گی، اس کا تمام وقت وزارت کے مباحث اختلافی میں صرف ہو جائے گا اور پھر بھی اس صرف وقت سے ضرر ہی ضرر متصور ہوگا۔ کابینی حکومت کا جو منا سب نتیجہ

ہونا چاہیئے یعنے چند اشخاص کی ایک معقول جماعت کا اتنی مدت تک برسر اقتدار
رہنا کہ وہ اپنی کارگزاری کا نتیجہ دیکھ سکیں، یہاں یہ نہ ہوگا بلکہ علی التواتر کمزور
نظم ونسق قائم ہوتے رہیں گے جو نہ حکمرانی کر سکیں گے اور نہ وہ اس کے لئے
موزوں ہوں گے۔ یہ ضرور ہے کہ باضابطہ طور پر یہ معین نہیں ہو سکتا کہ ایک
پارلیمنٹ جیسے حکام عاملانہ کا انتخاب کرنا ہو اس کے لئے غیر انتخابی کام کس قدر
درکار ہوگا۔ نظریہ سیاسی میں اس کے متعلق کوئی تعداد یا کسی قسم کے شمار و اعداد موجود
نہیں ہیں تاہم بس اتنا کہہ سکتے ہیں کہ کوئی پارلیمنٹ جس کے پاس کام کم ہو
اور وہ اس پارلیمنٹ کے برابر کارآمد بننا چاہے جس کے پاس کام زیادہ
ہو تو اس کے لئے لازمی ہے کہ وہ دیگر اوصاف میں موخرالذکر پارلیمنٹ سے
بہتر ہو، اہم معاملات کے مستقل دباؤ پڑتے رہنے سے ایک بے پروا پارلیمنٹ
میں بھی بہت کچھ ترقی ہو جائے گی، لیکن جس پارلیمنٹ کے پاس اس قسم کے
مشاغل ہی نہ ہوں اس کے لئے لازمی ہے وہ اپنے اوصاف باطنی کے اعتبار سے
اعلیٰ منزلت پر ہو ورنہ وہ بالکلیہ ناکام ہو جائے گی۔

لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ ایک اچھی مجلس وضع قوانین کے قائم و برقرار
رکھنے کی دشواری اس قسم کی مجلس کے اول بار قائم کرنے کی دشواری کے مقابلہ
میں دوسرے درجہ پر ہے۔ جو قومیں کسی اچھی پارلیمنٹ کا انتخاب کر سکتی ہیں
ان کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم ان قوموں کی ہے جن میں عامۃ الناس ذہین و زیرک
ہوں اور آرام و آسائش کے ساتھ بسر کرتے ہوں، جہاں کسی قسم کی حقیقی غربت
نہ ہو، جہاں تعلیم ہر طرف شائع اور سیاسی فہم و سیاست عام ہو وہاں عام اشخاص
کے لئے کسی معقول مجلس وضع قوانین کا انتخاب آسان ہے۔ اس خیال کی سرسری
تصدیق انگلستان کی شمالی امریکہ کی نوآبادیوں اور اتحاد امریکہ کی آزاد ریاستوں
کے حالات سے ہو جاتی ہے۔ ان ممالک میں وہ شئے جسے حقیقی غربت کہہ سکیں
نہیں پائی جاتی۔ انگلستان کے غربا جن آسائشوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے
امریکہ میں وہ آسائشیں صحت افزا حرفت کے ذریعہ سے بسہولت میسر آجاتی
ہیں، تعلیم بہت شائع ہے اور تیزی کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ پرانی دنیا

کے ناخواندہ تارکان وطن اکثر ان ذہنی فوائد کو جن سے وہ خود محروم ہیں ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہیں، اور جس جگہ ابتدائی تعلیم و تربیت اس درجہ عام ہے وہاں وہ اپنی پستی حالت سے منغض و کبیدہ ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی نئی قوموں کے لئے بالعموم سب سے بڑی مشکل جغرافی مشکل ہوتی ہے۔ آبادی زیادہ منتشر ہوتی ہے، اور جہاں آبادی منتشر ہوتی ہے وہاں بحث و مباحثہ دشوار ہوتا ہے، مگر ممالک یورپ کے ایسے بڑے ملکوں کے باشندے جن میں فی الواقع ذہانت، تعلیم اور خوش گزرانی موجود ہو، وہ بہت جلد ایک اچھی رائے قائم کر لیں گے۔ کسی کو اس میں شک نہیں ہوسکتا کہ نیو انگلینڈ کی ریاستوں کے باشندے اگر جداگانہ قومیت رکھتے ہوتے تو ان کی تعلیم ان کی سیاسی قابلیت اور ان کی ذہانت ایسی ہوتی کہ کسی دوسری اتنی ہی تعداد کی قوم کے حصۂ کثیر کو کبھی یہ بات نصیب نہ ہوتی۔ اس قسم کی سلطنت میں جہاں تمام قوم ایک موزوں مجلس وضع قوانین کے انتخاب کی قابلیت رکھتی ہو، وہاں یہ ممکن بلکہ آسان ہے کہ اس قسم کی ایک مجلس قائم کردی جائے۔ اگر نیو انگلینڈ کی ریاستوں کو ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے کابینی حکومت حاصل ہوتی تو وہ اپنی سیاسی زیرکی کے لئے دنیا میں اتنی ہی مشہور ہوتیں جتنی وہ آج اپنی عام خوش حالی کے لئے شہرۂ آفاق ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ ان قوموں کی بنائے ترکیبی اصول مساوات پر رکھی گئی ہے اور یہ غیر ممکن ہے کہ اس قسم کی کوئی قوم بھی سیاسی علمائے نظریات کے سخت شرائط کو تمام و کمال پورا کر سکے ہر ایک قدیمی قوم میں اس کا ابتدائی رہنما اصول مفروضہ، صداقت حقیقی سے برسر پیکار رہتا ہے۔ اصولاً تمام قوم کو ایک ہی سے سیاسی اقتدار کا حق حاصل ہے۔ لیکن یہ حق ان کو صرف اس بنا پر حاصل ہوسکتا ہے کہ سیاسیات میں ان سب کی عقل و دانش ایک سی ہو (اور عملاً ایسا ہوتا نہیں) مگر ایک زرعی نو آبادی کے آغاز کار کے وقت یہ اصول موضوعہ صداقت سے اتنا قریب ہوتا ہے کہ سیاسیات کو اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس قسم کی قوموں میں وسیع جائدادیں نہیں

ہوتیں، وافر سرمائے نہیں ہوتے، ذو رفاہت طبقات نہیں ہوتے، ہر شخص کو آسودگی و آسائش حاصل ہوتی ہے اور کوئی شخص اس سے کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ کسی جدید نوآبادی میں مساوات مصنوعی طور پر قائم نہیں کیجاتی ہے بلکہ از خود قائم ہو جاتی ہے۔ ایک قصہ یہ مشہور ہے کہ مغربی آسٹریلیا کے اولین آبادکاروں میں چند متمول آبادکار مزدوروں کو خود اپنے خرچ سے لے گئے اور انکی اپنی سواری کے لئے گاڑیاں بھی مہیا کیں مگر بہت جلد اس آزمائش کا وقت آگیا کہ آیا وہ گاڑیوں میں زندگی بسر بھی کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اس کے قبل کہ مالکوں کے مکان بن کر تیار ہوں، مزدوروں نے اپنا اپنا راستہ لیا، وہ خود اپنے اپنے مکانات بنانے اور اپنی اپنی زمینیں جوتنے بونے لگے، اور مالک تنہا گاڑیوں میں بیٹھے رہ گئے۔ مجھے اس کا تو علم نہیں کہ ٹھیک یہی صورت پیش آئی تھی یا نہیں مگر اس قسم کی باتیں ہزارہا بار وقوع پذیر ہو چکی ہیں۔ متواتر کوششیں ہوئی ہیں کہ نظم معاشرت کے جیسے مدارج انگلستان میں قائم ہیں ویسے ہی نوآبادیوں میں بھی قائم کر دئے جائیں، مگر ان کوششوں میں ہمیشہ پہلے ہی قدم میں ناکامی ہوئی ہے نیچے کے اکھڑ طبقوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ چوٹی کے نازک مزاج طبقوں کے برابر بلکہ ان سے بہتر ہیں۔ انھوں نے اپنی راہ لی، اور شرفائے معززین" کو انکی راہ پر چھوڑ گئے۔ گویا یہ شکل ایک مخروط مضلع کی ہوگئی جس کا قاعدہ تو وسیع ہوتا گیا مگر راس ٹوٹ کر اندر گر پڑا۔ کسی زرعی نوآبادی کے زمانہ میں سیاسی عمومیت ہو یا نہو، معاشری عمومیت کا ہونا لازمی ہے۔ یہ فطرت کی کارستانی ہے، اس میں آپ کا دخل نہیں ہے، مگر وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ دولت بڑھتی جاتی اور عدم مساوات کا آغاز ہو جاتا ہے۔ زید اور اس کے لڑکے جفاکش ہیں اور وہ فراغبالی حاصل کر لیتے ہیں، بکر اور اُس کے لڑکے سُست ہیں اور وہ ناکام رہتے ہیں۔ اگر صنعت و حرفت وسیع پیمانہ پر قائم ہو جاتی ہے (اور اکثر نوخیز قومیں تحفظ کے ذریعہ سے بھی اس کی کوشش کرتی ہیں) تو پھر عدم مساوات کا میلان اور تیز ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دار ایک کثیر الاملاک فرد بن جاتا ہے اور اس کے مزدور بے مایہ جم غفیر ہو جاتے ہیں

پشت ہا پشت کی تعلیم کے بعد ذہنی تربیت میں بھی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک بڑی قوم کے اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ لوگوں میں ہزار خواہ دس ہزار اعلیٰ تعلیم یافتوں کا ایک بالائی طبقہ بن جائے گا۔ اصول کا اقتضا یہ ہے کہ دولت و ذہنیت رکھنے والے اعلیٰ طبقہ کو اس کے تعدادی تناسب سے بہت زیادہ اثر حاصل ہو جائے ہر ایک دستور سلطنت میں ضرور کوئی ایسی باریک تدبیر نکالی جائے گی کہ اس طبقہ کے پاکیزہ خیالات کا اثر گرد و پیش کے بھدے خیالات پر پڑے مگر دنیا جس طرح چل رہی ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کہنا چاہیئے کہ جب تمام آبادی کو اس قدر تعلیم و ذہانت حاصل ہو جائے گی جتنی میں نے اس معاملہ میں فرض کی ہے تو پھر ہمیں اس کی نسبت زیادہ فکر کی ضرورت نہ رہے گی۔ بڑی بڑی قومیں شاذ و نادر ہی کبھی ایسا ہوا ہے کہ عارضی اوقات کے سوا اور کسی وقت بھی ان کے بلند ترین خیالات کے افراد ان پر حکمراں رہے ہوں اور اگر ہم اتنا کر سکیں کہ اُن پر معقول خیالات کے لوگوں کی حکمرانی قائم ہو سکے تو ہمیں اپنے کام سے مطمئن ہو جانے کے لئے بہت کافی ہے۔ اگرچہ جتنی خواہش تھی اتنا نہیں ہو سکا ہے پھر بھی انگریزوں نے توقع سے زیادہ اکیا ہے۔ بہر حال ایک مستند تعلیم اور عام ذہانت رکھنے والی قوم میں کابینی حکومت کے لئے مساوی الحقوق سیاسی دستور جس میں ہر شخص رائے دیتا ہو اور ہر شخص یکساں طور پر رائے دیتا ہو ایک قابل لحاظ امر ہے، اسی سے حقیقی شرط پوری ہو جاتی ہے یعنے ایک قوم ایسی موجود ہے جو پارلیمنٹ کے انتخاب کی قابلیت رکھتی ہے اور وہ پارلیمنٹ وزرا کے تقرر کی اہل ہوتی ہے۔

اب فرض کیجئے کہ عامۃ الناس میں حاکم اعلیٰ کے انتخاب کی قابلیت نہو، اور بہت ہی متنی قوموں کو چھوڑ کر تمام ہی قوموں کے حصۂ کثیر کی فی الواقع یہی حالت ہے، تو پھر اس صورت میں کابینی حکومت کیوں کر ممکن ہو گی۔ اس کا امکان صرف انھیں قوموں میں پایا جائے گا جنھیں میں "اطاعت شعار" اقوام کہنے کی جرأت کرتا ہوں۔ یہ خیال بہت عجیب معلوم ہوتا ہے مگر ایسی قومیں موجود ہیں جن کا کثیر التعداد اور نسبتاً کم عقل رکھنے والا حصہ یہ چاہتا ہے کہ

ان کا قلیل التعداد عاقل تر حصہ ان پر حکمرانی کرے۔ کثیر التعداد حصہ اس امر پر آمادہ اور اس کا خواہاں رہتا ہے کہ وہ حکمراں کے انتخاب کرنے کا اختیار اپنے میں سے چند منتخب افراد کو تفویض کردے۔ یہاں یہ بحث بیکار ہے کہ رسم و رواج کے دباؤ سے ایسا ہوتا ہے یا برضا و رغبت ایسا کیا جاتا ہے۔ غرض صرف یہ ہے کہ حصۂ کثیر اخیار قوم کے حق میں اپنے اختیار سے دست کش ہو جاتا ہے، اور یہ اخیار قوم جس شخص پر بھی اپنا اعتماد ظاہر کریں وہ اسی کی اطاعت پر رضامند ہو جاتا ہے۔ وہ قابل وغیر پابند تعلیم یافتہ افراد کی ایک قلیل جماعت کو اپنے انتخاب کنندگان ثانوی یعنے اپنی حکومت کے تقرر کرنے والے کی حیثیت سے تسلیم کرلیتا ہے۔ اس میں عالی منزلت اشخاص کی نسبت ایک طرح کا احساس وفا شعاری ہوتا ہے، اور یہ عالی منزلت اشخاص ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں اچھی حکومت کے انتخاب کی اہلیت و موزونیت پائی جاتی ہے، اور کوئی دوسرا طبقہ ان کی مخالفت نہیں کرتا۔ ایسی خوش نصیب قوم کو کابینی حکومت قائم کرنے کے لئے صریحی و بدیہی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اس کی مجلس وضع قوانین کے منتخب کرنے کے لئے بہترین افراد موجود ہوتے ہیں۔ اور اس لئے باحسن وجوہ یہ توقع کیجاسکتی ہے کہ وہ ایک اپنی مجلس وضع قوانین کا انتخاب کرے گی، اور وہ مجلس اس قابل ہو گی کہ وہ اچھے ارباب نظم و نسق کا تقرر کرے۔

انگلستان، ان اطاعت شعار ممالک کا ایک نمونہ ہے، اور جس طرح پر وہ اطاعت شعار ہے اور ہو گیا ہے، اس کا حال نہایت ہی عجیب و غریب ہے۔ اس وقت متوسط طبقات (یعنے تعلیم یافتہ طبقات کی کثرت عامہ) کو انگلستان میں مطلق العنان اقتدار حاصل ہے۔ آجکل "رائے عامہ کے معنی اس بے بال کی کھوپری والے شخص کی رائے کے ہیں جو آمنیبس میں پیچھے کی نشست پر بیٹھا ہوتا ہے"۔ اس سے مراد من حیث الطبقات، اعیانی طبقات کی رائے سے نہیں ہے، نہ اس کا مفہوم نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذب طبقات کی رائے سے ہے۔ بلکہ اس سے غرض محض معمولی درجہ کے عام تعلیم یافتہ اشخاص کی رائے سے ہے۔ اگر آپ حلقہائے انتخاب کے عام لوگوں پر نظر کریں تو

معلوم ہو جائے گا کہ ان لوگوں کو انتخاب کے معاملہ میں کچھ بہت زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی۔ اور اگر آپ بالفرض پردے کے پیچھے نظر کریں اور ان لوگوں کو دیکھیں جن کے اشارے پر یہ لوگ چل رہے ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان لوگوں کی دلچسپی اور ان کا تعلق اور بھی کم ہے۔ صاف الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ انگریزی دستور سلطنت کا مقصد صرف یہ ہے کہ قوم کے عامۃ الناس چند منتخب افراد کے فرماں پذیر ہیں اور جب آپ ان چند منتخب افراد پر نظر کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ اگرچہ پست ترین طبقہ کے نہیں ہیں اور نہ غیر معزز طبقہ سے ہیں مگر پھر بھی وہ بھلی الحس جماعت سے ہیں اور اگر دنیا کے سب لوگ ایک قطار میں کھڑے کئے جائیں تو یہ آخری اشخاص ہوں گے جنھیں ایک بڑی قوم سب پر ترجیح دے۔

حقیقت یہ ہے کہ انگریزی قوم کے عام اشخاص اپنے حکمرانوں سے زیادہ ایک اور ہی شئے کا ادب و لحاظ کرتے ہیں۔ وہ اس شئے کا ادب کرتے ہیں جسے ہم سوسائٹی (نظم معاشرت) کا نمائشی طمطراق کہتے ہیں۔ ایک خاص کیفیت ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتی رہتی ہے، وہ عالی مرتبہ لوگوں کی شان و شکوہ کا مشاہدہ کرتے ہیں، خوبصورت عورتوں کا نظارہ کرتے ہیں، دولت و کامرانی کے حیرت انگیز کرشموں کو دیکھتے ہیں اور انھیں باتوں سے وہ مرعوب ہو جاتے ہیں۔ ان کی بلند پروازیاں باقی نہیں رہتیں اور یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ جس طرز زندگانی کو وہ دیکھ رہے ہیں وہ اس کی برداشت کے قابل نہیں ہیں۔ شاہی درباروں اور امرا میں ایک بڑا وصف جلوہ آرائی کا ہے۔ اور اگرچہ فلسفیوں کو یہ اعلانیت بالکل لایعنی معلوم ہوتی ہے مگر عوام الناس پر اسی سے اقتدار قائم ہو جاتا ہے۔ درباری وہ کام کر سکتے ہیں جو دوسرے نہیں کر سکتے۔ امرا جو کچھ کرتے ہیں عام اشخاص اگر ان کی ہمسری کرنا چاہیں تو یہ ایسا ہی ہوگا کہ وہ تھیٹر میں کسی ایکٹر سے بازی لیجانے کی کوشش کریں۔ دنیا کے اس اعلیٰ طبقہ کو جب دور سے دیکھا جائے تو وہ تھیٹر کے اسٹیج (تماشہ گاہ) کے مانند معلوم ہوتا ہے جس پر ایکٹر

تماشائیوں سے بہتر چل پھر سکتے ہیں۔ یہ کھیل ہر ضلع میں ہوتا رہتا ہے۔ ہر دہقانی یہ محسوس کرتا ہے کہ میرا گھر میرے آقا کے گھر کے مانند نہیں ہے، میری زندگی میرے آقا کی زندگی کے مانند نہیں ہے، میری بیوی میرے آقا کی بیگم کے مانند نہیں ہے۔ اس تماشے کی آخری حد ملکہ ہے۔ کسی شخص کو یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ اس کا مکان دربار کا مثیل ہے یا اس کی زندگی ملکہ کی زندگی کے مانند ہے یا ملکہ کے احکام اس کے حکم کی طرح ہیں۔ انگلستان میں کچھ سحر آگیں مناظر ایسے ہیں جن کا اثر بہتوں پر پڑتا ہے، اور ان کے خیالات بالطبع ان مناظر کے تابع ہو جاتے ہیں۔ جس طرح ایک دہقانی لندن میں آکر یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایسے مصنوعات کی ایک نمائش عظیم میں آگیا ہے جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتے تھے اسی طرح انگریزی سوسائٹی (نظم معاشرت) کی ہیئت ترکیبی کی وجہ سے وہ اپنے کو ان سیاسی اشیاء کی نمائش اعظیم میں پاتا ہے جن کا نہ وہ تصور قائم کر سکتا ہے اور نہ انھیں بتا سکتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ خود اس کے اندر اس نوع کی کوئی بات نہیں ہے۔

فلسفی اس وہم پرستی پر خندہ زن ہوں گے مگر اس کے نتائج کی کوئی حد و غایت نہیں ہے۔ اس پر احترام سوسائٹی کے نظارگی سے بیشمار جاہل مرد و عورت چند برائے نام انتخاب کنندوں کی اطاعت پر مائل ہو جاتے ہیں، یہ انتخاب کنندگان، قصبات میں دس پاؤنڈ اور صوبوں میں پچاس پاؤنڈ کے لگان یا کرایہ دینے والے ہوتے ہیں، ان میں خود کوئی بات ایسی نہیں ہوتی جس کا کچھ اثر پڑے، یا جس سے کشش نگاہ یا فریب خیال کا کام لیا جائے۔ لوگوں پر جس شئے کا اثر پڑتا ہے وہ قوائے ذہنی نہیں ہے بلکہ ان قوتوں کا پیدا کردہ نتیجہ ہے اور ان نتائج میں سب سے بڑا نتیجہ سوسائٹی کا یہی حیرت انگیز نظارہ ہے جو ہمیشہ نئے نئے رنگ میں ظاہر ہوتا رہتا ہے مگر فی الواقع ہوتا ہے ایک ہی، اعراض، فنا ہو جاتے ہیں اور جوہر باقی رہ جاتا ہے، ایک نسل گزر جاتی اور دوسری اس کی قائم مقام ہو جاتی ہے گویا کچھ پرندے قفس میں بند یا کچھ جانور چڑیا گھر میں جمع ہیں کہ کچھ آتے اور

کچھ جاتے رہتے ہیں، اس کی نسبت یہ کہنا محض بربنائے تمثیل نہیں ہے کہ اس
کے اجزا کو ایک دائمی جاندار شئے کے اعضا کے مانند سمجھنا چاہئے جو اندر ہی اندر
نہایت خاموشی کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور ظاہری زندگانی کا حیرت افزا
اتمام کمال سالہا سال یکساں نظر آتا رہتا ہے۔ انگریزی قوم کے ظاہری حکمرانوں
کی مثال کسی شاندار جلوس کے سب سے زیادہ جلوہ آرا اشخاص کی سی ہے،
اژدحام عام پر انھیں اشخاص کا اثر پڑتا ہے، تماشائی انھیں کے لئے شور تحسین
بلند کرتے ہیں۔ اصل حکمراں دوسرے درجہ کی گاڑیوں میں چھپے بیٹھے رہتے
ہیں، ان کی نہ کسی کو فکر ہوتی ہے نہ انھیں کوئی پوچھتا ہے لیکن جن لوگوں
کے سامنے ان کی روشنی ماند پڑجاتی اور وہ صف نعال میں آجاتے ہیں، ان
کی اس تمام شان وشوکت میں درحقیقت غیر ارادی طور پر ان اصلی حکمرانوں ہی
کے لئے گویا اظہار فرماں پذیری ہوتا ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ اس خیالی جذبہ کی تاثیر ایک سیاسی اطمینان
کے احساس کی وجہ سے ہوتی ہے، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انگریزی قوم کے عامۃ الناس
خوش حال ہیں، ان میں طبقے کے طبقے ایسے ہیں جن کے خیال میں بھی یہ نہیں
آتا کہ اعلیٰ مدارج کے لوگ جس شئے کو آسائش کہتے ہیں وہ کیا ہے جن میں
اخلاقی ہستی کے شرائط اولیں تک نہیں پائے جاتے، اور جو اس قسم کی زندگی
نہیں بسر کرسکتے جو ایک انسان کے لئے سزاوار ہے۔ مگر ان طبقات میں سب
سے زیادہ وقف مصائب طبقات بھی اپنے مصائب و آلام کو سیاسیات کی
طرف منسوب نہیں کرتے۔ اگر کوئی سیاسی شورش انگیز ڈارسٹ شائر کے کسانوں
کے درمیان لکچر دے اور ان میں سیاسی بے اطمینانی پیدا کرنے کی کوشش
کرے تو اس مقصد کی کامیابی سے زیادہ اغلب یہی ہے کہ اینٹ پتھر سے
اس کی تواضع کی جائے گی۔ یہ ناچیز غریب شاید پارلیمنٹ کا حال تو کچھ
جانتے ہوں گے مگر کابینہ کے متعلق تو انھوں نے کچھ سنا بھی نہ ہوگا۔ وہ یہ
کہیں گے کہ "خیر جو کچھ بھی ہم سنتے ہوں مگر ملکہ بہت نیک دل ہے" "نظم معاشرت
کے خلاف خروج کرنا" ان کے نزدیک ملکہ کے خلاف خروج کرنے کے ہم معنی ہے،

کیونکہ ملکہ ہی نظم معاشرت پر حکمراں ہے، اور اس نظم کا سب سے زیادہ اثر انداز جزو جسے یہ عام مخلوق جانتی ہے وہ ملکہ ہی پر منتہی ہوتا ہے۔ انگریزی قوم کے عامۃ الناس جس طرح سیاسی حیثیت سے (اطاعت شعار) ہیں اسی طرح سیاسی اعتبار سے وہ قناعت پسند بھی ہیں۔

ایک اطاعت شعار قوم کے ادنیٰ طبقات کے لوگ ذہین و طباع نہ بھی ہوں، تو بھی کابینی حکومت کے لئے وہ قوم ہر قسم کے عمومیت پسند ممالک سے بدرجہا زیادہ موزوں ہوگی کیونکہ سیاسی فضیلت کے لئے وہ زیادہ موزوں و مناسب ہے۔ اس میں اعلیٰ ترین طبقات حکمراں ہو سکتے ہیں، اور ادنیٰ طبقات کی بہ نسبت اعلیٰ طبقات میں من حیث الطبقات سیاسی قابلیت کا زیادہ ہونا لازمی ہے۔ محنت و مشقت کی زندگی، ناکافی تعلیم، بے کیف شغل، عمر بھر ہاتھ سے زیادہ اور دماغ سے کم کام لینا، یہ سب ایسے اسباب ہیں کہ ان سے اس قدر سریع التحول مثال اس قدر قابل العمل ذہانت نہیں پیدا ہو سکتی، جس قدر فرصت کی زندگی، طولانی تعلیم و تربیت، طرح طرح کے تجربات، دماغ سے مسلسل کام لیتے رہنے اور اس طرح برابر دماغ کو ترقی دیتے رہنے سے پیدا ہو سکتی ہے جس ملک کے غربا اطاعت شعار ہوں، وہ اگرچہ سیاسی خوشحالی میں اس ملک سے بدرجہا کم ہو جس میں اطاعت شعاری کے لئے غربا موجود ہی نہوں، اس پر بھی بہترین حکومت کے لئے وہ آخر الذکر ملک سے بے انتہا زیادہ موزوں ہے۔ آپ اطاعت شعار ملک کے بہترین طبقات سے کام لے سکتے ہیں، مگر جس ملک میں ہر شخص کو یہ دماغ ہو کہ وہ کسی دوسرے سے گھٹ کر نہیں ہے وہاں آپ صرف بدترین آدمیوں سے کام لے سکتے ہیں۔

یہ صاف عیاں ہے کہ ایک اطاعت شعار قوم کی بنا قائم کرنے سے زیادہ مشکل کوئی اور کام نہیں ہو سکتا۔ عزت و وقعت ایک اور ہی شئے ہے۔ یہ وقعت اس شئے کو نہیں عطا ہوتی جس کا مفید ہونا ثابت ہو جائے بلکہ یہ وقعت اسی شئے کو عطا ہوتی ہے جس کی نسبت یہ معلوم ہو کہ وہ قدیم ہے۔ بعض قوموں میں بعض طبقات ایسے ہوتے ہیں جنھیں برضائے عام ایک طرح کی

نمایاں سیاسی ترجیح حاصل ہوتی ہے، اور یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ انھیں ہمیشہ یہ ترجیح حاصل رہی ہے، اور انھیں ایک طرح کی شان و شوکت ورثہ میں ملی ہے جس کی وجہ سے وہ اس ترجیح کے اہل معلوم ہوتے ہیں؛ لیکن ایک جدید نوآبادی میں، ایک ایسی قوم میں جہاں لیاقت کا یکساں ہونا ممکن ہو اور جہاں قابلیت و موزونیت کا کوئی موروثی اثر نہ پایا جاسکے، وہاں بظاہر اعلیٰ تعلیم و تربیت کا سیاسی احترام اسی وقت ہوسکتا ہے جب وہ مفید ثابت ہوجائے، یعنے پہلے اس کا وجود ثابت ہو پھر اس کی سیاسی قدر و قیمت مسلم ہو مگر ایسا ثبوت دینا جس سے کم زور درجہ کی تعلیم و تربیت کے لوگوں کو اطمینان ہوجائے قریب بہ محال کے ہے۔ دنیا میں آئندہ کوئی اچھا زمانہ آوے تو ممکن ہے ایسا ہوجائے گا مگر اس زمانہ میں تو اس کے ضروری مقدمات کا مہیا ہونا دشوار ہے، اگر یہ بحث زور کے ساتھ جاری ہوجائے، اگر یہ مباحثہ خوبی کے ساتھ شروع ہوجائے تو بہت مشکل ہے کہ چند تعلیم یافتہ اشخاص کی حکمرانی کے متعلق عقلی و استدلالی رضامندی حاصل ہوسکے۔ اس وقت معدودے چند افراد کی حکمرانی اس بنا پر نہیں ہے کہ انھوں نے عوام الناس کی عقل کو اپنے تابع بنا لیا ہے، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے عوام الناس کے خیالات اور ان کے عواید کو اپنے زیر اثر کر لیا ہے۔ فاصلے کی اشیا کی نسبت وہ کچھ جانتے نہیں ہیں، محض خیالات قائم کر رکھے ہیں؛ قریبی اشیا کی نسبت وہ جانتے ہیں اور اُن کے لئے رسم و رواج قرار دے لئے ہیں۔ بس یہ حکمراں انھیں خیالات اور انھیں رسم و رواج پر اثر ڈالتے ہیں۔

پس ایک اطاعت شعار قوم جس کا سواد اعظم جاہل ہو وہ اس حالت میں ہوتی ہے جسے علم ہندسہ میں "توازن غیر قائم" کہتے ہیں۔ توازن میں اگر ایک مرتبہ خلل پڑ جاتا ہے تو پھر اس کے اپنی حالت اصلی پر عود کرنے کی امید کم ہوتی ہے، بلکہ وہ اپنے مرکز اصلی سے برابر دور ہوتا جاتا ہے۔ ایک مخروطی شئے جسے معکوس کر کے سرے پر معلق کیا گیا ہو وہ غیر قائم توازن کی حالت میں ہے، آپ نے ذرا بھی اسے ہلایا اور وہ اپنی جگہ سے برابر ہٹنے لگی۔

یہاں تک کہ زمین پر گر پڑی۔ پس یہی حال ان اقوام کا ہے جن میں عامۃ الناس جاہل و اطاعت شعار ہوتے ہیں، اگر آپ نے ایک مرتبہ بھی اس جاہل طبقہ کو حکمرانی کا موقع دیدیا تو پھر ادب و احترام کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا پڑے گا۔ ان کے مجمع عام کے بے اصول مقررین تلقین کریں گے اور ان کے اخبارات بار بار یہ دہرائینگے کہ موجودہ عامۃ الناس کی حکومت معزول خاندان (یعنے طبقہ اعیان) کی حکومت سے بہتر ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ جس مسئلہ سے کسی قوم کو خود وافر دلچسپی ہو، اس کی دونوں جانب کے دلائل کو وہ سنے، عام اخبارات وہی پہلو اختیار کرتے ہیں جو مقبول ہو اور عامۃ الناس کے ہاتھ میں ان عام اخباروں کے سوا اور کوئی اخبار فی الواقع پہنچتا نہیں ہے۔ کوئی قوم خود اپنے اوپر لعنت ملامت کو کبھی نہیں سنتی۔ کوئی شخص قوم سے یہ نہ کہے گا کہ وہ قلیل التعداد تعلیم یافتہ جماعت جسے قوم نے تخت سے اتار دیا ہے وہ قوم کی موجودہ حکومت سے بہتر اور اس سے زیادہ دانشمندی کے ساتھ حکومت کرتی تھی۔ جب تک کوئی ہولناک تباہی نہ پیش آجائے اس وقت تک کوئی عمومیت اس شئے کو ہرگز واپس نہ کرے گی جو اُسے ایک مرتبہ حاصل ہوگئی ہے کیونکہ ایسا کرنا خود اپنی فرومایگی کے قبول کرنے کے مرادف ہوگا اور جب تک کوئی ایسی ہی ناقابل برداشت مصیبت نہ آپڑے قوم کو خود اس کی پستی کا یقین نہیں دلایا جا سکتا۔

باب (۹)

دستور انگلستان کی تاریخ، اور اس تاریخ کے اثرات

نتیجہ

یہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ انگریزی سیاسی دستور کے متعلق

کوئی کتاب ایسی ہوتی جس میں کہنے کے قابل کچھ باتیں کہی گئی ہوتیں[1] اور اگر کوئی قابل مصنف اس کام کو ہاتھ میں لے تو اب بھی اس کے متعلق ایک جدید ضخیم جلد تیار ہو سکتی ہے۔ اس بحث پر کبھی کسی ایسے شخص نے قلم نہیں اٹھایا ہے جو جدید ترین تحقیقات اور پختہ ترین فلسفہ کے نکات و غوامض کا جامع ہو۔ ہیلیم کی ماہرانہ تصنیف کے بعد سیاسی خیالات اور تاریخی معلومات دونوں میں بہت کچھ اضافہ ہو چکا ہے، اور اب ایک ایسی کتاب تیار ہو سکتی ہے جس میں تمام جمع شدہ واقعات کا احصا کیا جائے۔ میں یہ ادعا نہیں کرتا کہ میں اس قسم کی کتاب لکھ سکتا ہوں مگر چند نمایاں خصوصیات ایسے ہیں جنھیں ان کی سابقہ دلچسپی اور موجودہ اہمیت کے اعتبار سے مناسب طور پر یکجا جمع کیا جا سکتا ہے۔

ایک طرح کی دولت عامہ یا دولت عامہ کا تخم ایسا ہے جو ان تمام غیر متمدن قوموں میں پایا جاتا ہے جنھوں نے اب مدارج تمدن طے کر لیئے ہیں۔ ان تمام قوموں کا آغاز اس انداز خاص سے ہوتا ہے جسے میں شورائی یا تجربیاتی مطلق العنانی کہنا چاہتا ہوں۔ ازمنۂ قدیم میں پرزور قوموں کے اندر بادشاہ اس طرح مطلق العنان نہیں تھا جیسے اس زمانہ کے خود سر بادشاہ ہوتے ہیں، اس زمانہ میں بغاوت کے فرو کرنے کے لئے کوئی مستقل فوج نہیں تھی، بدولی کا پتہ

[1] اس کتاب کی پہلی اشاعت کے بعد سے متعدد قابل قدر تصانیف شائع ہوی ہیں، جن سے انگریزوں کی قدیم آئینی تاریخ کے مختلف مباحث پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس خصوص میں مسٹر اسٹبز کی تصنیف خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں "قدیم ترین زمانہ سے اڈورڈ اول کے عہد حکومت تک کی انگریزی تاریخ دستوری کے منتخب منشورات اور دیگر شواہد" جمع کیے گئے ہیں، "انگریزی سیاسی دستور کے نشو و نما" کے متعلق مسٹر فریمین کا لکچر (خطبہ) اور ان کی تاریخ فتح نارمنی (History of the Norman Conquest) میں اینگلو سیکسن نظام سلطنت کا باقابل تعریف ہے۔ مگر با ایں ہمہ اس تمام بحث پر کوئی ایسی بسیط و مستند تصنیف ہنوز تیار نہیں ہوی ہے جس کی اس جلد کے لکھتے وقت مجھے تمنا تھی، اور اب بھی اسی کی غایت آرزو ہے۔

چلانے کے لئے جاسوسی کا کوئی منضبط سلسلہ نہیں تھا، اطاعت شعارانہ زندگی کے درزوں کو ہموار کرنے کے لئے کوئی ماہر اور ہوشیار دفتری حکومت موجود نہیں تھی۔ بے شک قدیم زمانہ کے بادشاہ ایک طرح کی مذہبی قبولیت کے باعث مقدس سمجھے جاتے تھے۔ وہ فی الواقع دوسروں سے بالاتر اور جداگانہ افراد ہوتے تھے جو خدا کی طرف سے مقرر ہوتے بلکہ کہیں کہیں دیوتاؤں کی اولاد سمجھے جاتے تھے لیکن جن قوموں میں آزادی کی اہلیت ہوتی تھی ان میں یہ مذہبی سیادت کبھی مطلق العنانی کی حد کو نہیں پہنچتی تھی یہ ضرور ہے کہ کوئی قانونی حد معین نہیں تھی، بلکہ اس زمانہ کی زبان میں تو ان الفاظ کا ترجمہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ قانون کا جو مفہوم ہمارے ذہن میں ہے یعنے ایک ایسا قاعدہ جسے انسانی قوت سے نافذ کیا گیا ہو اور جس میں اسی قوت کے ذریعہ سے حسب خواہ تغیر و تبدل ہو سکتا ہو اور فی الواقع ایسا تغیر عادتاً ہوتا رہتا ہو، قانون کا یہ مفہوم ان قدیمی قوموں کے ذہن میں نہیں پیدا کیا جا سکتا تھا جو قانون کو ایک حد تک صحیفۂ ناقابل تنسیخ اور ایک حد تک الہام ربانی سمجھتی تھیں۔ قانون " بادشاہ کی زبان سے نکلتا تھا "، وہ قانون اسی طرح نافذ کیا کرتا تھا جیسے حضرت سلیمانؑ فیصلے صادر کیا کرتے تھے۔ یہ فیصلے خاص واقعات سے متعلق اور خدا کے اور خود حضرت سلیمانؑ کے اقتدار پر مبنی ہوتے تھے۔ ملہم غیبی کے لئے کسی ربانی حد تک کا مقرر کرنا ناممکن تھا، اور قانون کے لئے کوئی دوسرا ماخذ نہیں تھا، لیکن اگرچہ کوئی قانونی حد نہیں تھی مگر طبائع انسانی میں ایک لامذہبی جزو بھی ہوا کرتا ہے اور اس کے زیر کرنے کے لئے ایک عملی حد ضرور معین تھی، اس ملحدانہ جزو سے میری غرض آزاد اشخاص کی ناقابل انفکاک خود رائی سے ہے۔ وہ کبھی بھی بعینہ اسی طرح کام نہیں کریں گے جس طرح ان سے کہا جائے گا۔

ہومر نے یونان کی قدیم زمانہ کی شاہی کا جس طرح ذکر کیا ہے اور جس کا تصور ہم دوسری جگہوں کی نسبت بھی اپنے ذہن میں اچھی طرح قائم کر سکتے ہیں، اس کے ساتھ ہمیشہ دو لوازم ہوتے تھے۔ ایک تو "ذ ستیوغ"، یا

وقیع اصحاب' یا مجلس شوریٰ یا "بوٹے" (Bovhn) جس سے بادشاہ مشورہ طلب کرتا تھا، جن کے مباحث سے بادشاہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ اسے کیسا کرنا چاہئے اور کیسا نہ کرنا چاہئے۔ اس کے علاوہ ایک جلسہ "اگورا" کے نام سے تھا جسے مجلس سماعی کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے، مگر میرے خیال میں اسے مجلس تجربیاتی کہنا بہت زیادہ مناسب ہوگا۔ بادشاہ اپنی قوم کے جمع شدہ مجمع میں بظاہر اس غرض سے آتا تھا کہ وہ اپنی مرضی کا اعلان کرے مگر (اس زمانہ کے الفاظ میں) فی الواقع اس کا مقصود یہ ہوتا تھا کہ وہ "اپنا راستہ معلوم کرے"۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مقدس متبرک سمجھا جاتا تھا اور نہایت اغلب یہ ہے کہ وہ ہردلعزیز بھی ہوتا تھا، تاہم جس طرح ایک مقبول عام وزیر اعظم جوش سے بھرے ہوئے ایوان کے سامنے تقریر کرتا ہے، بادشاہ کی حالت بھی کچھ اسی قسم کی ہوتی تھی۔ اس کے اقتدار و اختیار کی ایک حد تھی، اور اس طریق سے وہ اسی حد کا پتہ چلانا چاہتا تھا، کہ آیا اس کے فرمان کی نسبت لوگ زور شور کے ساتھ احسنت مرحبا کہتے ہیں، یا صرف آہستہ آہستہ گنگناتے اور خاموشی کے ساتھ سوچتے ہیں۔

یہ نظام سلطنت اپنے وقت و مقام کے لئے اچھی ہے، مگر اس میں ایک مہلک نقص موجود ہے۔ وہ پُر احترام سلسلۂ خیالات جس پر حکومت کی بنا قائم ہے اس کی نقل و تحویل ایک قانون کے بموجب ہوتی ہے اور حکومت کے چلانے کے لئے جس قابلیت کی ضرورت ہے اس کی نقل و تحویل دوسرے قانون کے بموجب ہوتی ہے۔ عامۃ الناس اس خاندان کے بادشاہوں کی اطاعت پر ثابت قدم رہتے ہیں، جن کا سلسلۂ نسب وہ دیوتاؤں سے ملاتے ہیں، اور یہ اطاعت ابا عن جدٍ منتقل ہوتی رہتی ہے، مگر بہت جلد ایسا ہو جاتا ہے کہ یہ سلسلہ کسی بچے یا فاتر العقل یا کسی اور ایسے شخص پر منتہی ہو جاتا ہے جو کسی نہ کسی نقص کی وجہ سے حکومت کا اہل نہیں ہوتا۔ اس وقت اس قدیمی مقولہ کی صداقت ہر چہار طرف ثابت ہو جاتی ہے کہ آزادی کمزور بادشاہوں کے تحت میں سرسبز ہوتی ہے۔ اس وقت یہ مجلس سماعی

صرف گنگنانے پر اکتفا نہیں کرتی، بلکہ صاف آواز میں پوچھنے لگتی ہے۔ اس وقت پروقار مجلس اشارے پر قناعت نہیں کرتی بلکہ تعلیم دینے لگتی ہے؛ وہ محض صلاح دینے کو کافی نہیں سمجھتی بلکہ احکام صادر کرنے لگتی ہے۔

مسٹر گروٹ نے مشرح بیان کیا ہے کہ کس طرح ابتدائی بادشاہت کے انھیں لواحق سے یونان کی آزاد سلطنتوں کا آغاز ہوا، اور کس طرح ان سلطنتوں نے ترقی کی؛ عدیدی سلطنتوں نے مجلس خاص کو وسعت دی اور عمومی سلطنتوں نے مجلس عام کو بڑھایا۔ جزئیات کو دیکھئے تو یونان میں جتنے شہر تھے اتنے ہی ان سلطنتوں میں تنوعات ہیں مگر اصل الاصول ہر جگہ ایک ہی ہے۔ قدیم یونانیوں اور قدیم رومانیوں کی سیاسی خصوصیت یہی ہے کہ انھوں نے شاہی کے تجربیاتی جرم سے جمہوریت کے اعضا تیار کئے ہیں۔

انگریزی تاریخ کی ظاہری شکل و شباہت اگرچہ اس سے مختلف ہے اور اس کا نشوونما اس سے سست و دیرطلب رہا ہے، مگر اصلاً اس کی حالت بھی یہی رہی ہے۔ یہاں وسعت وقسعت زیادہ تھی اور اجزاء عناصر بھی گوناگوں تھے۔ یونان کے شہروں کے لئے اپنے بادشاہ سے جلدتر گلوخلاصی کر لینا آسان تھا کیونکہ بادشاہ کا سیاسی تقدس ایک پرجوش اور رائے زن مجمع عام کے روزمرہ کی دیکھ بھال اور مسلسل تنقید کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔ یونان میں ہر جگہ غلاموں کی آبادی بحث سے خارج تھی، اور یہ آبادی سب طبقوں سے زیادہ جاہل اور اس لئے ذہنی اثرات کے قبول کرنے کے لئے سب سے زیادہ ناقابل تھی، مگر انگلستان میں بادشاہت کا آغاز ایک معقول وسعت کے رقبۂ ارضی کے ساتھ ہوا جس میں مختلف قومیں آباد تھیں اور ان میں سے کوئی بھی صاف وصریح تنقید کی اہلیت نہیں رکھتی تھی، اور سب کی سب شاہی کی توہم پرستی میں گرفتار تھیں ماسوا اس کے قدیم انگلستان میں شاہی کی حقیقت محض توہم پرستی سے بہت زیادہ تھی، ایک منتقسم، مسلح اور بےچین ملک کو زیر رکھنے کے لئے ایک بہت ہی زبردست

جماعت عاملانہ کی ضرورت تھی، اور اس لئے سیاسی نشو و نما کا مسئلہ نہایت نازک مسئلہ تھا۔ کسی یک جنس قوم میں قائم شدہ آزاد حکومت ایک مضبوط جماعت عاملانہ بہیار رکھ سکتی ہے مگر جبکہ جمہوریت ترقی پر اور بادشاہی زوال پر ہو، ایسی انقلابی حالت میں عاملانہ جماعت لازماً کمزور رہے گی، دولت عامہ کے اندرونی اختلافات رونما ہوں گے اور اس کی کارروائی کمزور و متزلزل ہوگی۔ علاوہ ازیں انگریزی قوم کے مختلف درجات نے مختلف انداز سے ترقی کی ہے۔ ازمنۂ متوسطہ کے بعد سے اعلیٰ طبقات میں بہایت تغیر ہو گیا ہے اور یہ تمام تغیرات ترقی کی طرف مائل رہے ہیں۔ مگر ادنیٰ طبقات میں بہت کم فرق ہوا ہے، اور بعض لوگوں کا دعویٰ تو یہ ہے کہ اگر ادنیٰ طبقوں کی حالت بعض لحاظ سے کچھ سدھری ہے تو بعض اہم اعتبارات سے ان کی حالت اور بدتر ہو گئی ہے۔ انگریزی سیاسی دستور کا نشو و نما لازماً سست ہوا ہے۔ کیونکہ اگر یہ نشو و نما سریع و تیز رو ہوتا تو وہ جماعت عاملانہ کو تباہ اور سلطنت کو فنا کر دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ سب سے زیادہ کثیر التعداد طبقات جن میں بہت کم تغیر ہوا تھا وہ انگریزی ادارات میں کسی قسم کے تباہی انگیز تغیر کے لئے تیار نہ تھے۔"

میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نارمنوں کی فتح کے قبل کے زمانہ کے متعلق کچھ کہہ سکتا ہوں بلکہ تمام اینگلو نارمن ادارات کی صحیح کیفیت تک غالباً مشتبہ حالت میں ہے، اور جن مسائل میں کثرت سے اختلافات ہوئے ہیں ان میں تو کم از کم یہ حالت ضرور ہے۔ سیاسی جوش و ڈھگوں کا ہویا ٹوریوں کا اس کے لئے ازمنۂ قدیم سے کوئی نظیر و مثال نکالنا ضروری تھا، اور چونکہ نظم معاشرت کی تمام حالت ہی ابتری میں پڑ چکی تھی اور لوگوں کی طمع اور اتفاقات وقت کے مطابق نظائر میں بھی تغیر ہوتا رہا ہے اس لئے ہر ایک نظیر کے حامیوں کو اپنی جولانی طبع دکھانے کے لئے بہت اچھا میدان ہاتھ آ گیا تھا، مگر میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ بالکل صاف ہے۔ ملک میں ایک بڑی "مجلس شوریٰ" تھی جس میں بادشاہ انگلستان کے ان نہایت ہی

ممتاز اشخاص کو طلب کرتا تھا جن کی صلاح و مشورے اور جن کی انداز طبیعت کے معلوم کرنے کی اُسے از حد ضرورت ہوتی تھی۔ ٹھیک ٹھیک یہ معلوم ہونا کہ اس مجلس میں اول اول کون لوگ آتے تھے، موہوم سا ہے اور چنداں اہم بھی نہیں ہے، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ میں "مجلس عظمیٰ اندرون پارلیمنٹ" اور "مجلس عظمیٰ بیرون پارلیمنٹ" کا فرق بتاؤں لیکن تدریج یہ ہوا کہ انگلستان کے بادشاہ جن خاص مجلسوں کو طلب کیا کرتے تھے انھوں نے دارالامرا اور دارالعوام کی وہ قطعی و معینہ شکل اختیار کرلی جسے ہم ظاہرا اس وقت دیکھتے ہیں، مگر ان کی اصلی حقیقت اس سے بہت مختلف تھی۔ اس وقت کی پارلیمنٹ ایک حکمراں جماعت ہے، لیکن اگر یہ کہنا جائز ہو تو میں کہوں گا کہ ازمنۂ وسطیٰ کی پارلیمنٹ اظہار خیال کرنے والی جماعت تھی، اس کا فرض یہ تھا کہ وہ عامل حکمراں یعنے بادشاہ کو اس امر سے مطلع کرے کہ قوم اس سے کس کام کی متمنی ہے، وہ ایک حد تک اپنی عقل و دانش سے بادشاہ کے لئے شمع راہ کا کام دیتی، اور نئے واقعات سے بہت کچھ رہبری کرتی تھی، یہ واقعات خود ارکان مجلس کے ادراکات تھے اور ان کے ادراکات قوم کے ادراکات تھے کیونکہ وہ قوم ہی کے اجزا و عناصر تھے، انھیں کے وسیلہ سے بادشاہ کو یہ معلوم ہوتا تھا یا اس وقوف کا ایک ذریعہ ہاتھ آجاتا تھا، کہ قوم کن امور کی متحمل ہوسکتی اور کن امور کی متحمل نہیں ہوسکتی یعنے بادشاہ کونسا کام کرسکتا ہے اور کونسا کام نہیں کرسکتا۔ اگر اس رمز کے سمجھنے میں اس سے بہت زیادہ غلطی ہوتی تھی تو شورش برپا ہوجاتی تھی۔

جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے، انگریزی سلطنت کے تین اہم دور ہوئے ہیں، ان میں سے پہلا دور ٹیوڈروں سے قبل کا ہے۔ اس زمانہ میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ انگریزی پارلیمنٹ غیر معمولی اختیار و قوت حاصل کرتی جاتی ہے۔ تاج کی حیثیت غیر متیقن تھی، بعض بادشاہ ناکارہ تھے، بہت سے حوصلہ مند اشخاص یہ چاہتے تھے کہ (حکومت میں) "قوم کو بھی شریک کرلیں"، اس وقت کے بعض نظائر صدیوں بعد تک جبکہ واقعی آزادی کا زمانہ آگیا تھا، اہم استناد کے طور پر پیش

گئے جاتے تھے، لیکن جن اسباب سے یہ ساجلانہ نشوونما ہوا تھا، وہی اسباب اس سے زیادہ سریع وفوری تنزل کا باعث ہوئے، ابتری وپریشانی نے اس کی پرداخت کی تھی اور ابتری وپریشانی ہی نے اسے تباہ وبرباد کیا۔ اس زمانہ میں نظم معاشرت کی ہیئت ترکیبی جاگیرانہ تھی، شہر اور قصبے محض اضافات اور پاسنگ کا کام دیتے تھے۔ خاص طور پر مقبول عام قوت امرا کی قوت تھی، یہ امرا متوسط الحال شرفا اور عام آزاد اشخاص کے ساتھ ملکر کام کرتے تھے اور ان کا مدار کار حلفی خدام کی پیچی وفاشعاری پر تھا، اس تمام طاقت کا سرگروہ جس پر اس کی قوت کار کا انحصار تھا، اعلیٰ طبقہ تھا، مگر اعلیٰ طبقہ امرا نے اپنے کو ہلاک کرڈالا۔ وہ جلیل القدر بیرن جو "سفید گلاب" یا "سرخ گلاب" کے جنبہ دار تھے یا جو کبھی ادھر اور کبھی اُدھر ہوتے رہتے تھے ان کی دولت، ان کی تعداد اور ان کی وقعت سب سال بسال کم ہوتی جاتی تھی۔ جب بوسورتھ میں اس کشمکش عظیم کا خاتمہ ہوا ہے تو اس کے بزرگ ترین جنگ آوروں کے بڑے حصہ کا خاتمہ ہوچکا تھا، جن بلند حوصلہ نجیبین اور متمول بیرنوں نے یہ خانہ جنگی برپا کی تھی وہ خود ہی اس خانہ جنگی سے شکستہ ہوگئے اور ہنری ہفتم کو ایک ایسی سلطنت ملی جس میں صلاح دینے کے لئے پارلیمنٹ موجود تھی، مگر نگرانی کے لئے پارلیمنٹ بمنزلۂ نفی کے تھی۔

شاہان ٹیوڈر سے قبل کے دور کی مشورتی حکومت زمانۂ جدید کی ان حکومتوں سے بہت ہی کم مشابہت رکھتی ہے جن میں فرانسیسی فلسفی اس نام سے موسوم کرتے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ فرانسیسی شہنشاہی خود کو اس نام سے موسوم کرتی ہے۔ مگر اس کی مجلسیں محض دکھاوا ہی دکھاوا ہیں ان کا انتخاب ہمہ گیر رائے دہی اور خفیہ رائے دہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اور اس کے حلقہائے انتخاب وہ ہیں جو کسی وقت محض مساوات کو مدنظر رکھکر بنائے گئے تھے، اور اب بھی بظاہر مساوات ہی کا دم بھرتے ہیں مگر انگلستان کی پارلیمنٹیں بے قاعدہ حقیقت تھیں۔ ان کا انتخاب کسی نہ کسی طرح سے ہوجاتا تھا، شیرف (ناظم صوبہ) کو قصبات میں حکم نامے بھیجنے کے متعلق بڑی حد تک اختیار تمیزی حاصل تھا گویا وہ (اپنے

حسب مرضی) حلقوں کا انتخاب کر لیتا تھا، اور پھر ہر قصبہ میں حق رائے دہی کے حصول کے لئے تگ و دو ہوتی تھی تا آنکہ سب سے زبردست مقامی فریق خواہ تعداد میں قلیل ہو یا کثیر اس حق کو حاصل کر لیتا تھا مگر اس زمانے میں انگلستان کے اندر قوم کی رائے کے جاننے کی بہت وسیع و صریح خواہش موجود تھی کیونکہ فی الحقیقت اس کی سخت حاجت تھی۔ قوم سے کچھ نہ کچھ کام لینے کی ضرورت رہا کرتی تھی۔ جنگ میں بادشاہ کی مدد کرنا، کسی پرانے قرضے کا بیباق کرنا، نازک موقع کے آپڑنے پر جان و مال سے اعانت کرنا، یہ سب اتفاقات پیش آتے رہتے تھے اور خاندان ٹیوڈر سے قبل کے بادشاہوں کے لئے یہ موزوں نہیں تھا کہ ان کی پارلیمنٹ محض خیالی مجلس ہو، اگر ایسا ہوتا تو ان کی "قوت مدرکہ" باطل ہو جاتی ان کے پاس وہ ذریعہ ہی نہ رہتا جس سے وہ قوم کی نبض شناسی کر سکتے۔ اگر وہ مصنوعی طور پر اس قسم کی مجلس بنانا چاہتے تو یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس ضرورت کا آلۂ کار مرکزی حکومت عاملانہ ہے، اور اس زمانہ میں فرانس کی طرح ایسے صوبہ دار نہیں تھے جن کے وسیلہ سے دیہاتوں کی مقامی رائیں درست ہو سکیں، اور دارالصدر کی خواہشوں کے مطابق بنا دی جائیں۔ انتخاب کے طریقے کو دیکھ کر تو ایک اصولی شخص یہ کہدے گا کہ یہ پارلیمنٹیں با اثر انگریزوں کے محض "اتفاقی" اجتماعات ہیں، لیکن اس بیان کو اگر من وعن صحیح بتانا منظور ہو تو اس میں بہت سی ترمیمیں کرنا اور شرطیں لگانا پڑیں گی مگر فی نفسہٖ اس بیان سے ان پارلیمنٹوں کے خاص اوصاف کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ یہ پارلیمنٹیں انگریزوں کے اتفاقی اجتماعات نہیں تھیں تو غیر مجوزہ اجتماعات ضرور تھیں ارباب نظم و نسق نے نہ انھیں بنایا تھا اور نہ وہ انھیں بنا سکتے تھے۔ یہ پارلیمنٹیں حقیقی معنی میں بادشاہ کی مشیر تھیں، ان کی رائیں دانشمندانہ یا غیر دانشمندانہ ہو سکتی تھیں، مگر ہر صورت میں یہ رائیں نہایت درجہ اہم تھیں، کیونکہ جو کام درپیش رہتا تھا اس میں ان کے اتحاد عمل کی ضرورت تھی۔

ان قدیمی پارلیمنٹوں میں اثباتی اختیار کی حیثیت سے وضع قوانین بالکل ہی دوسرے درجہ کی چیز تھی۔ میرا یقین ہے کہ جہاں تک ہمارے معلومات ہیں

رچرڈ اول کے عہد حکومت میں ایک بھی "تحریری قانون" نہیں منظور ہوا تھا!
اور شاہان ٹیوڈر کے قبل زمانہ میں جس قدر قوانین منظور ہوئے وہ تمام مجموعے
اس زمانہ کے پارلیمنٹ کے کسی گماشتہ کو (جس کی اوقات اسی سے بسر ہو)
بہت ہی کم معلوم ہوں گے۔ مگر قانون کے متعلق پارلیمنٹ کی منفی کارروائی
اس کے تمام خیالات کی جان اور اس کے ہر کام میں دائر و سائر تھی۔ پارلیمنٹ
کے "تجربیاتی" طریق کے حقیقی عناصر میں ایک عنصر یہ بھی تھا کہ بادشاہ
اس زمانہ کے قانون عامہ کے مقدس "اصول متعارفہ" میں قوم کی پسندیدگی
و ناپسندیدگی کا اندازہ کئے بغیر تغیر نہیں کر سکتا تھا۔ اس زمانہ کے لوگ ہر ایک
جدید قانون کو ایک مستثنیٰ و مخصوص قانون سمجھتے تھے اور بادشاہ کے لئے
یہ ضروری تھا کہ وہ جس طرح ان قوانین کے لئے لوگوں کے احساس و آرار کا
پتہ چلاتا تھا اسی طرح چھوٹے چھوٹے قوانین میں بھی اس کا پتہ چلائے۔
[illegible] میں قانون کا وضع کرنا خود بادشاہ کا کام تھا۔ امرا و عوام سے مشورہ کرنے
کے بعد بادشاہ ہی قانون کو اس کی معینہ صورت میں لاتا تھا۔ اور اسی کی متبرک
زبان سے اس قانون کو تقدس و استحکام حاصل ہوتا تھا۔ مگر جن قواعد سے قوم
کی عام زندگی کا انضباط ہوتا ہے ان میں کسی قسم کے تغیر کی وہ جرات اسی وقت
کر سکتا تھا کہ ان کے متعلق قوم سے مشورہ کرلے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس
غیر مہذب دور کے لوگ جنہیں خانہ جنگی سے وہ خوف نہیں رہتا تھا جو اس دور تہذیب
کے لوگوں کو رہتا ہے، اس کی اطاعت ہی نہ کرتے۔ اس دور کے بہت سے
نہایت ہی اہم قوانین اعلامی قوانین ہیں۔ (اور یہ واقعہ بجائے خود نہایت ہی
خاص واقعہ ہے) ان قوانین میں یہ اظہار نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اقتدار لازمی
کے ذریعہ سے یہ حکم دیتے ہیں کہ آئندہ زمانہ میں قانون کیا ہو، مگر وہ یہ بتاتے
ہیں کہ قانون کیا ہے، اور اسی کا تعیّن کرتے ہیں۔ وہ از یاد رفتہ زمانہ کے
رسم و رواج کا اعلان ہیں، نئے فرائض کے ضوابط نہیں ہیں۔ "منشور اعظم" تک
میں نئے قوانین بنانے کا خیال دوسرے درجہ پر تھا، یہ منشور قدیم و جدید قوانین
کا ایک اہم مجموعہ مرکب تھا۔ وہ ایک طرح کا معاہدہ باہمی تھا جس میں مروج رسم و رواج کے

شکوک وشبہات کا حصر وتعین کر دیا گیا تھا، یہ بالکل ایسا ہی تھا جس طرح حد بندیاں سال میں ایک مرتبہ درست کر دی جاتی تھیں، جو حقوق و دعاوی ساقط ہوا چاہتے ہیں وہ مستند بنا دئے جاتے اور دوانچ سے پاک کر دئے جاتے ہیں۔ فی الحقیقت اس قسم کے اہم منشور ہمارے اس زمانہ کے قانون کے معمولی مفہوم کے بجائے مختلف درجات و فرقات کے فیما بین ایک طرح کے معاہدے ہیں، جن میں ان امور کی تصدیق کی جاتی ہے جنھیں قدیم حقوق سمجھا جاتا ہے، وہ ازمنۂ وسطیٰ کے نظم معاشرت کی "دستاویزات انتظامی" تھیں جن کی توثیق اور توثیق مزید وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں خاص معرکہ بادشاہ اور قوم کے درمیان تھا، بادشاہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ قوم کس حد تک مجھے اپنی روش پر چلنے دیتی ہے اور قوم شکوے شکایت کر رہی اور ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کس قدر انتظامی قوانین کو روک سکتی اور بادشاہ کے کس قدر دعاوی کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

سر جیمز میکنٹوش کہتے ہیں کہ منشور اعظم نے "حق اجرائے محصول کو آزادی کی سپر بنا دیا" مگر (واقعہ میں) یہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ آزادی پہلے سے موجود تھی اور اجرائے محصول کا حق اسی کا ایک شاخسانہ تھا، یہ بیخ و بن نہیں تھا۔ محصول لگانے کے قبل ملک کی مجلس عظمیٰ سے مشورہ کرنے کی ضرورت اور اصول کہ بادشاہ کے لئے محصولات کی منظوری دینے کے قبل پارلیمنٹ کی طرف سے شکایات کا اعلان ہونا چاہئے، یہ دونوں امور خاندان ٹیوڈر کے قبل کے زمانہ کے اس قدیمی اصول کی نمایاں مثالیں ہیں کہ بادشاہ کو کسی کام کے کرنے کے قبل مجلس عظمیٰ سے مشورہ کر لینا چاہئے کیونکہ اسے ہمیشہ مشورہ کی ضرورت رہا کرتی ہے۔ اپنے اوپر خود محصول عائد کرنے کا حق بہت صحیح طور پر اس معاہدۂ اعظم میں داخل کر دیا گیا تھا، لیکن اگر اس مسلح قوت اور امرا کے اس نظم کا وجود نہ ہوتا جس نے بادشاہ کو اس معاہدے پر مجبور کر دیا تھا تو یہ سب حرف غلط کی طرح مٹ جاتا۔ یہ ایک نتیجہ تھا، مقدمہ نہیں تھا، ایک تعین خاص تھا، سبب نہیں تھا۔

(اگر میں یہ کہنے کا مجاز ہوں تو میں کہونگا کہ) سالہا سال کی خانہ جنگی نے قدیمی مجالس خاص کا نقش مٹا دیا تھا۔ جو امرائے عظام اس خانہ جنگی کے سبب سے زیادہ طاقتور رکن تھے، ان کے تین حصوں کو فنا کر دیا تھا، چھوٹے درجہ کے امرا و شرفا کو تھکا ڈالا تھا، اور اس اعیانی تنظیم کو زیر و زبر کر دیا تھا جس پر اس کے قبل بادشاہ کی پر زور مقاومت کا سارا دار و مدار تھا۔

برطانی سیاسی دستور کے دوسرے دور کا آغاز خاندان ٹیوڈر کی تخت نشینی کے وقت سے ہوتا اور ۱۶۸۹ء تک جاری رہتا ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ نئی مجلس عظمیٰ کے نشو و نما، اس کے ارتقا، اور اس کے تدریجی حصول تفوق کی تاریخ یہی ہے۔ میرے پاس نہ گنجائش ہے اور نہ یہ موقع ہے کہ میں تاریخ کے قدم بہ قدم رفتار کا اعادہ کروں، لوگ اس سے بخوبی واقف ہیں کیونکہ ہنری ہشتم کی غلامانہ پارلیمنٹ ملکہ الیزبتھ کے دور میں پردے ہی پردے میں شکوہ سنجی کرنے لگی اور چارلس اول کے وقت میں علانیہ بغاوت پر آمادہ ہو گئی۔ اس درجہ تک پہنچنے کے لئے زینے تو بہت سے طے کرنے پڑے مگر قوت محرکہ ایک ہی تھی یعنے انگریزوں میں طبقۂ متوسط کو ترقی ہو گئی تھی، اور مذہب پروٹسٹنٹ کے زیر اثر اس میں زور پیدا ہو گیا تھا (طبقۂ متوسط کا لفظ یہاں نہایت ہی حاوی معنی میں استعمال کیا گیا ہے) میرے خیال میں کسی کو بھی اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ لارڈ میکالے نے بالکل صحیح کہا ہے کہ بادشاہ کے خلاف جیسی مقاومت ہوئی، اسے اگر مذہبی خیال نے تقویت نہ دی ہوتی تو اس زمانہ میں صرف سیاسی اسباب سے یہ حالت پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ اول اول ٹیوڈر خاندان کے بادشاہ اور ملکہ جس طرح چاہتے تھے انگریزی قوم اسی طرح کیتھولک سے پروٹسٹنٹ اور پھر پروٹسٹنٹ سے کیتھولک بن جاتی تھی۔ (اس امر کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ مذہب پروٹسٹنٹ کے مختلف رنگ اور اس کے متعدد فرقے تھے) مگر یہ حالت پیوریٹنی دور سے قبل کی تھی۔ انگریزوں کا سواد اعظم غیر تیقن حالت میں تھا، اس کی بالکل وہی کیفیت تھی جیسی ہو پر نے اپنے باپ کے متعلق

لکھی ہے کہ "اسے مذہب پروٹسٹنٹ پر اعتقاد نہیں تھا مگر وہ اس کی طرف سے بے التفات بھی نہیں تھا"۔ لیکن آہستہ آہستہ متوسط درجہ کے انگریزوں میں وہ زبردست احساس پیدا ہو گیا جسے (اس زمانہ میں) اونجیلیکی کہتے ہیں اور پوپ کی مخالفت کا جوش اس سے بھی بڑھ گیا۔ اور اسی شئے نے اس قوت اور لحم و شحم میں جس کی انھیں کبھی ضرورت نہیں تھی اس ذہنی حرارت و جوش کا اضافہ کیا جس کی انھیں کم و بیش ہمیشہ ضرورت رہی ہے۔ یہیں سے یہ قول نکلا کہ کرامویل نے انگریزی دستور سلطنت کی بنا ڈالی ہے۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کرامویل کا کام اس کے ساتھ ہی پیوند خاک ہو گیا، اس کا خاندان رد کر دیا گیا، اور اس کی جمہوریت نقش باطل کی طرح مٹا دی گئی، مگر وہ جوش جو کرامویل میں انتہا کو پہنچ گیا تھا، اس کا زور پھر کبھی ملک میں گھٹا نہیں۔ البتہ یہ زور کبھی کبھی آتش فشاں قوت کی طرح زیر سطح پنہاں ہو جاتا تھا۔ چارلس دوم نے یہ کہا تھا کہ وہ کسی شئے اور کسی شخص کی خاطر اب دوبارہ سیر و سیاحت نہیں اختیار کرے گا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جن لوگوں سے وہ واسٹر میں ملاقی ہوا تھا وہ مر گئے ہیں یا مر جائیں گے۔ مگر جو حرارت ان کے سینوں میں جوش مار رہی تھی وہ ہنوز دوسروں کے سینوں میں زندہ و موجزن ہے۔

لیکن کرامویل کی جمہوریت اور پیوریٹنی طریق کی سخت پابندی سے اکثر و بیشتر انگریز نہایت درجہ متنفر تھے، اگر گستاخی معاف ہو تو میں یہ کہوں گا کہ فرانس وغیرہ میں آبادی کے جس عنصر کو "روژ" (یعنے سرخ انقلابی Rouge) کہتے ہیں، وہی یہ بھی تھے، تمام سلطنت میں یہی انقلاب برپا کر رہے تھے، اور اسی وجہ سے سب ان سے متنفر تھے۔ یہ قوت بذات خود بہت کم کچھ کر سکتی تھی، بیشک یہ اپنی عریاں شکل میں اعتدال پسند و سست رو اور اس کے ساتھ ہی تمام نازک طبع، ذی علم لوگوں کو خوف زدہ کر دیتی تھی اور وہ اس سے تبرا کرنے لگتے تھے یہ قوت تن تنہا، انگریزوں کی پتھر کی سی بے حس طبیعت کے سامنے بالکل بے بس تھی، لیکن اس آتش انگیز عنصر کو کوئی خوش منظر

قالب خاکی عطا کر دیجئے اور کسی ایسے موقع پر اسے پھوٹ نکلنے کا کوئی حیلہ دیدیجئے جبکہ باوقار، ذی علم و متمول طبقات اس کے ساتھ شریک ہوسکیں تو پھر یہ لوگ اس جوش کے ذریعہ سے سب کو مغلوب و مقہور کر لیں گے اور یہ آتش انگیز قوت ان کے زیر دامن پنہاں ہو جائیگی۔

اسی قسم کا ایک حیلہ ۱۶۸۸ء میں مل گیا تھا، جیمز دوم نے اپنی نالائقی و خرد ماغی سے نہ صرف ان طبقات کو آزردہ کر دیا، جو اس کے باپ کے خلاف لڑے تھے بلکہ ان طبقات کو بھی آزردہ کر دیا جو اس کے باپ کی جانب سے لڑے تھے، اس نے اینگلیکی اور پیوریٹینی دونوں طبقوں کو رنجیدہ کر دیا، تمام دھگ امرا، مخلف ٹوری امرا اور اس کے ساتھ اہل شہر میں سے وہ لوگ جو عام عبادت سے اتفاق نہیں کرتے تھے، سب کبیدہ ہو گئے تھے۔ پارلیمنٹ کی حکمرانی کا قیام شاہی کی حسب معمول تائید کرنے والوں اور شاہی کی حسب معمول مخالفت کرنے والوں دونوں کے اتفاق رائے سے ہوا تھا، مگر نتیجہ ایک طولانی کمزوری کی صورت میں ظاہر ہوا۔ انگریزوں کا یہ انقلاب اقل قلیل انقلاب کہلاتا ہے کیونکہ قانونی اعتبار سے تو اس انقلاب سے، صرف حکمراں خاندان بدل دیا گیا تھا، مگر عوام الناس کے طبائع پر خاص اسی وجہ سے صدمہ پہنچا۔ کیونکہ وہ صرف فرمانروا خاندان کو دیکھتے ہیں اور کسی شئے کو نہیں دیکھتے۔ طبقۂ اعیان کے غالب حصہ کی تائید کی وجہ سے اطاعت شعار طبقات کا جزو کثیر اپنی جگہ پر قائم و مجتمع رہا مگر یہ قیام و اجتماع ناکمل، غیر اطمینان بخش و خلاف رضا تھا، عوام الناس کے دلوں میں جیسے کچھ اچھے برے خیالات جمے ہوے تھے، اس کی وجہ سے ان کی جماعتہائے کثیرہ برسوں تک اِدھر اُدھر سرگرداں ہوتی رہی۔ اگر اسٹوارٹ خاندان کا کوئی قابل شخص قابل اطمینان صداقت کے ساتھ مذہب پروٹسٹنٹ کا اقرار کر لیتا۔ تو اغلب یہ تھا کہ وہ خاندان ہانوور کا تختہ الٹ دیتا، موروثی حق کے متعلق حلفی احترام اس درجہ قوی تھا کہ جب تک جارج سوم تخت نشین نہیں ہوا ہے، اس وقت تک انگریزی حکومت کو ہمیشہ ایک حریف بادشاہ کی طرف سے پریشانی و حیرانی

سد پیش رہا کرتی تھی۔

یہ نتیجہ ہے اس شئے کا جس پر میں اس قدر سختی و اصرار کے ساتھ زور دیتا ہوں، اور اس پر زور دینا نہایت ضرور بھی ہے کیونکہ تمام بحث میں اسکی خصوصیت سب سے زیادہ بڑھی ہوی ہے۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ انگریزی قوم میں سے بہت سے لوگ یعنے اس کا زیادہ بلند و زیادہ تعلیم یافتہ حصہ آئینی حکومت کی نوعیت کو سمجھنے لگا تھا، مگر عام خلقت نے ابھی اسے نہیں سمجھا تھا، وہ بادشاہ ہی کو حکمراں سمجھتے تھے اور ان کی نظر صرف بادشاہ ہی کی طرف لگی رہتی تھی۔ یہ لوگ طبقۂ اعیان کی سحر طرازی، اور خاص کر بڑے بڑے وھگ خاندان اور ان کے حوالی موالی کے اثر میں آکر چل نکلے، اگر امرا کی یہ امداد شامل نہ ہوتی تو دلیل یا آزادی کے زور سے وہ قابو میں نہیں رہ سکتے تھے۔

پارلیمنٹ کی حکمرانی اگرچہ ۱۶۸۸ء میں قطعی طور پر قائم ہو گئی تھی مگر اس حکمرانی کو عمل میں لانے کا طریقہ اس کے بعد سے بدل گیا ہے۔ ابتداً پارلیمنٹ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس حکمرانی کو کس طرح عمل میں لائے۔ مختلف فریقوں کی تنظیم اور انھیں فریقوں کی طرف سے کابینہ کے تقرر نے جس طرح ترقی کی ہے اسے میکالے نے بہت ہی خوبی سے بیان کیا ہے۔ آخری دور تک یہ خیال کیا جاتا تھا اور یہ خیال نہایت مضرت رساں حد تک پہنچ گیا تھا کہ وزرا کے تقرر میں بادشاہ کی دخل دہی شامل رہتی ہے۔ جارج سوم جب ۱۸۱۰ء میں قطعاً مجنون ہو گیا تو ہر شخص کو یہ یقین تھا کہ جارج چہارم متولی کے اختیارات پانے پر مسٹر پرسیول کی حکومت کو خارج کر دے گا اور کسی وھگ سرگروہ لارڈ گرے یا لارڈ گرینویل کو دوسری حکومت مرتب کرنے کا اختیار دیدے گا۔ ٹوری حکومت نپولین کے خلاف اس جنگ کو جسے اپنی بقائے ہستی کی جنگ کہنا چاہیے، کامیابی سے چلا رہی تھی مگر قوم کے دلوں میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ جارج چہارم وھگ ہے، اور یہ خیال اس امر کو بھی نظر نہیں آنے دیتا تھا کہ ایسے موقع پر غیر مبدل حکومت کی ضرورت ہے۔ جارج چہارم وھگ ضرور تھا مگر یہ انقلاب فرانس سے قبل کی

بات تھی، جب وہ سنٹ جیمز اسٹریٹ میں فاکس کے ساتھ لاابالیانہ زندگی بسر کرتا تھا، مگر لارڈ گرے اور لارڈ گرینویل سخت آدمی تھے، اور ان کا اثر مخرب اخلاق نہ تھا۔ متولی میں آزادی رائے کا کسی وقت میں جو کچھ بھی اثر رہا ہو مگر فرانس کے دور ہول و تخویف کی دہشت نے (دوسرے لوگوں کی طرح) اس کے دل سے بھی اس خیال کو ہوا کر دیا تھا۔ ایک بادشاہ کی طرح وہ بھی یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کی زندگی اسی پر مبنی ہے کہ وہ حامی شاہی ہے۔ بہت جلد یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ مسٹر پیسیول کو برقرار رکھنے کے لئے نہایت مضطر اور وھگ امرا سے نزاع برپا کرنے کا نہایت شائق تھا۔ ہم سب یہ جانتے ہیں کہ جو وزارت برسرکار تھی اس نے اسی وزارت کو قائم رکھا، مگر اس خیال ہی کا دل میں آنا کہ اس زمانہ میں وہ وزارت میں تغیر کر سکتا ہے، بجائے خود ایک نہایت نمایاں مثال اس امر کی ہے کہ پارلیمنٹ کی آزادانہ کارروائی کی نسبت فی الواقع ہمارے خیالات کس حد تک نئے ہو گئے ہیں۔

پس جن مدارج کا ہم نے اس قدر سرسری طور پر ذکر کیا ہے ان سے (اور دوسرے اسی قسم کے واقعات سے جن کے بیان کرنے کی نہ یہاں گنجائش ہے اور نہ ضرورت) انگلستان میں ظاہراً نہیں مگر باطناً وہی تغیر پیدا ہو گیا جو یونانی شہروں میں صورۃً و معنیً دونوں اعتبار سے پیدا ہوا تھا۔ (یونان کی طرح) یہاں بھی شاہی کے لوازم کو جمہوریت کے عنصر خاص میں بدل دیا گیا۔ چونکہ یہاں کی سیاسی آبادی نہایت کثیر التعداد اور متاثر یک دگر ہے اس لئے صرف یہاں اس کی ضرورت ہے کہ قدیم ظاہرداری کو برقرار رکھا جائے اور ساتھ کے ساتھ جدید واقعیت کو خفیہ طور پر شامل کر دیا جائے۔

اس عجیب غریب اور طولانی تاریخ نے انگریزوں کی موجودہ سیاسی حالت کے قریب قریب ہر حصہ پر اپنا کچھ نہ کچھ سیاسی اثر چھوڑا ہے۔ انگریزوں کے بہت سے نہایت ہی اہم اختلافات کی اصل و بنا اسی کے اثرات ہیں، اور چونکہ ان اثرات پر صحیح طور پر نگاہ نہیں پڑتی ہے اس لئے ان اختلافات سے اکثر دلوں میں غلط فہمی واقع ہوتی ہے۔

انگریزی قوم کی نہایت ہی عجیب و غریب خصوصیات میں سے ایک خصوصیت حکومت عاملانہ سے اس کا مکدر رہنا ہے۔ اس اعتبار سے انگریز اہل امریکہ کی طرح "حقیقی معنے میں ایک جدید قوم" نہیں ہیں، اہل امریکہ حکام عاملانہ کو اپنے مقرر کردہ گماشتے سمجھتے ہیں، وہاں حکام عاملانہ جب عام معاشرت میں مداخلت کرتے ہیں تو ان کا یہ فعل اہل امریکہ کی نظر میں نازی اقتدار قوم ہی کے حکم کے زیر اثر ہوتا ہے اور قوم کے خود اپنے معاملات میں دخل دینے میں آزادی پر کوئی حملہ یا اس سے کسی قسم کا اہمال نہیں ہوتا۔ فرانسیسی، سوئیزرستانی اور تمام دوسری قومیں جن کی رگ و پے میں انیسویں صدی کے اثرات پوری طرح سرایت کر گئے ہیں ان سب کا خیال ایسا ہی ہے۔ اس زمانہ کی مادی ضروریات کے لحاظ سے ایک پرزور حکومت عاملانہ کی ضرورت ہے۔ جو قوم اس قسم کی حکومت سے محروم ہو اس میں اس قوم کی سی صفائی، صحت اور قوت نہیں ہو سکتی جس میں اس قسم کی حکومت موجود ہو۔ لفظی تعریف کے لحاظ سے تو یہ کہنا چاہیئے کہ جو قوم اپنے کو آزاد کہتی ہو اسے حکام عاملانہ سے کسی قسم کا رشک و حسد نہ ہونا چاہیئے، کیونکہ آزادی کا مفہوم یہی ہے کہ قوم یعنے قوم کا سیاسی حصہ، حکومت عاملانہ سے کام لیتا ہے، مگر انگریزوں کی تاریخ نے ان کے احساس کو بالکل الٹا کر دیا ہے۔ انگریزوں کی آزادی، نتیجہ ہے حکومت عاملانہ کے خلاف ان کی صدیوں کی مقاومت کا خواہ اس میں قانونی جزو غالب ہو یا غیر قانونی، خواہ تہور کا جزو غالب ہو یا جبر کا۔ پس انگریزوں کو تصادم کے روایات ورثہ میں ملے ہیں، اور وہ اپنی فتح کامل کے زمانہ میں بھی اس پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ انگریز سلطنت کے کاموں پر خود اپنے کام کی حیثیت سے نظر نہیں ڈالتے بلکہ اُسے کسی غیر کا کام سمجھتے ہیں۔ وہ اسے ایک بیرونی چیز خیال کرتے ہیں۔ خود اپنی منتظم خواہشات کا پختہ نتیجہ نہیں سمجھتے۔ میں نے ۱۸۵۱ء کی مردم شماری کے وقت ایک نہایت سمجھدار سن رسیدہ بیگم کو یہ کہتے سنا کہ اب "انگلستان کی آزادی کا خاتمہ ہے" اس بیگم کی دلیل یہ تھی کہ اگر حکومت کا تجسس اس درجہ بڑھ جائے کہ وہ یہ

پوچھنے لگے کہ تمھارے گھر میں کون سویا تھا، تمھاری عمر کیا ہے تو پھر وہ کونسی بات ہے جسے وہ نہیں پوچھ سکتی یا کونسا کام ہے جسے وہ نہیں کر سکتی ؟

انگریزی قوم کا طبعی میلان اسی طرف ہے کہ اقتدار کی مقاومت کی جائے۔ انھوں نے ذی اقتدار پولیس کے رواج اور قیام کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا، میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو اس وقت تک یہ خیال کرتے ہیں کہ پولیس کا قیام آزادی کی قطع برید ہے اور یہ محض فرانس کے جندارمہ کی نقل ہے، (گو میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ یہ لوگ فرسودہ روزگار اشخاص میں سے ہیں۔) اگر اول ہی سے پولیس کی ابتدا اس طرح ہوی ہوتی کہ ان کے سروں پر بھی آج کل کی سی فوجی ٹوپیاں ہوتیں تو نتیجہ مشتبہ ہو جاتا، محاً فوجی استیلا کا شور برپا ہو جاتا اور انگریزی قوم کی خلقی بیتابی مکمل امن و انتظام کی جدید ترین الفت پر غالب آجاتی۔ یہ قدیمی خیال کہ حکومت ایک بیرونی کارکن ہے اب تک انگریزوں کے دماغوں پر مسلط ہے، حالانکہ اب یہ خیال صحیح نہیں رہا ہے اور انگریز پر سکون اوقات میں جب غور و فکر سے کام لیتے ہیں تو وہ اچھی طرح جان لیتے کہ ایسا نہیں ہے۔ یہ اثر صرف تاریخ ہی سے پیدا نہیں ہوتا ہے، تاریخ کو تو پس پشت ڈال سکتے ہیں، مگر اس تاریخ کے نتائج ساتھ نہیں چھوڑتے ہیں۔ انگلستان کی دُھری حکومت کا یہی اثر ہونا چاہئے تھا، انگریز جب حکام عاملانہ کے ساتھ اپنے بغض کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو وہ تاج کی رقابت کا حوالہ دیتے ہیں، جو آئینی اقتدار کے مغز و استخواں میں اس درجہ پیوست ہے۔ باوجود قانون و حقیقت نفس الامری کے بہت سے لوگوں کو یہ تسلیم کرنا گراں گزرتا ہے کہ ملکہ قوم کی مقرر کردہ اور اس کی جانب سے کارکن ہے۔ فصاحت و بلاغت دکھانے کا یہ ایک اچھا ذریعہ ہے کہ ملکہ کے امتیاز خاص کو اس طرح ظاہر کیا جائے کہ وہ کوئی ایسی شئے ہے جسے عوام میں قبولیت نہیں حاصل ہے اور اس لئے اس پر اعتماد نہ کرنا چاہئے۔ انگریزوں کی حکومت کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ وہ اپنے حکام عاملانہ کو اس طرح مالوف و معتمد نہیں سمجھ سکتے جس طرح ان کے برعکس اہل سوئزرلینڈ یا اہل امریکہ اپنے حکام عاملانہ سے مالوف ہوتے

اور ان پر اعتماد کرتے ہیں۔

اسی تاریخ اور انھیں نتائج کی وجہ سے انگریزوں میں "ان مقامی حکام" کی رواداری پیدا ہو گئی ہے جن سے بہت سے غیر ملکی حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔ بادشاہ کے ساتھ کشمکش کے اوقات میں انھیں مقامی مرکزوں نے ستون و عماد کا کام دیا۔ قدیم زمانہ میں یہی مقامی جماعتیں تھیں جو پارلیمنٹ، اضلاع و قصبات میں اپنے ارکان بھیجتی تھیں، اور چونکہ خود ان مقامی جماعات کی زندگی آزاد ہوتی تھی، اس لئے پارلیمنٹ بھی آزاد رہتی تھی۔ اگر واقعی کام کرنے والی جماعتیں نمایندوں کا انتخاب نہ کرتیں تو ان نمایندوں کو بھی کچھ اختیار نہ ہوتا۔ یہی بہت بڑی وجہ رائے دہی سے کے متعلق انگریزوں کے قدیم حقوق کے باہمی اختلاف کی ہے۔ حکومت نے یہ پروانگی دے رکھی تھی کہ ہر ایک قصبہ میں جو لوگ سب سے زیادہ ذی اثر ہوں وہی ارکان کا انتخاب کریں۔ انھوں نے انتخاب کنندہ جماعتوں پر "فطری انتخاب" کا اصول عائد کیا۔ مقامی حیثیت سے جو گروہ کافی مضبوط تھا وہی انتخاب کرتا تھا۔ بعد کو خانہ جنگی کے زمانہ میں لندن کے مانند بہت سی انجمہائے مشخصہ مقاومت کا اہم مرکز بن گئیں۔ لندن کا معاملہ ایک نمونہ اور قابل یادگار معاملہ ہے۔ اس زمانہ کے تعلیم یافتہ انگریز اگر کسی ایک جماعت کو دوسری جماعت کی بہ نسبت کم التفاتی سے دیکھتے ہیں، تو اغلب یہی ہے کہ وہ لندن کی انجمن مشخصیہ ہے۔ موروثی خرابیاں اور ان خرابیوں کا کامل طور پر محفوظ رکھنا، وسیع آمدنیاں اور ان کا نامکمل حساب دینا، بلدیہ کی حکومت خاص کو ایک قدیمی محرابی دروازے تک محدود کر دینا، سیکڑوں قابل نفرت حلقہائے مذہبی کو دوامًا برقرار رکھنا، اظہار شان کے لئے بے مصرف آدمیوں کے ایک بڑے غول کو قائم رکھنا، ان تمام باتوں کو تعلیم یافتہ انگریز مشخصیہ لندن کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ان تمام امور کی کمی کے لئے جن کے سے پیرس اس قدر نفیس و شاندار بن گیا ہے انگریز بجا طور پر مشخصیہ لندن کو ملزم گردانتے ہیں، اور جن چیزوں نے لندن کو ذلیل و غلیظ بنا رکھا ہے ان کے لئے بھی بجا طور پر اسی مشخصیہ کو الزام دیا جاتا ہے، لیکن یہی مشخصیہ لندن تھا جو صدیوں تک انگریزوں کی آزادی کی پشت و پناہ

بنا رہا ۔ اسی قریب الوقوع اور منضبط دار الصدر کی ارادی تائید نے طویل العہد
پارلیمنٹ کو وہ تاب و توان عطا کی جو کسی اور مقام سے حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔
سر برآوردہ محبان وطن اسی بلدہ میں پناہ لیتے تھے اور وہ دائمی نشست کرنیوالی
انگریزی مجلس جہاں تک پہنچنا سب سے زیادہ آسان ہے وہ گلڈ ہال کی
کمیٹی ہے جہاں وہ تمام ارکان "جو آجاتے ہیں، سب کو رائے دینے کا حق ہوتا ہے"۔
جارج سوم کے زمانہ تک بلدہ عام رائے و خیال کا ایک کار آمد مرکز تھا۔ اور
دوسری جگہوں کی طرح یہاں بھی انگریزوں نے اپنے نظم سلطنت کے زینہ کے لیے
پائے تیار کئے ہیں ۔

ڈی ٹوک ویل، یہ دعوی کرتا تھا کہ اس خصوص میں انگریز نہ صرف
تاریخی طور پر معذور ہیں بلکہ سیاسی طور پر بھی حق بجانب ہیں ۔ اس نے
گویا مذہب شخصیات کی بنا ڈالی ۔ چونکہ فرانس میں قوم کو اپنی آپ تنظیم
کرنے کا اختیار بہت کم حاصل ہے اور ہر مسئلہ پر صوبہ دار سے استصواب ضروری
ہے اور صوبہ دار ہی ہر تحریک کی ابتدا کرتا ہے، اس لئے یہ ایک طبعی امر ہے کہ
وہاں ایک خلوت گزیں صاحب فکر ان مبالغہ آمیز کارروائیوں سے برداشتہ خاطر
ہو جائے گا، جن کی خرابیاں اسے معلوم ہیں، اور ان کے برعکس ایسے مبالغوں
کی طرف مائل ہو جائے گا جن کی خرابیاں اسے معلوم نہیں ہیں، مگر انگلستان
کے ایسے ملک میں جہاں کاروبار کا زور شور ہو، جہاں (بالاستدلال ڈی ٹوک ویل
سیاسی تعلیم کی غرض سے) ہر ایک خرابی کے لئے ایک نگران کمیٹی اور ہر ایک
علاج کے لئے ایک عاملانہ کمیٹی مقرر ہوسکتی ہو وہاں اس تشویش کی زیادہ ضرورت
نہیں ہے کہ کس قدر اختیارات بیرونی جماعتوں کو دیے گئے ہیں، اور کس قدر
اختیارات مرکزی جماعت کے لئے محفوظ رکھے گئے ہیں۔ بلدیات سے جو تعلیم
حاصل ہوسکتی ہے، انگریز اسے حاصل کر چکے اور اتمام کو پہنچا چکے ہیں، اب وہ
پورے جوان ہو گئے ہیں۔ اور بچوں کی سی باتوں کو برطرف کر سکتے ہیں ۔

انگریزوں کی حکمت عملی میں بے شمار ضد یکدگر امور کے اسباب یہی
ہیں۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ بعض بہترین نکتہ چینوں پر ان متضاد امور کا جیسا

خوف طاری رہتا ہے مجھے مطلق ان سے ہمدردی نہیں ہے۔ یہ ایک طبعی امر ہے
کہ جو لوگ اپنی مخصوص و قابل تحسین تعلیم و تربیت کی وجہ سے تمام چیزوں کو صناعی
نظر سے دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں وہ ان عجیب و غریب خصوصیات سے
گھبرائیں گے، مگر یہ بھی طبعی امر ہے کہ جو لوگ سیاسی ادارات کے تجربہ کرنیکے
عادی ہیں وہ ان متضاد امور کو کسی قدر رفق و لینت اور دلچسپی کے ساتھ
دیکھیں گے۔ ان میں کچھ باتیں سبق آموز ہوسکتی ہیں، مگر فلسفہ سیاسی ادھوری
ناکمل ہے۔ وہ ان مشاہدات کی بنا پر تیار کیا گیا ہے۔ جو سیاسیات اور
دول کی چند منتظم نمونوں سے مرتب ہوئے ہیں اور ان امور کی نسبت اس
کی تعلیم نہایت قابل قدر ہے، مگر ہمیں ہمیشہ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس
کے اصول موضوعہ ناکمل ہیں۔ جہاں اس کے اولین مفروضات صحیح اترتے
ہیں وہاں تو یہ سبق بہت اچھے ہوتے ہیں، مگر جہاں وہ مفروضات کام
نہیں دیتے وہاں وہ ناقص ہوجاتے ہیں۔ ایک فلسفی عالم سیاسی
تضاد کو اسی نظر سے دیکھتا ہے جیسے ایک ذی علم طبیب کسی نئی اور عجیب
بیماری کو دیکھتا ہے، اس کے لئے یہ ایک "دلچسپ واقعہ ہے"۔ انگریزوں نے
اگرچہ عام واقعات کے سبق پورے کرلئے ہیں، مگر پھر بھی ان کے لئے
تعلیم کا ایک باب کھلا ہوا ہے۔ اس لئے میں ان متضاد امور کے خلاف
اس زور شور کی چیخ پکار میں شریک نہیں ہوسکتا۔ میری رائے تو یہ ہے کہ
اس شور و شغب سے ہم بہت جلد نقش راہ سے ہٹ جائیں گے اور
منزل مقصود سے گمراہ ہوجائیں گے۔

بہر حال اس استثنائی رائے کو علیحدہ کرکے میں اس امر کو نہ صرف
تسلیم کرتا ہوں بلکہ اس کا دعوی کرتا ہوں کہ انگریزوں کا سیاسی دستور
عجیب و غریب نوادر سے بھرا ہوا ہے جن سے وقت اور مضرت کا سامنا
ہوتا ہے اور ان کو خارج کردینا چاہئے۔ انگریزوں کا قانون اکثر شہروں کے
مضافات کو یاد دلاتا ہے جہاں بہت دنوں تک آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ
یہ زلف بتاں کی سی پیچ در پیچ راہیں کہاں مڑتی اور کدھر کو جاتی ہیں،

آخر یہ بات آپ کے ذہن میں آتی ہے کہ مکانوں کے پہلوؤں میں یہ راستے پرانے سبزہ زار کی کج مج راہوں پر بن گئے ہیں، اور اگر آپ بعض راستوں سے ہوتے ہوئے اس زمانہ کے کھیتوں تک جائیں تو آپ اکثر دیکھیں گے کہ یہ تغیر نصف مکمل ہو گیا ہے۔ بعینہ اسی طرح انگریزوں کے دستور سلطنت کی روشیں قدیم زمانہ کی منتشر آبادی اور سادی طبیعت کے لوگوں میں بنی تھیں، مگر انگریز اس وقت تک ان کی ہیئت ظاہری کو قائم کئے ہوئے ہیں، حالانکہ تمدن خطرات، تعقیدات و مسرات کو اپنے جلو میں لئے ہوئے اپنا ڈیرہ و خیمہ ڈال چکا ہے۔ سیکڑوں صورتیں ایسی ہیں جن میں یہ متضاد باتیں آئینی کشمکش کے قدیم حدود کا نشان دیتی ہیں، گزشتہ مبارزوں میں جس قدر قوت و طاقت تھی اسی اندازے سے اس اتفاقی راستہ کا پتہ چلتا ہے۔ بعد کی آنے والی نسلوں نے اپنا میدان جنگ کہیں دوسری ہی جگہ قائم کیا اور کہیں کسی غیر مختتم جنگ کے ہلکے خطوط دائمی حد کے طور پر باقی رہ گئے۔

جن اوپری اور سرسری خصوصیات کی شکایتیں کی جاتی ہیں، ان میں سے اگرچہ نصف خصوصیات انگلستان میں دہری حکومت کی موجودگی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، مگر میں اس دوعملی حکومت اور اس کے بے شمار حوادث کو تضادین نہیں شمار کر سکتا۔ انگلستان کے ایسے ملک اور اس زمانہ کے مخصوص حالات میں ملکہ کے ظاہری امتیازات خاص اور ڈاننگ اسٹریٹ کی حقیقی حکومت[1] کا ساتھ ساتھ چلنا بالکل ہی موزوں و مناسب ہے۔

[1] انگلستان کی اصلی حکومت اس خوبی سے پس پردہ رکھی گئی ہے کہ اگر آپ کسی گاڑی والے سے "ڈاؤننگ اسٹریٹ" لے چلنے کو کہیں تو نہایت ہی اغلب ہے کہ اس نے اس جگہ کا نام ہی کبھی نہ سنا ہو، اور اسے کچھ بھی پتہ نہ چلے کہ آپ کو کہاں لیجائے۔ یہ زیر نقاب جمہوریت ہی وہ شئے ہے جو انگریزوں کی ایسی مخلوق کے لئے اس انیسویں صدی کے زمانہ میں موزوں و مناسب ہے۔

تمت

صحت نامہ

(۲)

دستور سلطنت انگلشیہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
		دیباچہ	
۲	۲	ماآخذ	ماخذ
۷	۹	ہدایت	بداہت
۹	۶	کے	کی
۱۰	۲۳	مسٹریٹ	مسٹرپٹ
۱۲	۱۰	جس میں	جن میں
۱۳	۱۴	نئی	نئے
۱۴	۱۰	واعظ وپند	وعظ وپند
؍؍	۲۳	جس میں	جن میں
۱۶	۳	جس	جُبن
۱۶	۱۲	لفت	لعنت
۱۶	۱۹	دوسرے	دوسری
۲۲	۱۸	اس مے	اس سے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۲۳	۵	کے بڑی	کے بڑے
۲۴	۱۰	دارالامر کے	دارالامرا کے
؍؍	۲۱	یہ تعداد کثیر	بہ تعداد کثیر
۲۶	۱۷	کی اتفاق	کے اتفاق
۲۷	۱	پیرھی	پیری
۳۲	۸	تخصوص	مخصوص
۳۳	۱۸	کے	کی
۳۴	۱۹	اپنے	اپنی
۴۰	۳	یک	ایک
۴۴	۱۰	ریولو	ریویو
۵۰	۱۴	انتہائے	انتہائی
۵۴	۸	؍؍	انتہائی

(اصل کتاب)

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۲	۱۳	کی	کے
۳	۹	ترکبیی	ترکیبی
"	۱۴	کہی	یہی
۴	۳	اس کی	اس کے
"	۱۳	نے	لئے
۹	۲۴	مہتم	.
۱۴	۱۲	لفاد	نفاذ
"	۱۸	حو	جو
"	حاشیہ سطر ۲	تھے	ہیں
۱۵	۱۸	سینکڑوں	سیکڑوں
۱۶	۱۶	مستعقی	مستعفی
۱۷	۲۳	ڈیوسن	ڈیویس
۱۷	حاشیہ سطر	ریچمنڈ	رچمنڈ
۲۵	۱	اکرئے	کرے
۲۶	۳	فوقتیں	فوقیتیں
"	۱۳	درکار نہیں	درکار نہ ہوں
۴۴	۹	پیلوپونیزی لیگ	پیلوپونیزی لیگ کے
"	۸	اکلتریا	اکلیریا
۳۴	۲۰	انتیمفز	اتینمفز
۴۲	۴	اشنائے نمائش	اشیائے نمائش
۴۳	۱۴	خصوصیت	خصوصیت

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۴۹	۸	زبانوں	زبانوں
"	۲۱	فرید فرید	فرد فرید
۵۰	۳	گیرہ کے حسب خواہش	گیزو کی خواہش
"	۵	وزرس	وزرا و اس
۵۲	۵	پاہیئے	چاہیئے
۵۷	۱۸	نیرنگیں	نیرنگیں
۶۱	۱۹	سبب	سب
۶۱	۲۲	ایا	آیا
۶۵	۳	ممد و معاون	ممد و معاون
۶۷	۱۸	معاملات خاصہ	معاملات عامہ
۷۳	۱۶	مشفقت	مشقت
۷۷	۱۱	شل ہے	شل تھا
۹۴	۶	تجونر	تجویز
۱۰۶	۱۱	قول	نول
"	۲۳	خطا یقین	خطا پر یقین
۱۱۴	۱۶	نمبر	ممبر
۱۱۶	۵	کبرج	کیمبرج
۱۲۰	۲۱	مروڑ	مرڈوڑ
۱۲۷	۱۱	جتبھ	جتھا
۱۳۳	۲۳	ہے گو	ہے کہ
۱۳۷	۴	طور	طور پر
"	۱۶	طبقہ	حلقہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۱۴۱	۳	چھوڑکے	چھوڑے
۱۵۵	۱۲	وصع	وضع
۱۵۸	۲	نہایت	نیابت میں
۱۶۳	۱۹	جمی ہوئی رہے	جمی ہوئی ہے
۱۷۷	۱۷	سمجہیں	سمجھیں
"	۱۹	اورار	اوزار
۱۷۹	۳	چھولے یابڑے	چھوٹے یابڑے
۱۸۴	۲۰	بدلتے رہنے	بدلتے رہتے
۱۸۵	۱۸	وسیع البحربہ	وسیع التجربہ
۱۸۶	۵	ہوناہونا	ہونا
۱۸۸	۲۸	موروں	موزوں
۲۰۵	۱۸	ہوکئے	ہوگئے
۲۰۷	۱۸	اس قوم کی حطانت	اس ملک اس قوم کی نطانت
۲۰۹	۳	دیناہے	دیناہے
"	۱۶	زنجروں	زنجیروں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۲۲۵	۱	تبنہ	تنبیہ
۲۲۷	۱۸	غالی	عالی
۲۲۹	۲۴	سولیفٹ	سولفٹ
۲۳۰	۱۷	نوکی	نو
۲۳۴	۱۱	یرستاروں	پرستاروں
۲۳۵	۱۷	نقل وطن	نقل وطن
۲۳۸	۱۶	ملامات	علامات
۲۴۴	۱۱	لی	کی
۲۴۶	۲۵	کثیرالتعداداورنسبتاً	کثیرالتعدادنسبتاً
۲۵۲	۵	وربارکاشبل	دربارکےمثل
۲۵۸	۶	ہجھے	سمجھے
۲۶۳	۲	تنزل	تنزل
۲۷۳	۹	محاً	معاً
۲۷۴	۲۵	انگریزو	انگریزوں